READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا

مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: کاشی چوہان/دانیال شمسی

منیجر مارکیٹنگ
021-35893121

منیجر سرکولیشن
0333-2269932

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893122
021-35893123

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل
ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے — جلد: 34 — شمارہ: 05 — مئی 2017ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

09 بلاعنوان؟
منزہ سہام

10 احوال
کاشی چوہان
قارئین کے خطوط اور حال احوال کا دلچسپ سلسلہ

29 ایوارڈ نامہ
شیما عبدالقیوم
ایوارڈ تقریب کی یادوں بھرا محبت نامہ

31 لائف بوائے
اسماء اعوان
حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

35 ہیر
اقبال بانو
اس ہیر کی داستان، جسے خوب صورت ہونے کی سزا زندگی ہی میں مل گئی تھی

40 لڑکیاں
اقبال بانو
لڑکیاں صرف ایک ہی خمیر سے بنی ہوتی ہیں، فرق صرف کردار کا ہوتا ہے

44 تیرے سنگ رہنا...
اقبال بانو
محبتوں پر قربان ہو جانے والوں کی داستان عبرت

50 میرا کیا قصور
جاوید راہی
اس شخص کی داستان جس کے نصیب میں انہونیاں لکھ دی گئی تھیں

57 گھاؤ
جاوید راہی
اک عورت کی ستم ظریفی کی داستان حیرت

60 ایک تھی عظمیٰ
جاوید راہی
ایک نرس کی دردناک کتھا، جس کی قسمت میں صرف ستم ہی ستم درج تھے

65 ڈراپ سین
ممتاز احمد
بیوی کے قاتل اس نوجوان کا قصہ، جو اپنے پانچ بچوں کے ساتھ سسکتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے

68 پیار کی تلاش
ممتاز احمد
کبھی کبھی فیصلے یوں اس طرح ہوتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے

72 کالو پھڈے باز
ممتاز احمد
زور زبردستی محبت حاصل کرنے والوں کے لیے اک عبرت سامانی

75 گھر کا نا گھاٹ کا
ارم ناز
عمر کی نقدی ختم ہونے کو تھی کہ امیر صاحب کو خیال آیا اور پھر

78 دیا جلے
ارم ناز
دیار غیر بسنے والوں کے لیے اک ریڈ سگنل، ارم ناز کے قلم سے

81 گستاخ
ارم ناز
مختصر نثر کے لیے ڈھیر سے بہتر ایک تحریر خاص، جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرے گی

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کر

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

84 تیرے میرے بیچ میں
حنا بشریٰ
آج کے بے راہ رو معاشرے کی
حقیقی عبرت سامان تحریر

88 جادو ہے نشہ ہے
حنا بشریٰ
ایک لوآموز تکھاری اور ایڈیٹر کی
کیمسٹری سے جڑی تحریر

92 اتھری گھوڑی
حنا بشریٰ
مرد و عورت کے بیچ انا اور ضد آ جائے تو
پھر سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے

96 دیوانی
ثمینہ طاہر بٹ
اس دوشیزہ کی کتھا جو اپنے شوہر
کی دیوانی تھی مگر۔۔۔

99 ٹھیکیدار
ثمینہ طاہر بٹ
اس شخص کا قصہ جسے صرف یہ واقعہ کہ دین
نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے

102 مکڑا اور مکھی
ثمینہ طاہر بٹ
ایک ایسے شاطر نوجوان کی داستان جس نے
کمال ہوشیاری سے اپنا مستقبل محفوظ کر لیا تھا

105 درگور محبت
وقاص حسین
دین و دنیا کو درگور کرتی محبت کی
ایک داستان عبرت

108 انصاف
وقاص حسین
جب خاتم تھری تھانہ ہی انصاف کا ہو جائے
تو انصاف بھی روز ان کے ہاتھ بک جاتا ہے

112 دیر لگی آنے میں۔۔۔
وقاص حسین
اس لڑکی کی داستان جس نے اصل محبت پانے
میں بہت دیر کر دی تھی

116 راکھ کی کمائی
ریحانہ آفتاب
ان والدین کے لیے تازیانہ، جو کبھی اپنی
اولاد کو نہیں سمجھ پاتے

120 بند کواڑوں کے پیچھے
ریحانہ آفتاب
معاشرے کے اعلیٰ طبقے کی
ایک بھری تحریر

124 اور میں ہار گیا۔۔۔
ریحانہ آفتاب
اس شخص کی داستان جو پیسے کے پیچھے
پھر رشتے توڑتا چلا گیا

128 ماہر
حمیرا خان
اس چور کی داستان، جو انسانی نفسیات کو
سامنے رکھ کر چوری کرتا تھا

131 عادت
حمیرا خان
ایک ایماندار شخص کی داستان جو
ایک عجیب عادت کا شکار تھا

134 آخری پونجی
حمیرا خان
ایک ماں کی کہانی قدرت نے جسے ہر
موڑ پر چھوڑ دیا تھا

138 خانقاہ
کاوش صدیقی
خانقاہوں آستانوں اور درباروں سے
جڑی ایک مرد درویش کی داستان عجب

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

154 ڈارلنگ
سیدہ ارم حسین شیرازی
بھیانک سچائی میں لپٹی، تیسری دنیا کا ایک خوفناک سچ

157 کی کہاں رہ گئی
عظمیٰ شکور
دل میں درد جگاتی، ایک ماں کی حقیقت بیانی

160 اصل پریشانی
سعدیہ سیٹھی
لندن سے آج کے جدید چوروں اور چوری کا سدباب لیے چشم کشا تحریر

163 نشہ
فرح انیس
ایک بہت خاص کہانی، جس کا انجام آپ کو چونکنے پر مجبور کر دے گا

166 فتنہ
سیمیں غزالہ نیہاں
اس بیٹی کی کہانی جو باپ کے آنکھیں موندتے ہی ماں کے لیے فتنہ بن گئی

170 گرہن زدہ
فصیحہ آصف خان
اس معصوم کی داستان جسے ماں کی موت گرہن زدہ کر گئی تھی

174 سلو بھیّا
شانی خامان
معاشرے کے ادنیٰ حیثیت کے مخلص وفادار کردار، جن کے دم سے انسانیت زندہ ہے

176 منگتا
راحت وفا راجپوت
اس منگتے کی کہانی، جس کے ہاتھوں میں صرف کشکول رہ گئی تھی

178 جوانی دیوانی
نفیسہ فضل
رشتوں کو پامال کر دینے والی جوانی کی رنگین اور سنگین داستان

180 دیالو
فلک شیر تابش
اک ظالم ڈاکو کی رحم دلی کی داستان رفتہ

182 ڈنکر
اعجاز احمد نکرال
ایک حساس اور سوچ کے در وا کر دینے والی المیہ تحریر

185 پہنچی وہیں پہ خاک
نسیم سحر
کچھ راستے ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی سمت کا سفر کراتے ہیں، ایک نوجوان کی عبرت سامانی

188 قوسِ قزح
رانا حبیب الرحمن
جیل کی سلاخوں کے پیچھے فیوڈل سسٹم کے شکار ایک نوجوان کی سرگزشت

199 عشق عالی نصب!
سیدہ تبسم زہرہ رضوی
زر کے پیچھے اپنوں کو غلام کرنے والے کبھی خود بھی غلام ہو جایا کرتے ہیں

205 کانٹوں بھری سیج
نازیہ بتول رضا
اس کمسن دوشیزہ کا زندگی نامہ، جس نے عمر بھر کے لیے کانٹوں بھری سیج کا انتخاب کر لیا تھا

208 اُدھوری محبت
شازمہ خان
محبت میں بے ایمانی کرنے والے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کر

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

ستم در ستم 212
مهوش مهر
کچھ لوگوں کے نصیب میں صرف ستم ہی ستم درج ہوتے ہیں

اور قلم ٹوٹ گیا 214
سیما عروج صدیقی
اک ایسی مصنفہ کی مختصر داستان قلم، جس کا قلم اک دن اپنی موت آپ مر گیا اور

کربِ محرومی 216
نزہت جبین ضیاء
اُن لوگوں کی داستان، جو ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں

رب کے چور 219
مجید احمد جائی
اُن چوروں کی داستان، جن کو رب نے ہدایت کا راستہ دکھا دیا تھا

باپ کا گناہ 222
سیدہ کاظمی
بھٹ شاہ سے ایک بیٹی کی حکایت الم

غیرت 225
اعزاز سلیم وصلی
دوسروں کی عزتوں کے لٹیرے بھلا اپنی عزتوں کو کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں

قصوروار کون؟ 228
غلام مرتضیٰ علوی
معاشرے کے منافقانہ رویوں سے جڑی ایک حکایتِ خاص

دلدل 230
افسانہ آفتاب کاوش
اُس شخص کی داستان جو اپنوں پر ظلم کرتے کرتے خود ظلم کی دلدل میں پھنس گیا تھا

عورت کا دل 233
حسین خواجہ
مرد اور عورت کے دل سے جڑی اک حکایتِ خاص

امتحان 236
سہیل خان
اُس شخص کی حکایت جسے زندگی کے ہر موڑ پر اک نئے امتحان سے گزرنا پڑا تھا

فراڈیے 238
شیخ معظم الٰہی
اُن فراڈیوں کی کہانی جو اکثر اپنی کارستانیوں سے عوام کو لوٹتے رہتے ہیں

تربیت 240
نوشابہ نوش
اولاد کی تربیت اپنے اصولوں پر کرنے والوں کے لیے اک آئینہ حکایت

آزمائش 242
مہرالنساء
اُس کی زندگی کے کچھ ایام تکلیف دہ ضرور تھے مگر پھر باقی زندگی راحت سے گزری

مسئلہ یہ ہے 244
ادارہ
آپ کا مسائل کا حل، سچی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

ہائیڈ پارک 254
ڈی خان
زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

تیرِ نیم کش 257
قارئین
قارئین کی سخن فہمی کو آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 890 روپے افریقہ 65 ڈالر کینیڈا، آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

بلاعنوان

تھے کل جو اپنے گھر میں وہ مہمان کہاں ہیں
جو کھو گئے ہیں یارب، وہ اوسان کہاں ہیں

آنکھوں میں روتے روتے اب تو نام بھی نہیں
تھے معجزن جو پہلے وہ طوفان کہاں ہیں.....

کچھ اور ڈھب سے اب تو ہمیں دیکھتے ہیں لوگ
پہلے جو اے ظفر تھے، وہ انسان کہاں ہیں.....

''یہ الفاظ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہیں لیکن
لفظوں سے رِستا خون ہم سب کا.....
ہر دردمند دل رکھنے والے پاکستانی کا.....
اللہ ہم سب پر رحم فرمائے آمین۔''

منزہ سہام

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

بہت پیارے ساتھیو! کیسے ہیں آپ! جنوری میں ایوارڈ تقریب ہوئی اور اس کے بعد سے تسلسل سے عشق نمبر، پراسرار نمبر، ایوارڈ نمبر اور اب مختصر کہانی نمبر.....! فی الحال تو آج کے اس زمانے میں تسلسل سے نمبر دینا ہی جان جوکھم کا کام ہے مگر کیا کیجیے، ہم سے دیوانے ابھی زندہ ہیں۔ ساتھیو! رسالہ کاری تو بہت منجھے ہوئے لوگوں کا کام ہے۔ ہنر مندوں کا کام ہے۔ میں ناپختہ کار ہر ماہ کوشش کرتا ہوں کہ بس اپنے قارئین کو مطمئن کر سکوں۔ اللہ تعالیٰ سے ہر پل یہی اِک دعا دل میں مانگتا ہوں کہ بس ریاضتیں ضائع نہ ہو جائیں۔ دیر سویر الگ مدعا ہے مگر پرفیکشن پر کمپرومائز تو نہیں ہوتا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی چیز ایسی چلی جاتی ہے جو وزن میں کم ہوتی ہے مگر سب کا دل بھی تو رکھنا ہوتا ہے نا۔ میرا ایمان شوقِ تخلیق ہے۔ ہر ماہ اِک شہ پارہ تخلیق کرتا ہوں۔ میرا ایمان آپ کو اظہارِ خیال کی بلندی عطا کرنا ہوتا ہے۔ آپ کی تخلیقات پرچے میں شائع ہو کر جب دوسروں کو انگشت بدنداں کرتی ہیں تو سر میرا بلند ہوتا ہے اور دل میں سے آواز آتی ہے، خدا نے محنت کا صلہ دے دیا۔ مئی کا مہینہ مزدوروں کے مہینے سے منسوب ہے، مئی کا مہینہ ماؤں کا مہینہ کہلاتا ہے، ہماری مزدوری تو آپ ہر ماہ دیکھتے ہیں۔ گزشتہ ماہ مردم شماری کی ڈیوٹی کے دوران میری بہت ساری ماؤں سے ملاقات ہوئی۔ بہت سارے روپ دیکھے ماؤں کے۔ ایک ایسی ماں دیکھی جو جواں مرگ اکلوتے بیٹے کے بچے پال رہی ہے، ایک ایسی ماں دیکھی جو پچاس سال کے بچوں کو اب تک سینے سے لگائے گھر ویران کیے بیٹھی ہے۔ ایک بن بیاہی ماں دیکھی جس نے دوسرے کے بچوں کے لیے زندگی سے جوگ لے لیا۔ ایک ایسی ماں دیکھی جس کے بیٹی داماد تین گڑیاں چھوڑ کر شارٹ سرکٹ میں بھسم ہو گئے۔ ایک بھولی ماں ایسی بھی تھی جو گھر کے کاغذ تک رکھ کر کہیں بھول گئی اور ساتھ ہی بچوں کے NIC کارڈ بھی۔ اس وقت ماؤں ہی کا ذکر بہت ہے، اگر میں والد حضرات کا ذکر کرنے لگوں تو ممکن ہے کالم بن جائے۔ بس ماؤں کی قدر کریں اور ماؤں سے میری محبت بھری گزارش ہے بیٹے بیٹیاں اگر مناسب عمر میں بیاہ دیے جائیں تو تاعمر زندگی گلزار رہتی ہے۔ آزمائش شرط ہے اور اب آتے ہیں ''احوال'' کی جانب۔ اس ماہ سب سے پہلے ہمارے احوالی بن رہے ہیں۔ خضر حیات لکھتے ہیں۔

☆ ''میں سچی کہانیاں بڑے شوق اور محبت سے پڑھتا ہوں اور ہر ماہ اس کا بڑی شدت سے انتظار رہتا ہے۔ یہ بہت عمدہ اور اچھا ڈائجسٹ ہے۔ یہ بہت اعلیٰ اور خوب صورت تحفہ ہے کیونکہ اس سے ہمیں بہت ساری معلومات ملتی ہیں، جس کا ہمیں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ یہ ہر عمر کے فرد کے لیے بیش بہا قیمتی اور انمول خزانہ اور تحفہ ہے۔ پیارے کاشی بھائی ڈاک کی وجہ سے دو ماہ میری چیزیں آپ کو نہیں ملیں۔ پاکستان کی ڈاک کا نظام ہی بہت خراب ہے (صحیح کہا)۔ جو چیز جلدی بھیجو تو راستے میں ہی گم ہو جاتی ہے (ارے.....ڈراؤ تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں) پہنچ ہی نہیں پاتی (اب کیا ہوگا ہمارا) ڈاک والوں کی وجہ سے دو ماہ میری چیزیں آپ کو نہیں ملیں، دعا کرو یہ میٹر آپ تک خیر خیریت سے آجائے (اللہ نے تمہاری سن لی) اب اجازت چاہتا ہوں زندگی رہی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، (آمین)۔''

پیارے خضر! لو بھئی غصہ تھوک دو اور ڈاک خانے والوں کو معاف کردو۔ ڈاک والوں کے پاس پہلے ہی اتنے کام ہیں وہ ڈاک کا نظام بہتر بنائیں گے تو ڈاک خانہ بھی کوئی اور ملک لے جائے گا۔ پیارے تمہارے تبصرے میں ہم تبصرہ ہی ڈھونڈتے رہے مگر.....

☆ شادی وال، گجرات سے ہماری پیاری بہن عائشہ نور عاشا احوال کا حصہ بن رہی ہیں، لکھتی ہیں۔

''بھیا سچ پوچھیے تو عجیب سا لگ رہا ہے۔ اتنے عرصے بعد محفل میں شرکت کررہی ہوں کہ میں خود غرض ہوں۔ بہت سارے لوگ مجھے خود غرض سمجھتے ہیں۔ کیا لکھوں کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ بات یہ ہے کہ پوسٹ آفس شادی وال کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں شفٹ ہوگیا ہے تو مجھے خط پوسٹ کرنے میں مشکل درپیش تھی۔ میں نے جب بھی آپ کو کال کی، جو بھی پوچھا آپ نے فوراً مجھے اس کا حل بھی بتایا، جواب بھی دیا اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ رائٹر ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کا میسج بھی ملا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی مگر شرکت نہیں کرپائی اور سوچتی رہی اگر میں وہاں جاتی بھی تو مجھے وہاں کون جانتا ہوگا (ہم تو جانتے تھے نا) مگر اگلی بار اس تقریب میں تو میں ضرور آؤں گی کیونکہ تب تک حالات و واقعات کچھ اور ہوں گے (ہاہاہا)۔ کاشی بھیا میں نے سچی کہانیاں کے لیے ایک کہانی بھیجی تھی اس کا کچھ بتادیں۔ میں نے اپنے ہی کالج کے اندر پوسٹ آفس دریافت کرلیا ہے اس لیے احوال میں شرکت کرتی رہوں گی اب اجازت چاہتی ہوں میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔''

پیاری عائشہ! سلامت رہو! یہ تو خوش خبری ہے کہ تم نے کالج کے اندر ہی پوسٹ آفس تلاش کرلیا اگر کالج میں نئی نئی کہانیاں بھی تلاش کرکے پوسٹ آفس کے حوالے کرتی رہو تو کیا بات ہے۔ کہانی جلد شائع ہوگی۔

☆ کراچی سے ہماری بہت پیاری سی بہن نسیم سحر لکھتی ہیں۔ ''منزہ صاحبہ بالکل اپ ٹو ڈیٹ حالات کے مطابق اداریہ لکھتی ہیں، جو بیسٹ ہوتا ہے۔ ''احوال'' کی محفل حسب معمول دلچسپ رہی۔ محبتوں کی باتیں سننے میں مزا آتا ہے۔ رفعت صاحبہ کے والد کے انتقال پر بہت دکھ ہوا، بے شک ہم انہیں نہیں جانتے مگر ماں باپ کا بچھڑنا کتنا سوہان روح ہوتا ہے یہ ضرور پتا ہے۔ اللہ رفعت صاحبہ کو صبر دے۔ گھاسی رام کا بھوت، رامی سلومی، چھٹی منگنی، چھل، نیم والے بابا جی، وہ کون تھی، لال چڑی، یہ ہماری ہے نارمل کہانیاں رہیں۔ البتہ ''ہمزاد'' اور ''میری قبر پر نہ آنا'' اچھی تھیں۔ ''ناگ بتیاں'' بھی ٹھیک رہیں۔ سب سے اچھی ممتاز احمد کی ''دسواں میل'' کہانی تھی۔ اس کے علاوہ ''خونی حرم'' بھی اچھی لگی۔ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ پہلے تقریب کا انتظار، پھر اس کی روداد کا انتظار۔ چلیں جی انتظار ختم ہوا۔ لاہور کی سردی اور اس خطرناک موسم میں تقریب کا انعقاد سچ میں آپ کی ہمت و حوصلے کو سلام۔ تمام ایوارڈ یافتگان کو بہت مبارک ہو اور دعائیں۔ اللہ انہیں مزید ڈھیر سارے ایوارڈز سے نوازے۔ خوشیوں کے پل سدا ساتھ رہیں۔ ایوارڈ ونرز کے تاثرات بھی عمدہ تھے خوشی سے دمکتے چہروں کے ساتھ ایوارڈ وصول کرنا تصویریں بھی لاجواب رہیں۔ کاش کہ ہم بھی وہاں ہوتے کوئی بات نہیں اگلے سال سہی خوشیوں کی یہ ٹرین اب انشاء اللہ چلتی رہے گی۔ تین دن ہم اور سچی کہانیاں..... سر میں درد ہوگیا۔ آنکھیں دکھ گئیں لگاتار پڑھنے سے مگر ہم نے بھی پروا نہ کی، آخر کو کاشی کو منہ دکھانا ہے ''روز ایوارڈ کے دن'' ہاہاہا۔ پہلی سچ بیانی ''داؤ'' نارمل تھی۔ دستگیر شہزاد کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ایک گناہ کی قیمت'' اچھی تھی۔ کرن شبیر کی ''بُو'' اچھی تھی۔ بس ذرا سا اختتام اور واضح کر دیتیں تو اچھا تھا۔ بابر نایاب کی ''فرض اور محبت'' ایک نیام میں دو تلواروں کا رہنا تقریباً ناممکن ہے، خیر دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔ ''سزا مجھے ملی'' گردش زمانہ کی کہانی تھی بقول شاعر کیسے کیسے ویسے ہو گئے اور ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے۔ افشاں کی ''ایس ایچ او'' کا پڑھ کر سارے پولیس والے اتنی ہی محنت ایمانداری اور لگن سے کام کریں۔ بانو قدسیہ جیسی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا ہماری کہاں حیثیت۔ احمد بابر نے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ ''الماس'' اور ''واپسی'' میں طوائف کا مثبت رخ دکھایا گیا۔ ''باغبان نے چمن پھونک دیا'' عورت کی حکمرانی کی خصلت اور اس کے لیے اپنے ہی پیاروں کو قربان کر دینے پر مبنی تھی۔ سفر نامہ ہے بھی اختتام کو پہنچا، کافی دلچسپ رہا۔ ممتاز احمد صاحب آتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی یہ کہانی بھی نمبر ون رہی۔ ارم ناز کی ''یگم'' بھئی ارم کیوں بے چاری بیویوں کو رستہ دکھا رہی ہو۔ ویسے ہی ان کو کم ٹینشن ہے کہ اب شوہروں کی جاسوسی بھی کریں گی اور خود کو ہی پریشان کریں گی۔ کیونکہ شوہروں کا کچھ نہیں بگڑنے کا انہیں ایک ہزار طریقے آتے ہیں بیویوں کو بے وقوف بنانے کے۔ باقی کہانیاں نارمل تھیں۔ سلسلے اچھے ہیں اور دلچسپ ہیں۔ اُف.....! بس بہت ہو گیا اس سے زیادہ اپنی صحت پر ظلم نہیں کر سکتی آخر اگلے شمارے کے لیے بھی تو ہمت رکھنا ہے (ہاہاہا)۔''

❁ اچھی بہن! جیتی رہو۔ کہانی بھی اشاعت پذیر ہوئی اور یقیناً سرٹیفکیٹ آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔ اب تو خوش ہونا۔ تبصرہ بہت اچھا لگا آپ کا۔

☆ سرگودھا سے ہماری بہت پیاری آپی صائمہ بشیر لکھتی ہیں۔ ''امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ باقی سب بہن بھائیوں کی خیریت نیک مطلوب چاہتی ہوں۔ ممتاز احمد، بشریٰ کنول، غزالہ کرن، فرزانہ گل، فریدہ فری کے خطوط احوال کی جان تھے۔ کہانیوں کے تو کیا ہی کہنے۔ پراسرار کہانیوں میں ممتاز احمد ''دسواں میل'' کو بہت خوب صورتی سے آگے لے کر چلے۔ نفیسہ سعید کی ''مالا کون تھی'' بھی بہت عمدہ کہانی تھی۔ باقی جاوید راہی کی ''سلمیٰ اور رامی'' الماس فاطمہ کی ''لال چنری'' عطیہ ہدایت اللہ کی ''یہ ہماری ہے'' بھی بہت اچھی کہانی تھی۔ غزلوں میں حمیرا راحت اور فریدہ فری کی شاعری دل کو بھا گئی۔ باقی سلسلے بھی بہت اچھے تھے۔ سب لکھنے والوں کو پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس باغ کو سلامت رکھے اور ان سب پھولوں کو کھلتا رکھے جو اس باغ کی رونق ہیں۔''

❁ پیاری آپی! خدا دعائیں دینے والوں کو بھی سلامت رکھے (آمین)۔ پلیز اگلے ماہ آپ کا تبصرہ لازمی ہو۔

☆ منچن آباد سے حسین خواجہ کی آمد ہے، لکھتے ہیں۔ ''پیارے کاشی بھیا ''عشق نمبر'' منفرد شمارہ تھا۔ ناہید اختر صاحبہ ہمارے ملک کا روشن ستارہ ہیں۔ کاشی بھیا آپ نے بجا فرمایا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بہت خوب بس یہ آپ ہی کا خاصا ہے جو آپ ہر احساس کو بہت ہی سادہ فہم الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں۔ بھیا جی آپ نے اس بار پرچہ کمال کا تخلیق کیا ہے۔ مزہ آ گیا۔ گلیمر کوئن والا سرورق لاجواب ہے۔ بھیا جی آپ شمارے پر بہت محنت کرتے ہو۔ آپ کو اکیس توپوں کی سلامی۔ (ابھی جیئے دو بھائی.....) زندگی بھر ملال رہے گا کہ میں تقریب میں شامل نہ ہو سکا۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔ امید کرتا ہوں اگلی دفعہ آپ ضرور بلاؤ گے محفل میں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ ''کاش'' دراصل کاش ہی رہ گیا ہے، اب تو ہم لوگوں کو اس کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ اچھا جی اب آتے ہیں محفل کی طرف۔ پہلی آمد ہے طفیل طوفی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سانحۂ ارتحال

ہمارے ہردل عزیز لکھاری اور فخر پاکستان بھائی ایم اے راحت کی اہلیہ گزشتہ ماہ زمین کا رزق ہوئیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں راحت بھائی اوران کے اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے اور قارئین سے بھی مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

صاحب کی۔ طوفی صاحب اللہ پاک آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے، (آمین)۔ آنٹی شاہدہ ذاکر، بہن شازیہ گل، بہن راحت وفا، بھائی غلام مرتضیٰ، بہن حنا بشریٰ، بھائی ذیشان ریاض، نعمان احمد صاحب کا آخری خط ہے جو کہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ احباب نے بہت شاندار تبصرہ کیا ہے۔ ہمارے شمارے کی زینت کہانیاں محبت اور فرض، سزا مجھے ملی، بہن ارم ناز کی ''گیم'' واہ واہ کیا شاہکار ہے۔ ''جہالت'' بھی اچھی لگی۔ ''خانقاہ'' جناب کاوش صدیقی صاحب کی لاجواب رہی۔ عارف شیخ صاحب کی ''پچھتاوا'' بہت عمدہ تھی۔ ''بھنور'' بہن شازمہ خان کی بہت اچھی تحریر ہے۔ ''خوش بخت'' ممتاز احمد صاحب ہمارے معاشرے کی عکاس تحریر ہے۔ ''بو'' بہن کرن شبیر کی تحریر سچ پر مبنی ہے۔ ''سپاس نامہ'' بہت خوب تھا۔ وہ دن آہی پہنچا ممتاز احمد صاحب لکی پرسن۔ افتخار چوہدری صاحب ہردلعزیز ہیں۔ کاشی بھیا اگرچہ میں محفل میں شریک نہ ہوسکا لیکن کچھ حد تک محفل کی رونق سے ضرور لطف اندوز ہوا ہوں۔ منشی عزیز مے صاحب اور نعمان اسحٰق صاحب آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آنٹی رضوانہ کوثر آپ کو مبارک ہو۔ میڈم دلشاد نسیم صاحبہ آپ مجھے ایوارڈ کب دیں گی؟ (ارے.....) بہن فصیحہ آصف خان صاحبہ آپ کو محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ محترم جناب وقاص حسین صاحب میں امید کرتا ہوں کہ ایک روز آپ کے ساتھ ضرور ملاقات ہوگی۔ باجی نسیم سکینہ صدف بہت خوب۔ بہن ارم ناز صاحبہ آپ نے تو محفل کی رونق دوبالا کردی۔ باجی زمرنعیم صاحبہ اللہ پاک آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے، (آمین)۔ میرے پیارے دوست عبدالغفار عابد صاحب آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ ''ہائیڈ پارک'' اس بار سپر ہے۔ ''تیر نیم کش'' عمدہ۔ روشان کراچی کا شعر بہت خوب ہے۔ ''داسی'' احمد سجاد بابر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بانو آپا کی ذات پر بہت خوب لکھا ہے۔ کاشی بھیا جی اللہ پاک آپ کو لمبی زندگی صحت اور خوشیوں کے ساتھ عطا فرمائے، (آمین)۔ بھیا جی میں بہت شرمندہ ہو کہ میں اپنے خط میں شمارے کا حق ادا نہ کرسکا اس بار شمارہ تمام تر تعریفی القابات سے بالاتر ہے۔''

❁ اچھے حسین خواجہ! سب سے پہلے تو آپ کی امی کے انتقال نے دکھی کیا۔ خدا آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔ تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ اپنا خیال رکھنا۔ اپنی کہانی اس شمارے میں پڑھ لو۔

☆ نعیم اللہ جویا، حویلی کدھی خوشاب سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہے ہیں، لکھتے ہیں۔ ''پیارے کاشی صاحب آپ کیسے ہیں، امید کرتا ہوں خیر و عافیت اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ سچی کہانیاں کے سب قارئین اور رائٹرز کو میرا پیار بھرا سلام ہو۔ میرا سچی کہانیاں میں پہلا خط ہے امید کرتا ہوں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے۔ سچی کہانیاں میں مزید لکھنے کا موقع دیں گے اور خوش آمدید کہیں گے۔ میرے پیارے کزن میرے دوست میرے بھائی خضر حیات نے ہی مجھے سچی کہانیاں متعارف کرایا۔ ورنہ میں نے زندگی میں کوئی رسالہ ڈائجسٹ وغیرہ نہیں پڑھا۔ جب میں نے لیا پہلی بار ہی لیا، پہلی بار ہی پڑھا، پہلی بار ہی اچھا لگا، عمدہ لگا اور دل میں اتر گیا اور خط لکھنے کے لیے قلم اٹھالیا۔ کاشی صاحب یقین مانیے جب پڑھا تو بہت اچھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لگا۔ یہ بہت ہی معیاری جریدہ ہے۔ اس میں بہت سی معلومات چھپی ہوئی ہیں۔ میرے کزن خضر حیات نے کہا تھا جب پڑھو گے تو پتا چلے گا واقعی اس نے سچ کہا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہے جیسا اس نے کہا تھا۔ یہ بالکل میرے معیار کا ہے۔ یہ مجھے بہت عمدہ اور اچھا لگا۔ اب اجازت زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہو گی۔ دعا ہے سچی کہانیاں دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، (آمین)۔''

پیارے نعیم! خوش آمدید! لو تمہارا خط پورا لگا دیا۔ اب اگلے ماہ ضرور احوال میں شریک ہونا، وعدہ!

☆ دیپال پور سے ہمارے ساتھی یاسر وکی لکھتے ہیں۔ ''اپریل کا شمارہ ملا، پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ کاشی بھائی اس مرتبہ تو شمارے کی کیا بات تھی ماشاء اللہ ماہنامہ سچی کہانیاں دن بدن ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ کاشی بھائی تھینکس آپ نے میرے تبصرے کو قارئین کی نذر کیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے میں آپ کا شکریہ ادا کروں (ان ہی الفاظ سے کردو یار) علی رضا آف فیصل آباد آپ کا تبصرہ بہت خاص لگا۔ مجید احمد جائی صاحب آپ کا تبصرہ بھی خاص تھا اور مبارک ہو سچی کہانیاں ایوارڈ ملنے پر۔ بابر نایاب، فردوس بانو، آصفہ سکندر، شاہد محمود فضل، افشاں جی آپ سب کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ وجاہت علی، فرزانہ نگہت وغیرہ کی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ ''گیم'' ارم ناز واہ جناب کیا بات تھی آپ کی اسٹوری کی۔ ''رب کا انصاف'' ہاں جناب اسٹوری اچھی تھی پر اتنی اچھی بھی نہیں تھی۔ ''جہالت'' ناز یہ جہانگیر اسٹوری خاص نہیں تھی۔ ''پچھتاوا'' عارف شیخ اسٹوری پچاس فیصد ٹھیک تھی۔''

پیارے بھائی! تبصرے کے لیے شکریہ! امید ہے اگلے ماہ پھر سے حاضر ہوں گے۔

☆ نمبر شہداد کوٹ سے مور شاہد حسین لکھتے ہیں۔ ''ایوارڈ نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق زبردست تھا۔ صفحہ اول سے صفحہ آخر تک بے مثال تھا۔ بے حد پسند آیا۔ خوب صورت پرچہ دینے پر دلی مبارک باد۔ ہر صفحے پر آپ کی محنت جھلک رہی تھی۔ یہ سب آپ کی بے پناہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ پاک آپ کو مزید کامیابیوں و کامرانیوں سے نوازے، (آمین)۔ اداریہ ''کاش'' لفظ لفظ موتی۔ محبتوں کی محفل ''احوال'' اپنے عروج پر تھی۔ کاشی بھائی نے محفل احوال کا آغاز خوب صورت باتوں سے کیا۔ محمد طفیل طوفی، راحیلہ منظر بھٹی کرے آیا (خوش آمدید)۔ عابد طارق نسیم سحر ملازم حسین کا تبصرہ شاندار تھا۔ غلام مرتضیٰ علوی شکریہ خوش رہیں۔ ادی حسین جونیجو سدا سلامت رہیں۔ آپی زرینہ جونیجو، صائمہ مجید، بھابی ثمینہ طاہر بٹ ڈھیروں دعائیں۔ سلیمان شبیر، شازیہ گل بہن ویلکم بیک۔ حنا بشریٰ بہنا کہانی اور خط کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ سلامت رہیں۔ مجید احمد جائی، منشی عزیز مے، فیصل ندیم بھٹی کیسے ہیں۔ سلام دعائیں۔ نعمان احمد آرائیں، محمد طفیل طوفی اللہ پاک آپ کی تکلیفیں اور پریشانیاں دور فرمائے، (آمین)۔ ممتاز احمد بھیا مزید کامیابی کی دعائیں۔ ثمینہ طاہر بٹ اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ کاشی بھیا آپ کی نظم ''اے وقت کے بادشہ گرو'' بہت عمدہ اور مثالی تھی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ایوارڈ وصول کرنے والی تمام بہنوں اور بھائیوں کو دلی مبارک باد۔ سب نے نہایت عمدہ لکھا۔ پرچے کو چار آٹھ نہیں سولہ چاند لگا دیئے۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سلسلہ ''قوس و قزح'' اور ''خانقاہ'' دلچسپی سے بھرپور ہیں۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' پسندیدہ سلسلے ہیں۔ آخر میں تمام چاہنے والوں کے لیے پرخلوص دعائیں بندہ ناچیز کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔''

پیارے مور! تبصرے کے لیے شکریہ۔ بس تمہاری محبتیں ہمارا مان ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔

☆ علی اصغر انصاری منچن آباد سے لکھتے ہیں۔ ''ایک بار پھر سے محفل میں حاضر ہوں۔ امید کرتا ہوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ویلکم کیا جاؤں گا (ویلکم! خوش آمدید!) زندگی کی کشمکش میں سچی کہانیاں کے لیے وقت ہی نہیں ملتا دراصل میں مزدور طبقے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں روز صبح جلدی اٹھنے کا تصور ہوتا ہے لیکن سونے کا نہیں ہوتا۔ زندگی کی بھاگ دوڑ میں اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ محفل میں حاضر ہوسکوں۔ مجھے سچی کہانیاں سے متعارف کروانے والے میرے عزیز دوست جناب بھائی خواجہ حسین صاحب ہیں اور آج سے پہلے بھی چار پانچ مرتبہ میں محفل میں حاضر ہو چکا ہوں لیکن اپنی مصروفیت کے باعث لکھنے سے قاصر ہوں۔ میں سچی کہانیاں مسلسل ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ جب مزدوری کے درد سے چُور ہوتو مطالعہ کرنے کا بھی دل نہیں کرتا لیکن اپنے فرصت کے لمحات کو میں سچی کہانیاں کے نام ضرور کرتا ہوں۔ سرورق کی کیا تعریف کریں یہ تو ہمیشہ کی طرح دیدہ زیب ہے۔ اللہ پاک آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے، (آمین)۔ آپ کی تحریر کمال کی ہے ممتاز احمد، عارف شیخ، ارم ناز بہت اچھی کہانیاں ہیں آپ کی۔ کاشی صاحب اس دفعہ شمارہ غضب کا ہے۔ بھائی جان آپ تو بہت کمال کے بندے ہو اس بار شمارہ سپر سے بھی اوپر ہے۔ بھائی عبدالغفار عابد آپ کو انعام (انعام؟؟؟ یا سلام) بہت بہت مبارک ہو۔ بھائی جان میں بہت کم لکھ رہا ہوں پر آپ زیادہ سمجھنا۔ (کرلو گل!)''

❁ اچھے بھائی! آپ کو پھر سے خوش آمدید! تبصرہ کہاں ہے؟ کچھ تو تبصرہ کرتے کہانیوں پر بھی بھیا۔ اگلی بار بھرپور تبصرہ کرنا ہے ورنہ آپ کو انعام دے دیا جائے گا۔

☆ بھائی نظر علی برمانی کی زمانوں بعد احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''میں سچی کہانیاں کا بہت پرانا قاری ہوں۔ مطلب کہ اٹھارہ سال سے مسلسل پڑھ رہا ہوں اور کافی سال تک ''احوال'' میں باقاعدگی سے شرکت کرتا رہا ہوں۔ کبھی احوال انکل دانش دیروی مرحوم سنبھالتے تو کبھی پرویز بلگرامی اور کبھی منزہ سہام تو کبھی سلیم فاروقی ہوتے تھے اور اب سلیم فاروقی بھی ہم میں نہیں رہے۔ ان سب سے کافی عرصہ گپ شپ رہی اور اب تقریباً دس سال بعد حاضر ہو رہا ہوں لیکن اس عرصے میں رسالہ باقاعدگی سے پڑھتا رہا ہوں۔ میں آپ کے لیے شاید نیا ہوں لیکن آپ میرے لیے نئے نہیں ہیں میں آپ کی سوچ آپ کی باتوں سے اور آپ کی شاعری سے بہت متاثر ہوں اور بلاشبہ آپ ایک اچھے مدیر بھی ہیں آپ کے لیے بہت سی نیک تمنائیں۔ مجھے رسالہ بہت دیر سے ملتا ہے اس لیے جب اس میں شرکت کا سوچتا ہوں تو تاریخ ہی گزر جاتی ہے اور اس مرتبہ بھی شمارہ کافی دیر سے ملا اور آج نو اپریل ہے پھر بھی میں احوال میں شامل ہونے کے لیے تبصرہ ارسال کر رہا ہوں۔ اس بار ''ایوارڈ نمبر'' اپنی مثال آپ تھا۔ ایوارڈ تقریب کا مزیدار احوال پڑھ کر بہت مزا آیا اور دل میں ایک صدا ابھری کہ کاش اس رنگا رنگ ایوارڈ تقریب کا ہم بھی حصہ ہوتے۔ یہ ایوارڈ تقریب آپ کی محنت اور سچی لگن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میری طرف سے منزہ صاحبہ اور ان کے سارے اسٹاف کو بہت مبارک باد اور اس کے ساتھ ساتھ ایوارڈ ونر خواتین و حضرات کو ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک باد اور ساتھ ہی ان دوستوں نے ایوارڈ تقریب کا احوال بہت خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا۔ تھوڑی سی بات کہانیوں کے بارے میں کر لیتے ہیں (بالکل جی) جب سے رسالے میں لائف بوائے کی کہانی شروع ہوئی ہے تب سے میں بھی لائف بوائے ہی استعمال کر رہا ہوں لیکن اب یہ بھی مہنگا ہونے لگا ہے۔ افتخار چوہدری ''داؤ'' ایک اچھی اور سبق آموز کہانی تھی۔ دستگیر شہزاد کی ''ایک گناہ کی قیمت'' بہت اچھی رہی۔ کرن شبیر کی ''یو'' کہانی تو اچھی لگی مگر آخر میں پڑھ کر تھوڑی سی الجھن ہوئی شاید وہ جیلر ہی نفیس کا اصل مجرم تھا (بالکل)۔ تسنیم منیر علوی کی ''دنیائے جستجو'' ایک اچھوتی کہانی کو اچھے انداز میں بیان کیا گیا جسے پڑھ کر مزا آیا۔ بابر نایاب کی ''محبت اور فرض'' اچھی رہی۔ فردوس بانو کی ''ذرا سی بات'' آصفہ سکندر کی ''سزا مجھے ملی''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فیصل ندیم بھٹی کی ''تیری راہ تک رہی ہوں'' شاہد محمود مغل کی ''دو دن کی زندگی'' افشاں کی ''ایس ایچ او'' پڑھ کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ احمد سجاد بابر نے ''واپسی'' میں قدسیہ بانو کے بارے میں بہت اچھی باتیں بتائیں۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم ادیبہ اور اپنے دیوتا کی داسی تھیں۔ سید ملازم حسین شیرازی کی ''الماس'' میں بے چاری الماس کے ساتھ بہت برا ہوا۔ سید وجاہت علی کی ''واپسی'' بہت خوب تھی۔ فرزانہ نگہت کی ''باغبان نے ہی.....'' بہت دکھی کر گئی۔ قمر علی عباسی کا سفر نامہ ''برف کے شہر'' اختتام کو پہنچا۔ ان کے سفر نامے نہایت دلچسپ ہوتے ہیں پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ ممتاز احمد میرے پسندیدہ رائٹر ہیں اس بار بھی وہ ''خوش بخت'' کی شکل میں ایک خوب صورت کہانی لائے بہت پسند آئی۔ باقی کہانیوں میں ''قوس وقزح'' بہت اچھی جا رہی ہے۔ گیم بھنور، بس محبت چاہیے، رب کا انصاف، پچھتاوا اور سلسلہ وار کہانی ''خانقاہ'' سب اچھی رہیں۔''

پیارے بھائی! ویلکم بیک۔ آپ کے بھرپور تبصرے نے مزہ دیا۔ امید ہے اب یہ ساتھ بنا تعطل قائم رہے گا۔

☆ سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی ممتاز احمد کی آمد ہے، لکھتے ہیں۔ ''اپریل کا شمارہ چار تاریخ کو موصول ہوا۔ انتہائی خوب صورت جاذب نظر ٹائیٹل سے مزین ایوارڈ نمبر بہت بھلا لگا۔ ''کاش'' کے عنوان سے اداریے میں منزہ سہام نے زندگی سے بہت بڑا زندگی کا احساس ہے کا درس دیا۔ ہم واقعی ایک زندہ قوم ہیں۔ ''احوال'' کاشی بھائی محبت کے عنوان سے اپنی خوب صورت باتوں سے مہکا رہے تھے۔ محمد تفضیل طونی، شاہدہ ذاکر اور راحیلہ منظر کو احوال میں خوش آمدید، ویلکم۔ احوال میں احوالیوں کے خطوط بہت خوب تھے۔ ایوارڈ تقریب کے حوالے سے افتخار چوہدری، حمیرا خان، منشی محمد عزیز مے، نعمان اسحاق، ریحانہ آفتاب، یاسر وکی، رضوانہ کوثر، فصیحہ آصف خان، شاہد محمود مغل، وقاص حسین، نسیم سکینہ صدف، ارم ناز، بلال فیاض، قاسم خان بلوچ، شائستہ انور، بشریٰ سعید احمد، ایم حنیف عاصم بلوچ، مجید احمد جائی، اشفاق شاہین، راحت وفا راجپوت، زمر نعیم، طاہر ساقی، ملک علی رضا، عبدالغفار عابد اور حنا بشریٰ نے بہت زبردست اور بہت عمدہ لکھا، پڑھ کر ایوارڈ تقریب ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ میں تہہ دل سے بہت ممنون اور شکر گزار ہوں۔ منشی محمد عزیز مے، آپی رضوانہ کوثر، بلال فیاض، قاسم خان بلوچ، آپی شائستہ انور، ایم حنیف عاصم بلوچ، طاہر ساقی اور ملک علی رضا کا کہ انہوں نے ایوارڈ تقریب کے احوال میں مجھ ناچیز کو یاد رکھا۔ بہت شکریہ۔ ''داؤ'' افتخار چوہدری کی بہت اچھی تحریر تھی۔ عمران نے اچھا فیصلہ کیا اسے مریم کے خواب پر یقین آ چکا تھا۔ اک گناہ کی قیمت، بو، دنیائے جستجو، محبت اور فرض، ذرا سی بات، سزا مجھے کی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ''تیری راہ تک رہی ہوں'' فیصل ندیم بھٹی بڑی دیر کے بعد بہت زبردست کہانی لے کر آئے۔ ''گیم'' ارم ناز نے ایک اچھوتی اور مزے دار کہانی پڑھنے کو دی۔ ویلڈن۔ ''الماس'' اور ''قوس وقزح'' اس شمارے کی بہترین کہانیاں تھیں۔ بس محبت چاہیے، رب کا انصاف، حادثہ، جہالت، پچھتاوا اچھی کہانیاں تھیں۔ اب تک کے لیے اتنا ہی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہو گی اگر زندگی نے وفا کی تو۔''

پیارے بھائی! سلامت رہیے تبصرہ لگتا ہے کافی عجلت میں لکھا ہے مگر پھر بھی اچھا لگا۔

☆ شازیہ گل ضلع مانسہرہ گاؤں بھیر کنڈ سے شاملِ احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''خوب صورت دلہن سے سجا ماہ اپریل کا شمارہ 8 تاریخ کو ملا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے منزہ جی کی باتیں پڑھیں۔ بہت اچھی لگیں۔ پھر ''احوال'' میں شامل سبھی بہن بھائیوں کے خطوط پڑھے سبھی بہت اچھے لگے۔ اچھی بہن سدرہ آج کل آپ بہت کم نظر آ رہی ہیں۔ کہاں گم ہیں، احوال میں جلدی واپس آ جائیں۔ سباس گل مجھے آپ کی شاعری اور کہانیاں بہت پسند ہیں۔ سچی کہانیاں میں آپ کا شامل ہونا بہت اچھا لگا۔ ایوارڈ تقریب میں، میں موجود تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مبارک باد

ہمارے دوست لکھاری ممتاز احمد کی صاحبزادی گزشتہ ماہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جوڑے کو تمام خوشیاں عطا کرے اور یہ ساتھ تا ابد قائم و دائم رہے انشاءاللہ۔ ادارہ بھائی ممتاز احمد اور ان کے اہل خانہ کو خوشی کے ان لمحات میں مبارک باد پیش کرتا ہے۔

نہیں تھی مگر احوال پڑھ کر ایسا لگا جیسے میں بھی اس خوب صورت تقریب کا ایک ایک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ کہانیوں کا انتخاب ہمیشہ کی طرح سبھی کا بہت خوب تھا۔ ''قوس و قزح'' بہت خوب صورت کہانی ہے۔ فرداً فرداً سبھی کے نام نہیں لکھ سکی ایم سوری میرے فائنل ایئر کے پیپر قریب ہیں اس وجہ سے تیاری میں مصروف ہوں۔ سبھی بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ انشاءاللہ زندگی رہی تو امتحانوں کے بعد میں مستقل احوال میں واپس آ جاؤں گی۔ تب تک دیجیے اپنی اس بہن کو اجازت۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ احوال کے خطوط میں تب تک کے لیے اپنا رکھیے گا ڈھیر سارا خیال۔''

✪ پیاری بہن! انشاءاللہ تم ضرور امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ امتحانوں کے بعد ہر ماہ تبصرہ لازمی بھیجنا۔

☆ لاہور سے ہماری شاعرہ ساتھی فریدہ فری لکھتی ہیں۔ ''سچی کہانیاں ایوارڈ نمبر ملا۔ ایوارڈ کا احوال سب نے بہت اچھا لکھا۔ فصیحہ جی بہت شکریہ۔ میری تعریف کرنے کا۔ آپ خود بھی تو بے حد اچھی ہو۔ منزہ جی نے کاش بہت ہی اچھا لکھا۔ ایک گناہ کی قیمت، بو، ذرا سی بات، سزا مجھے ملی۔ دو دن کی زندگی، داسی، الماس، جہالت، خانقاہ، حادثہ بھنور، خوش بخت بے حد اچھی کہانیاں لگیں۔ بس اتنا ہی پڑھا ہے۔ بیماری کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی۔ کاش میں منزہ جی سے ملنے کراچی جا سکتی۔ کاشی بھائی سے تو اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ سچی کہانیاں تو میرا فیورٹ میگزین ہے۔ لکھوں نہ لکھوں، پڑھتی ضرور ہوں۔ جن کو ایوارڈ ملے سب کو میری طرف سے بے حد مبارک باد قبول ہو۔ میں بھی ایک سچی کہانی لکھ رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔ سب کو میری طرف سے دعا اور سلام۔''

✪ اچھی آپی! آپ کی محبت کے لیے الفاظ نہیں میرے پاس۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ احوال میں شریک ہیں۔ خدا آپ کو صحت دے، (آمین)۔

☆ پینڈ ورہ، راولپنڈی سے یہ آمد ہے حافظ عابد علی بھٹی کی۔ لکھتے ہیں۔ ''میں ادب پسند آدمی ہوں اور خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ سچی کہانیاں جیسا عمدہ ڈائجسٹ کے ساتھ نہ ختم ہونے والا رابطہ قائم ہے۔ 4 اپریل کو آخری پرچہ تھا اور اپریل کا تازہ شمارہ بھی اسی شام خریدا۔ اسی لیے مارچ کے شمارے پر تبصرہ کروں گا۔ سرورق تھوڑا سا ڈراؤنا تھا۔ احوال میں آپ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ پہلا خط اقبال بانو صاحبہ کا دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ نئے آنے والوں کو خوش آمدید! تمام خطوط بہترین تھے۔ منشی عزیز صاحب کا ہر کہانی کی طرح خط بھی بہترین ہوتا ہے۔ جناب ممتاز احمد، فیصل ندیم، فرزانہ گل، صائمہ بشیر، صاحبہ میرے گاؤں کے ہیں، سلام۔ پردیس میں رہتے ہوئے اپنے ہی یاد آتے ہیں۔ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ خاص طور پر گھاسی رام کا بھوت، ہمزاد، سلومی اور رامی ٹاپ کی کہانیاں تھیں۔ ''ساتواں منکا'' ٹاپ پر تھی۔ ''دسواں میل'' کہانی اچھی تھی لیکن ''استانی جی کے عشق'' کی طرح متاثر نہ کر سکی۔ چھوٹی کہانیوں میں ''میں زندہ ہوں'' ٹاپ پر تھی۔ ''خونی حرم'' پڑھ کر خوف محسوس ہوا۔ بہت اچھی آپ بیتی تھی۔ اس کے علاوہ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سہو

گزشتہ ماہ ایوارڈ نمبر کے لیے بہن شمیما عبدالقیوم نے ایوارڈ تقریب پر اپنی یادداشتیں بھیجیں جو ہماری نامور لکھاری حنا بشریٰ کے نام سے شائع ہوگئیں۔ ادارہ اس سہو کے لیے بہن حنا بشریٰ سے معذرت خواہ ہے۔ ''رنگوں روشنیوں والی شام'' نامی مضمون سے حنا بشریٰ کا کوئی تعلق نہیں۔ شمیما عبدالقیوم کا تبصرہ بنام ''ایوارڈ نامہ'' اس ماہ پڑھیے اور محظوظ ہوں۔

تھیں۔ ''ہائیڈ پارک'' میں روایت اور حاکم بہترین انتخاب تھے۔ احمد رضوان اور فریدہ فری کی غزل پسند آئی۔ ''تیر نیم کش'' میں ہمیشہ کی طرح اچھے اشعار تھے۔ اپریل کے شمارے میں لکھاریوں کی ایوارڈ تقریب کے تاثرات دل سے پڑھے۔''

❁ پیارے عابد! تبصرہ بہت اچھا کیا آپ نے۔ آپ کی تعریف تمام لکھاریوں تک پہنچ گئی۔

❁ لدن ضلع وہاڑی سے ہمارے بہت عزیز بھائی منشی محمد عزیز مے لکھتے ہیں۔ ''ایوارڈ نمبر کا اتنی شدت سے انتظار تھا کہ میں مارچ سے ہی دوستوں سے رابطہ کر کے سچی کہانیاں کے متعلق پوچھتا رہا لیکن سبھی کا جواب نفی میں ہوتا۔ بروز ہفتہ اکیس مارچ کو ابراہیم جمالی صاحب نے ایس ایم ایس کر کے بتایا کہ ایوارڈ نمبر کراچی مارکیٹ میں آچکا ہے انہوں نے ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک باد دی اور سچی کہانیاں کا خلاصہ بھی بتا دیا جس پر سچی کہانیاں کے دیدار کی شدت اور بڑھ گئی۔ چار اپریل کو پوسٹ مین نے جب فون پر بتایا کہ آپ کی ڈاک آچکی ہے تو میں فوراً ڈاک خانے پہنچ گیا اور سچی کہانیاں وصول کر کے واپس بھاگے پر پہنچ کر رسالہ کھولا جہاں ایوارڈ نمبر کی جھلکیاں آتش شوق کو بھڑکا رہی تھیں۔ احوال کی ابتداء محبت ہے اور انتہا بھی محبت، خدا کرے محبتوں بھرے اس گلشن کو کسی بدخواہ کی نظر نہ لگے۔ احوال میں نسیم سحر کا نام بہت دنوں بعد نظر آیا۔ ویلکم بیک۔ دیگر مستقل ساتھیوں میں سے بہت ہی کم لوگ حاضر تھے، خیریت؟ سلطان احمد تنولی مرحوم سہام مرزا کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ اگلے صفحے پر کاشی چوہان، محترمہ منزہ سہام مرزا کی جانب سے سپاسنامہ پیش کر رہے تھے۔ قارئین کو لکھاری خواتین و حضرات میں سب سے پہلے ہمارے پیارے اور مخلص دوست ممتاز احمد کے تاثرات بیان ہوئے۔ اگلی باری افتخار چوہدری کی تھی۔ آگے نظر دوڑائی تو اسماء اعوان صاحبہ لائف بوائے کی خوبیاں اجاگر کرتی نظر آئیں۔ حمیرا خان آف شاہ کوٹ نے ''اک حسین یادگار شام'' کے عنوان سے ایوارڈ تقریب کا خوب تجزیہ کیا۔ حمیرا جی! آپ کے علاقے کی ایک پیاری سی بہن ثمینہ شاہد تھیں جو کہ اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، کیا آپ ان کو جانتی ہیں؟ اگلا صفحہ راقم الحروف یعنی منشی محمد عزیز کے نام تھا۔ بہت شکریہ۔ سچ میں سچی کہانیاں نے جس مقام پر مجھے لا کے کھڑا کیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ یہ آپ لوگوں کی محبت ہے جو میں بھی لکھاریوں کی صف میں کھڑا ہوں۔ بہت شکریہ سچی کہانیاں۔ بہت شکریہ منزہ آپی اور بہت شکریہ سہام مرزا۔ بہت شکریہ قارئین و لکھاری دوستو۔ آپ سب کی محبتوں کا میں معترف ہوں اور رہوں گا۔ میری ہمسائیگی میں نعمان اسحاق صاحب جلوہ افروز تھے۔ ریحانہ آفتاب قابل تعریف ہیں جو کراچی سے لاہور تقریب میں شرکت کے لیے تشریف لائیں۔ شاباش ہے بھئی۔ یاسر وکی! یہ کیا آپ نے تو بھرپور لکھنا تھا اتنا مختصر! رضوانہ کوثر، فصیحہ آصف خان اور شاہد محمود مغل نے مختصر جب کہ وقاص حسین نے اپنا سفرنامہ تفصیلی بیان کیا۔ اچھا بلکہ بہت اچھا لگا۔ نسیم سکینہ صدف ماشاء اللہ پوری فیملی کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔ ارم ناز اگرچہ تقریب میں تو شرکت نہ کر سکیں لیکن مکتصر تاثرات اور اپنی تصویر بھیج دی۔ بلال فیاض، قاسم خان بلوچ، شائستہ انور، بشریٰ سعید احمد، ایم حنیف عاصم بلوچ، مجید

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خواتین کی محبوب قلم کار

رفعت سراج کا تازہ ترین شاہکار "دامِ دل"

رفعت سراج کے جادو گر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں

"**دامِ دل**" ..... دوشیزہ ڈائجسٹ میں مقبولیت کی بلندیوں پر

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ..... اور جب محبت کرنے والے سماج کی آنکھوں میں کھٹکنے لگ جائیں تو .....

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے اُس ماں کی ..... جسے بیٹیوں کی پیدائش پر سسرالی رویوں نے سولی چڑھا دیا

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے محبت کی دنیا میں آگ لگانے والے کریہہ چہروں سے نقاب اُتارنے والوں کی

"**دامِ دل**" ..... کہانی ہے معاشرے کے ان لالچی کرداروں کی ..... جن کی ہوس نے محبت کی زمین کو اجاڑ ڈالا

تو پھر پڑھنا نہ بھولیے گا۔

رفعت سراج کا شاہکار ناول "دامِ دل"

آپ کے اپنے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ہر ماہ شائع ہو رہا ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

احمد جائی، اشفاق شاہین، راحت وفا راجپوت، زمر نعیم، طاہر ساقی، ملک علی رضا، عبدالغفار عابد اور حنا بشریٰ نے بھی خوب لکھا۔ طاہر ساقی! اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔ بورے والا سے ہونے کے باوجود تعارف تک نہیں۔ افشاں کی ''ایس ایچ او'' پرانے دور کی ہمدرد پولیس کی عکاسی کرتی ہے۔ ''داسی'' میں احمد سجاد بابر نے بانو قدسیہ پر بھرپور مضمون لکھا۔ سید ملازم حسین شیرازی کی تحریر ''الماس'' پڑھ کر حساس دل اور رنجیدہ ہو گیا۔ ممتاز احمد کی تحریر اسم بامسمیٰ تھی۔''

✻ پیارے بھائی! تبصرہ پور کیا آپ نے۔ حقِ محبت ادا ہوا۔ اسی طرح ہر ماہ آپ ہمارے ساتھ رہیں تو کیا ہی بات ہو۔

☆ چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے ہمارے بھائی فیصل ندیم بھٹی لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں ایوارڈ نمبر بھی ایوارڈ تقریب کی طرح بہت انتظار کرنا پڑا۔ ایوارڈ کی مناسبت سے ٹائیٹل میں حسینہ دلکش انداز کے ساتھ منفرد انداز میں بھلی لگ رہی تھی۔ ''کاش'' میں منزہ سہام مرزا احساس کی بات کر رہی ہیں۔ احوال میں سب سے پہلے کاشی چوہان محبت کے فلسفے کو کوزے میں بند کرتے ہوئے نظر آئے۔ سب سے پہلے احوال میں نئے آنے والے طفیل طوفی اور راحیلہ منظر کو خوش آمدید۔ کاشی چوہان کا سپاس نامہ اور ممتاز احمد کے قلم سے تقریب کا احوال پڑھ کر دوبارہ تقریب کی یاد تازہ ہو گئی۔ لائف بوائے ٹیمپو کی کہانی پڑھنے سے اس کے رزلٹ کا پتا چل رہا ہے۔ کہانیاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ باباجی کے فیض سے ہزاروں لوگوں کو فیض پاتے دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ تمام قارئین اور اسٹاف کو سلام۔''

✻ پیارے فیصل خوش رہو۔ تبصرے کو مختصر تحریر کر کے تم نے بھی دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

☆ کوہاٹ سے سید ملازم حسین شیرازی لکھتے ہیں۔ ''ماہ اپریل کا سچی کہانیاں کا ایوارڈ نمبر نہایت شاندار اور قابل صد تحسین رہا۔ فروری کا خط موجودہ شمارے میں شائع ہوا لیکن مارچ کا ارسال کردہ خط اشاعت کی منازل طے نہ کر سکا۔ ہو سکتا ہے آپ کو نہ ملا ہو۔ ''الماس'' کو شمارے میں جگہ دینے کا شکریہ۔ ایوارڈ کی تصویری جھلکیاں بہت خوب صورت لگیں۔ قارئین لکھاریوں اور شرکاء کے تاثرات دلچسپیوں کے حامل تھے۔ چار گھنٹوں پر مشتمل خوب صورت پروگرام کی روداد بہت اچھی بیان کی گئی۔ شرکت سے محروم رہنے والوں کی تشنگی دور ہوئی۔ یہ سب آپ کی اور آپ کے احباب کی محنت اور لگن کا ثمر ہے۔ اللہ پاک آپ کو مزید عزت و توقیر سے نوازے، (آمین)۔ منزہ سہام صاحبہ اور ان کی فیملی کی شدت سے کمی محسوس ہوئی ہو گی اللہ رب العزت انہیں صحت دے، (آمین)۔ اداریہ احساس ہی زندگی کی اساس ہے۔ اثر انگیز تھا۔ ''خوش بخت'' از قلم ممتاز احمد پڑھائی سے بیزار بچہ ایک دن ٹرانسپورٹ کمپنی کا کروڑ پتی مالک بن گیا۔ ایک دن کے لاوارث بچے کی نگہداشت نے خوش بختی کے دروازے کھول دیئے۔ ''داسی'' محبت کی نہایت متاثر کن حقیقت پر مبنی کہانی تھی۔ ''تیری راہ تک رہی ہوں'' فیصل ندیم بھٹی کے قلم سے اچھا سبق دیتی بہترین کہانی تھی۔ ''برف کے شہر'' قمر علی عباسی کا قیمتی معلومات اور دلچسپیاں دیتا سلسلہ بخوبی اختتام پذیر ہوا۔ کاوش صدیقی کی ''خانقاہ'' موجودہ دور کا فقر و اسرار سے بھرپور سلسلہ ہے۔ ''واپسی'' نصیحت آموز کہانی تھی۔ ''قوس و قزح'' از قلم رانا حبیب الرحمن ایک دلچسپ سرگزشت تھی۔ ''ایس ایچ او'' دنیا میں اچھے لوگ نہ ہوں تو قدرت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ باقی کہانیاں کمال کی لکھی گئیں۔ سلیمان بشیر! لاہور میں رہتے ہوئے تقریب میں شرکت نہ کی، آپ سے زیادہ ہمیں دکھ ہے۔ خوش رہیں۔ شازیہ گل! خط خوب صورت لکھا۔ حنا بشریٰ! تبصرہ ہمیشہ کی طرح جاندار رہا، روداد کے بارے میں لکھی گئی تحریر نے بہت لطف دیا۔ ثمینہ طاہر بٹ!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خط شاندار تھا۔ نسیم سحر! آپ کے مفصل خط نے بہت محظوظ کیا، ویلڈن۔ فیصل ندیم بھٹی! خط بھی اچھا ہے کہانی بھی بہترین۔ رئیسہ خالد، نعمان احمد، عابدہ طارق، ذیشان ریاض آپ سب کے تبصرے تعریف وتوصیف کے محتاج نہیں۔ کاشی صاحب کی نظم کی جتنی تعریف کی جائے حق ادا نہ ہوگا۔ بہت خوب۔ بارڈر کے اُس پار اور اِس پار مٹی کی خوشبو ایک ہے۔ پھر نفرتیں کیسی؟ مسئلہ یہ ہے، ہائیڈ پارک، تیر نیم کش، متفرقات بہترین رہے۔ ڈیئر کاشی! ہمارے ملک میں ڈائجسٹوں، رسائل کی بھرمار ہے لیکن اپنے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی اور انہیں اعزاز سے نوازنے کی جو کاوشیں سچی کہانیاں، دوشیزہ انجام دے رہے ہیں اور کوئی نہیں کر رہا جو قابلِ صد تحسین ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی تعریف کے چند الفاظ، زبان سے ادا کیے گئے توصیف کے چند بول، کوئی چھوٹا بڑا تحفہ بہت بڑی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں اور ہمیشہ فخر وانبساط کی نگاہوں کا مرکز ہوتے ہیں۔''

پیارے بھائی! آپ کی سلامتی کی دعائیں ہر پل لبوں پر رہتی ہیں۔ امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ آپ کا تبصرہ بہت شاندار ہے۔

☆ ہماری بہت پیاری بہن ثنا بشریٰ لاہور سے عرض گزار ہیں لکھتی ہیں۔ ''بھائی آپ خوش رہیں اور اللہ آپ کو مزید کامرانیاں عطا فرمائے (آمین)۔ ایوارڈ نمبر کا شدت سے انتظار تھا۔ ٹائیٹل کا انتخاب ایوارڈ نمبر کے شایانِ شان تھا۔ طبیعت فریش ہوگئی۔ ''احوال'' کا آغاز کاشی بھیا کے جادوئی الفاظ اور سحر انگیز باتوں سے ہوا، پڑھ کر لگا کہ الفاظ کی جادونگری میں پہنچ گئی ہوں۔ تقریب کا احوال تمام رائٹرز نے اس خوب صورتی سے لکھا کہ 26 جنوری کی بھیگی بھیگی شام کی خوشگوار یادیں پھر سے تازہ ہوگئیں۔ تصویری جھلکیاں مزہ دوبالا کر گئیں۔ کافی رائٹرز سے ملاقات نہ ہوسکی جس کا مجھے بے حد دکھ ہے۔ چلیں حمیرا خان انشاء اللہ اگلی بار ملاقات ہو جائے گی۔ راحت وفا راجپوت سے محبت بھری ملاقات بہت یاد آئی ہے، جاتے وقت اتنی محبت سے گلے لگیں کہ دعا گو ہوں کہ پھر سے ایسی شاندار تقریب ہو اور اپنے تمام بہن بھائیوں سے ملاقات ہو۔ رضوانہ کوثر صاحبہ بہت اچھی اور ملنسار لگیں۔ شائستہ انور بھی بہت سادہ اور اچھی لگیں۔ کوئی بڑا رائٹر تھا کوئی چھوٹا مگر سب بے حد خوش دلی سے ملے۔ تبصرے اور خطوط سب کے شاندار تھے۔ بھائی غلام مرتضیٰ علوی کا خط بے حد مزہ دے گیا۔ بھیا ملازم حسین شیرازی کا خط بھی متاثر کن تھا۔ بھائی آپ نے صحیح کہا یہ آپ سب کی دعاؤں کا ثمر ہے کہ اللہ نے یہ اعزاز بخشا۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ محمد طفیل طوفی، ثمینہ طاہر بٹ آپ کو اللہ صحت، زندگی عطا فرمائے اور بیماری سے نجات ملے۔ نعمان احمد آرائیں! اللہ آپ کی مشکلات کا خاتمہ فرمائے۔ میرا خط لکھنے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اپنے پیارے بھیا کی حوصلہ افزائی کروں جو ہمارے لیے اتنی محنت کرتے ہیں اور ہماری تحریروں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ کوئی پریشان ہو اس کے لیے دعا، جو بیمار ہے اس کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔ اس کے علاوہ تمام رائٹرز کی تحریروں کا ذکر جو جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کتنا کامیاب ہوئے۔ ان تمام باتوں کے لیے میں احوال میں شریک ہوتی ہوں۔ احمد سجاد بابر صاحب نے پھر میدان مار لیا جس موضوع پر لکھتے ہیں حق ادا کر دیتے ہیں قلم کا۔ میں آپ کی تحریروں سے بہت کچھ سیکھتی ہوں، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اب تحریروں کی بات ہو جائے۔ دستگیر شہزاد کی تحریر ''اک گناہ کی قیمت'' بہت متاثر کن تھی۔ کرن شبیر نے بھی بہت اچھا لکھا۔ سید وجاہت علی کی ''واپسی'' بہت شاندار تھی۔ اس شان سے واپسی ہوئی کہ ایک بندی نے اپنی جان دے کر ایمان حاصل کر لیا۔ ''الماس'' بہت حساس تحریر تھی۔ بھائی ملازم حسین شیرازی کے کردار بہت گہرے ہوتے ہیں اور آپ کا خط اور تحریر دونوں کمال کے ہوتے ہیں۔ خوش بخت، گیم، محبت اور فرض، تیری راہ تک رہی ہوں، سزا مجھے ملی، ذرا سی بات، داؤ سب کی سب جاندار تحریریں تھیں۔ ایس ایچ، دنیائے جستجو، چمن پھونک دیا، بھنور، بس محبت چاہیے، رب کا انصاف، حادثہ،

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پچھتاوا، جہالت، دو دن کی زندگی منفرد اور اچھوتی تحریریں تھیں۔ سب نے بہت محنت کی، ویلڈن۔ ''خانقاہ'' اور ''قوس وقزح'' بھی زبردست ہیں۔ ہائیڈ پارک، تیر نیم کش اور برف کے شہر میں سب کا سب اچھا تھا۔''

☆ پیاری سی گڑیا بہن! سلامت رہو، تبصرہ زبردست، کہانیوں کی طرح شاندار تھا۔ تم بہت ترقی کرو گی۔

☆ تمکین آباد سے وقاص کھوکھر لکھتے ہیں۔ ''اس بار شمارہ 5 اپریل کو ملا۔ آپ نے تو اس بار غضب ہی کر دیا ہے۔ اتنا پیارا پرچہ، اتنا دلکش میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ لاہور کی محفل کے نظارے کیا کہنے دل مر مر کے زندہ ہوتا ہے۔ ''داسی'' بہت ہی اچھا خراج تحسین ہے آپا کو۔ آپا آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ تمام احباب کے تبصرے بہت ہی اچھے تھے۔ صوفی بھائی کے لیے دل سے دعا ہے کہ مالک تندرستی عطا فرمائے۔ جو دوست احباب غیر حاضر تھے ان کی بہت کمی محسوس ہوئی اور ان سے تاکید کی جاتی ہے کہ اگلی دفعہ محفل میں ضرور حاضر ہوں ورنہ ہم ان کو بھول جائیں گے۔ ایم اے راحت صاحب کے لیے دعائے صحت کی پرزور اپیل کی جاتی ہے۔ موسٹ پاپولر رائٹر بہن ارم ناز آپ کی کہانیاں کمال کی ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی اگر مقدر میں ہوا۔''

☆ پیارے بھائی! تبصرہ تو کیا مگر...... احوال کو اب غور سے پڑھنا۔

☆ کراچی سے ہماری پیاری آنٹی نفیسہ فضل بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''عزیز بیٹے کاشی! ہمیشہ خوش رہو۔ سب سے پہلے تو سیم فاروقی صاحب کی ناگہانی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تمام ان لوگوں کو صبر و ہمت عطا فرمائے جن کے پیارے ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور ان سب مرحومین کی مغفرت فرمائے، (آمین)۔ میں ان سب بیٹے بیٹیوں کی شکر گزار ہوں جو مجھے یاد کرتے ہیں۔ خاص کر رفعت بیٹی و عاصم بلوچ و دیگر۔ میں ایک بیمار اور عمر رسیدہ خاتون ہوں پوسٹ آفس دور ہے اس وجہ سے دو ماہ سے احوال سے غیر حاضر ہوں۔ ایم اے راحت صاحب کی صحت و زندگی کے لیے دعا گو ہوں، اللہ رب العزت انہیں زندگی و صحت عطا فرمائیں، (آمین)۔ 2005ء میں ایک ڈائجسٹ میں لکھ رہی تھی وہاں سے دعوت ملی پھر کسی وجہ سے منسوخ ہوگئی وہاں راحت صاحب مہمان خصوصی تھے یہ میری بدنصیبی تھی کہ اتنی عظیم ہستی سے ملاقات نہ ہوسکی میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ بالآخر رائٹرز ایوارڈ تقریب منعقد ہوگئی اور ہم انتظار ہی کرتے رہے، خیر تصویریں اور سب ایوارڈز یافتگان کی تحریریں دیکھ کر لگا کہ شاید ہم بھی وہاں ہیں تھے۔ مان نیہ کاشی بیٹا مانتی تو پہلے ہی ہوں منزہ بیٹی کو مبارک ہو اتنے زبردست موسم میں یہ پیاری تقریب کا انعقاد ہوا۔ اللہ پاک آپ سب کو حوصلہ و ہمت دے، (آمین)۔ اب آیئے ماہ اپریل کی پہلی کہانی کی طرف۔ ''داؤ'' افتخار چوہدری اکثر خوابوں کے ذریعے انسان کو آگاہی ہو جاتی ہے یہی مریم کے ساتھ بھی ہوا۔ ''ایک گناہ کی قیمت'' دستگیر شہزاد انسان کو اپنے گناہ کی سزا اسی دنیا میں بھگتنی پڑتی ہے جیسے شازیہ کو۔ ''بو'' کرن شبیر! کاش نفیس اپنی بیوی کی بات پر غور کر لیتا۔ ''دنیائے جستجو'' نسیم منیر علوی اچھی کہانی ہے۔ ''محبت اور فرض'' بابر نایاب زبردست جب کہ آج کل کے زمانے میں یہ مشکل ہے۔ ''ذرا سی بات'' فردوس بانو، کاش کہ مردوں کو عقل آ جائے۔ ''سزا مجھے ملی'' آصف سکندر، بے چاری آصفہ کا کیا قصور تھا حیدر پڑھا لکھا ہو کر بھی جاہل ہی نکلا۔ ''تیری راہ تک رہی ہوں'' فیصل ندیم بھٹی، نصیحت آمیز کہانی ہے۔ ''دو دن کی زندگی'' شاہد محمود مغل اچھی کہانی لائے، ایسے لالچی انسان کا یہ ہی انجام ہونا تھا۔ ''ایس ایچ او'' بہت زبردست تحریر ہے۔ ایسے باہمت فرض شناس مجاہد کو سلام کرنے کو دل کرتا ہے جس طرح میں راحیل شریف کی مداح ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں زندگی، عزت و شہرت عطا فرمائے، (آمین)۔ افشاں خوش رہو۔ ''داسی'' احمد

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جون 2017ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

جون 2017ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: _____ تعداد صفحات: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

_____

فون/سیل نمبر: _____

جون 2017ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: _____ مصنف: _____

دوم، عنوان: _____ مصنف: _____

سوم، عنوان: _____ مصنف: _____

نام: _____ شہر: _____

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سجاد بابر بہت خوب۔ بانو قدسیہ میری پسندیدہ شخصیت ہیں، اللہ پاک انہیں اور اشفاق احمد صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، (آمین)۔ بہت سی خوبیاں مرحومہ کی احمد سجاد بابر کی تحریر سے معلوم ہوئیں۔ جزاک اللہ۔ ''الماس'' بہت اچھی تحریر ہے۔ سید ملازم شیرازی ہمیشہ اچھی کہانیاں لاتے ہیں۔ ''واپسی'' سید وجاہت علی کی بہترین ایمان افروز تحریر ہے۔ ''باغباں نے ہی چمن پھونک دیا'' فرزانہ نگہت، شمیم جیسی عورتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ بے چارہ فیضان ماں کی محبت میں مارا گیا۔ ''برف کے شہر'' قمر علی عباسی ویلڈن۔ ممتاز احمد، ''خوش بخت'' دل خوش کر گئی واہ۔ ''قوس وقزح'' اچھی جا رہی ہے رانا حبیب الرحمن کی۔ ''ہائیڈ پارک'' اور ''تیر نیم کش'' اچھے ہیں۔''

☆ پیاری سی آنی! تبصرہ پا کر دل خوش ہو گیا، مزید یہ کہ اتنا بھرپور تبصرہ دل خوش کر دیتا ہے۔ سلامت رہیے۔

☆ ملتان کینٹ سے ہمارے نئے لکھاری ساتھی عاطر شاہین عرض کرتے ہیں۔ ''السلام علیکم! مارچ کا شمارہ اپنی بہترین آب وتاب کے ساتھ موصول ہوا۔ اس میں میری اپنی کہانی ''خونی حرم'' بھی شامل اشاعت تھی۔ میں ایک لکھاری ہوں اور میں نے متعدد میگزین میں لکھا ہے لیکن سچی کہانیاں کو میں نے سب سے مختلف پایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نہ صرف مختلف موضوعات پر کہانیاں شائع کرتے ہیں بلکہ لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں ایوارڈ سے بھی نوازتے ہیں۔ اس سے رائٹر کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان میں لکھنے کا مزید جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے آج سے چار سال پہلے سچی کہانیاں کا مطالعہ کیا تھا اور آج کے سچی کہانیاں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ آج کے اور چار سال پہلے کے سچی کہانیاں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اب نہ صرف ملک کے معروف رائٹر لکھ رہے ہیں بلکہ نئے لکھنے والوں کو بھی مواقع مل رہے ہیں۔ میری کافی عرصے سے خواہش تھی کہ میں بھی سچی کہانیاں میں تحریر لکھوں اور الحمدللہ آپ نے میری تحریر شائع کر کے مجھے مزید لکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ زندگی باقی رہی تو میں سچی کہانیاں میں تحریریں لکھتا رہوں گا۔''

☆ پیارے بھائی عاطر! غور کر کے ہی آپ کو موقع دیا۔ امید ہے سمجھ گئے ہوں گے۔ باقی اب دیگر کہانیاں کب تک ہم وصول کریں گے؟

☆ مکھن آباد سے خواجہ حسین جاوید کی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''شمارہ سات مارچ کو جناب سرور شاز صاحب کی شاپ سے لیا۔ ''ہمت ہی تو چاہیے'' بالکل بجا فرمایا۔ محفل احوال میں پہلی آمد آپی اقبال بانو کی تھی جو کہ بہت ہی شاندار تھی۔ جناب بھائی مور شاہد حسین یاد آوری کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی کہانی ''زندہ ہوں'' اچھی لگی۔ آپ کی تائی جان کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ آپا مسز نوید ہاشمی صاحبہ آپ کا خط کمال کا تھا۔ اللہ پاک آپ کو خوش رکھے، (آمین)۔ کراچی دنیا کا آٹھواں بڑا شہر ہے اور اس پر کاشی صاحب کی نظم ''کراچی'' کمال کی تھی۔ آپی نزہت جبیں ضیاء صاحبہ آپ باکمال خاتون ہیں، اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، (آمین)۔ بہن ارم ناز صاحبہ بہت عمدہ تحریر لکھی ہے آپ نے ''جن دوست''۔ اس سے پہلے بھی میں آپ کی کہانی پڑھ چکا ہوں اس کا نام اب یاد نہیں آ رہا وہ آپ نے محلے میں ٹی وی پر لکھی تھی۔ وہ حقیقت پر مبنی تھی۔ آپ لاجواب لکھاری ہیں۔ کاشی صاحب میری کہانی کب تک شائع ہو جائے گی؟ کاشی صاحب کیا کروں میرے مزاج میں بہت جلد بازی ہے۔ جناب میں ایف اے انگلش میں فیل ہوں، میں تیاری میں مصروف ہوں، دعا کرنا کامیاب ہو جاؤں۔''

☆ پیارے بھائی! جلد بازی بہت بری چیز ہے۔ جلد بازی اور بلاضرورت نکتہ چینی سے لوگ ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں۔ تم بھلے ہی ایف اے میں فیل ہوئے مگر ہم نے تمہیں پاس کر دیا۔ خوش رہو، کہانیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے بارے میں خوش فہمیاں پالنے کے بجائے محنت کی ضرورت ہے۔ امید ہے سمجھ گئے ہو گے۔

☆ صوفی غلام مصطفیٰ آزاد تبسم کی احوال میں یہ پہلی آمد ہے۔ لکھتے ہیں۔ ''برادرم عزیز کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم چند دن پہلے سچی کہانیاں مارچ 2017ء موصول ہوا۔ میں تہہ دل سے آپ کا، آپ کی تمام انتظامیہ کا ممنون ہوں۔ کچھ ماہ پہلے ملتان میں ایک ادبی پروگرام میں شرکت بھی کی۔ ایسے پروگراموں کا ہونا اچھا لگتا ہے۔ لاہور میں آپ کا پروگرام ہوا مگر دعوت نہیں تھی اس لیے حاضر ہونا مناسب نہ سمجھا۔ سچی کہانیاں ادب کے فروغ کے لیے ایک معیاری پرچہ ہے۔ میرے ایک عزیز دوست ملک علی رضا اعوان آپ کے حوالے سے بڑی مثبت گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی زیادہ تر وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو ادب نواز ہوتے ہیں۔ انٹرنیٹ، موبائل، فیس بک نے دوستوں کو کتاب سے بہت دور کر دیا ہے مگر کبھی بھی کتاب کی اہمیت کم ہوئی ہے اور نہ ہی ہو گی۔ جب تک کتاب سے لگاؤ رکھنے والے دوست ہیں کتاب کی اہمیت برقرار رہے گی۔ آپ کی محبتوں کا ایک بار پھر تہہ دل سے شکریہ۔''

☆ اچھے بھائی! خوش آمدید جب تک آپ جیسے ادب نواز لوگ ہیں، ادب بھی زندہ رہے گا، سلامت رہیے۔

☆ ضلع ایبٹ آباد حویلیاں گاؤں سیری سے یہ پہلی بار آمد ہے افضال احمد کی۔ لکھتے ہیں۔ ''سچی کہانیاں کی پوری ٹیم بفضل ربی خیر و عافیت سے ہو گی۔ یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ راحت بھائی کی ناساز طبیعت میں بہتری آئی ہے اور دوسری طرف ہماری پیاری مصنفہ رفعت سراج کے والد محترم کا سن کے بے حد تاسف ہوا۔ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نومبر مجھے اپنی ارسال کردہ کہانی ''زندگی کی حسین راہ گزر'' اس کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ شائع ہو گی کہ نہیں اور یہ کہ میں اپنی نئی کہانی ارسال کروں یا نہیں۔ انہی گلے شکوؤں کے ساتھ یہ بھی کہ پرچہ ہمیں بہت تاخیر سے موصول ہوتا ہے اگر کچھ سدباب ہو سکے تو ہم بھی ہر ماہ کسی نہ کسی سلسلے میں شریک ہو سکیں چاہے وہ ''تیر نیم کش'' ہو کہ ''احوال'' اور مجھے جواب کا انتظار رہے گا۔ آخر میں یہ ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور سچی کہانیاں کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے، (آمین)۔''

☆ پیارے افضال! سدا سلامت رہو۔ خوش آمدید! تمہاری کہانی تو نظر سے نہ گزر سکی جب کہ تازہ کہانی جلد پڑھ کر رائے دیں گے اگر تم پرچے کے سالانہ خریدار بن جاؤ گے تو ہر ماہ وقت پر پرچہ تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔ کہانی بھیجنے کے لیے اجازت کی قطعاً ضرورت نہیں فوراً بھیج دو۔ تبصرے کا شکریہ۔

☆ ایبٹ آباد سے ہماری بہن ام مناہل شریک احوال ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''سب سے پہلے رفعت سراج کے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک تمام اہل و عیال کو صبر جمیل اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ آج 9 مارچ کو رسالہ ایبٹ آباد پہنچا ہے اور آج ہی آپ کو خط لکھ رہی ہوں اس لیے کہانیوں پر تبصرہ نہیں کر سکتی اس کے ساتھ ایک کہانی بھیج رہی ہوں اگر خط لکھنے میں دیر ہو گئی کیونکہ ٹوکن کا مسئلہ ہوتا ہے مگر آپ نے ایوارڈ یافتہ کہانی کے لیے 25 فروری آخری تاریخ دی ہے مگر رسالہ تو مارچ کی تاریخ میں آیا ہے تو 25 فروری تک ہم کیسے کہانی بھیجیں۔ (ایوارڈ یافتہ کہانی کے لیے تاریخ نہیں دی۔ تاثرات کے لیے دی تھی اشتہار دوبارہ پڑھیں)۔ منزہ باجی آپ کے الفاظوں کو بھی پڑھ کر لوگ صفحہ پلٹ دیں گے اور عمل کرنا تو درکنار سوچنا بھی پسند نہیں کریں گے کہ اتنا ٹائم کس حکمران کے پاس ہے بالکل اسی طرح جیسے خبرنامے میں آنے والی بریکنگ نیوز ہر گزرتے لمحے نیچے ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہو جاتی ہے۔ باقی آئندہ ماہ۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

❁ پیاری بہن! سچ کہا آپ نے مگر حساس دل اور مادرِ وطن کا درد رکھنے والے اپنی بات دوسروں تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ آپ کے تبصرے کا اگلے ماہ انتظار رہے گا۔

☆ کراچی سے ہماری بہت پیاری بہن سیمیں غزالہ نیہاں عرض گزار ہیں۔ ''اپریل کے شمارے کا بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ ایوارڈ کی تقریب کا حال احوال معلوم کرنا تھا۔ سو خلاف توقع پہلی تاریخ کو ہی مل گیا۔ سب سے پہلے ایوارڈ کے احوال اور تاثرات جو لکھاریوں نے لکھے تھے وہ پڑھے۔ میری طرف سے آپ کو اور منزہ سہام کو اس تقریب کو کامیابی سے منعقد کرنے اور اس کی محنت اور کوششوں کے لیے ڈھیروں مبارکباد اور تمام ایوارڈ ونرز کو مبارکباد۔ امید تھی کہ اس مہینے میں میری کوئی کہانی چھپے گی مگر ابھی تو اس مدعے سے ہی نہیں نکلی کہ کاشی مجھے دعوت نامہ موصول ہوتا تو ایوارڈ کی تقریب انجوائے کرتی۔ دراصل جو چیز قسمت میں نہ ہو تو کبھی نہیں ملتی۔ ایوارڈ میں نام آنے کے بعد بھی اس سے محروم رہی یہ قسمت ہی تو ہے۔ اب کہانی بھی نہیں چھپی تو نارسائی کا دکھ بڑھ گیا۔ آپ سے کوئی گلہ نہیں، اپنی غلطی ہے۔ میں نے تقریب کی تاریخ کا پتا نہیں کیا۔ ایک تو سردی کا موسم بہت اچھا لگتا ہے دوسرے تقریبات میں ضرور جاتی ہوں (اگر بلایا جائے تو) اس دفعہ دونوں ہی سے محروم رہی۔ (اگلی بار نہیں ہوں گی)۔ آج کل گردشِ حیات اور کشاکشِ حیات دونوں میں مبتلا ہوں۔ ایک ہفتے میں دو دفعہ گر چکی ہوں۔ بڑی تو بے شک بچ گئی مگر پاؤں میں چوٹ زبردست آئی ہے۔ سلیم صاحب کی رحلت کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ کہانی صرف ایک پڑھی ہے۔ ''ایک گناہ کی قیمت'' اور پڑھ کر کانپ گئی ہوں۔ عورت اپنے آپ کو اتنا بے وقعت بھی کر سکتی ہے جب کہ چٹان سے زیادہ سخت اور فولاد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ پھر ایک کمزور لمحے میں اپنا آپ گنوا دے، ایسا کیسے ہو گیا.....؟ انسان کو ہر حال میں اپنے ایمان اور کردار کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ ایسی غلطی کی سزا مذہب میں سنگسار کر دینا ہے اس عبرت انگیز سبق آموز کہانی نے دل دکھا دیا۔ کاش لوگ مذہبی تعلیمات پر بھی توجہ دیں۔ باقی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ اس لیے تبصرہ نہیں لکھ سکتی۔ کاشی صاحب میری شکایتوں کا برا نہیں مانیے گا اس کا تعلق آپ سے نہیں خود سے ہے۔ ''سچی کہانیاں'' والوں نے تو میری ہمیشہ حوصلہ افزائی اور عزت کی ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی شکر گزار ہوں۔''

❁ اچھی بہن! آپ کی تکلیف کا سن کر سچ مچ دل دکھی ہوا۔ اپنا خیال رکھیں اور آپ کی کہانیاں جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ اس ماہ اپنی کہانی تو پڑھیے۔

☆ کراچی سے ہماری آپا مسز نوید ہاشمی بڑے دنوں بعد احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''دوستوں اور ساتھیوں السلام علیکم! ہم کتنے ہی پلان بنالیں اب یہ کام کریں گے، وہ کریں گے مگر اللہ کی رضا کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ ماہ مارچ بہت پریشانی اور مصروفیات میں گزرا۔ سچی کہانیاں میرے bag میں ہے مگر اسے کھولنے، پڑھنے سے دور رہی۔ میری بہن روبینہ حامد کی کافی طبیعت خراب رہی۔ زندگی اور موت سے جیت کر واپس آئی ہے۔ دعاؤں میں وہ طاقت ہے جو مردے میں جان ڈال دیتی ہے۔ بس اللہ کا شکر کرتے رہیے اور اللہ کو نہ بھولیے۔ ''پراسرار نمبر'' میرا پسندیدہ نمبر ہوتا ہے مگر مجبوری نے اس سے دور رکھا۔ مور شاہد حسین کی تائی اور چچی کی مغفرت کے لیے دعا گو ہوں۔ سلیم فاروقی کے انتقال پر افسوس ہوا۔ رفعت سراج کے والد کا سن کر افسوس ہوا۔ غلام مرتضیٰ کی والدہ کا بھی افسوس ہوا۔ اتنے سارے غموں میں ایک خوشی کی خبر.....! ایم یعقوب احمدانی ہماری بھابی لے آئے مبارک ہو۔ پراسرار نمبر میں سلیم اختر کی تحریر پڑھی۔ ایک ظالم چوہدری کے ظلم کی داستان۔ جاوید راہی صاحب سلومی اور رامی سے ملانے لے آئے اف وہ تو روح تھی، تھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھرکانپتے افتخار چوہدری کے ہم زاد سے ملے اسے قابو کرنے کی کوشش کی۔ سباس گل نے بتایا کالا جادو ہے۔ اف یہ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ پھر ثمینہ طاہر نے کہا جو وعدہ کرو پورا کرو۔ ابھی ہم ڈر کر سر ہلا رہے تھے کہ ہارون، عامل کے اشناپ سے قبرستان کو بچانے کی خبر سنا رہے تھے یتیم والے بابا جی تسی چھا گئے۔ نازیہ بتول کی شاندار تحریر دل کو چھو گئی۔ حنا بشریٰ بھی جب لکھتی ہیں کیا خوب لکھتی ہیں۔ ممتاز احمد ''دسواں میل'' پڑھ کر مزا آ گیا۔ کہانی ایسی لگی جیسی میں پڑھنا چاہ رہی تھی۔ ویلڈن! نفیسہ سعید کیوں پوچھ رہی ہیں کہ مالا کون تھی۔ الماس فاطمہ بتاؤ لال چڑی میں قید ایک آتما۔ عطیہ کیا کہہ رہی ہیں یہ ہماری ہے۔ شیخ معظم آپ بتاؤ ایک ڈاکٹر کی موت نئے گھر سے ہوئی ہے جو نینا خان کا ہے۔ حمیرا خان کیا یہ خلائی مخلوق گفگو ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ بولی سنیں نورانی ناگ واقعی اس نے اللہ کا گھر آباد کیا۔ ارم نازش کر خوشی ہوئی کہ جن بھی تمہارے دوست ہیں۔ چلو ویسے کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے تو نیر شفقت بتا دینا ویسے وہ شادی کس کی تھی۔ عصمت پروین کیا کہہ رہیں ہیں بس مجید احمد نے چلہ ادھورا کاٹا ہے۔ مور شاہد حسین ''میں زندہ ہوں'' سلامت رہیے۔ ''روٹی دے دو'' شیما عبدالقیوم جی کی کہانی بھی زبردست تھی۔ کاشی اتنا خوب صورت پرچہ پیش کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ ایوارڈ نمبر میرے پاس پہنچ چکا ہے میرے ہاتھ میں ہے۔ ذرا صبر کرو دیکھ لوں پڑھ لوں دل میں بٹھا لوں پھر تبصرہ کرنے میں مزا آئے گا۔ اب اجازت دو آپ کی آپا۔''

☆ اچھی آپا! تبصرہ شاندار کیا آپ نے۔ آپ کی پریشانی سن کر دل بھی دکھی ہوا اور افسوس بھی کہ ہم چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ خدا روبینہ باجی کو جلد از جلد اچھا کر دے، (آمین)۔

ساتھیو! اس خط کے ساتھ ہی ہماری آپ کی ملاقات اختتام کو پہنچی۔ مختصر کہانی نمبر کیسا لگا۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ خدا نے چاہا تو۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی اجازت سے پہلے تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔

CENSUS 2017

آج سے خانہ شماری شروع ہے
اتنے سارے بازو، ٹانگیں، سر اور آنکھیں
ٹریننگ کے تعویذ لے کر
الگ الگ بکھر گئے ہیں
سیکورٹی کے جنتر منتر
آزو، بازو اہنی گہنے ٹانگے
قدم بہ قدم چل رہے ہیں
ہر دس برس بعد
حکومت آبادی کی مرمت چاہتی ہے
اِک عشرے بعد.....
یہ پرزے چُر مُر کرنے لگ جاتے ہیں
کچھ رن آؤٹ ہو جاتے ہیں
کچھ On the ground رہ جاتے ہیں
Census بڑا Sensitive ایشو ہے
دوسرے دروازے پر پہنچتے
راستے عبور کرنا
Border جیسا ہے
اسی لیے سیکورٹی کے جنتر منتر
آزو بازو.....اہنی گہنے ٹانگے
Enumerator کے ساتھ
قدم بہ قدم چل رہے ہیں
اسپیئر پارٹس ہیں ہم عوام
آج سے ہماری گنتی شروع
کل خانہ شماری تھی
آج سے مردم شماری شروع ہے

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

ایوارڈ نامہ

شمیا عبدالقیوم

سچی کہانیاں ایوارڈز 2016ء کی اناؤنسمنٹ کے بعد جب اپنا نام ایوارڈ یافتہ لکھاریوں میں دیکھا تو دل کی حالت کچھ عجیب سی ہوگئی۔ کبھی ہوتا ہے ناں یوں بھی کہ بہت اچانک ہی آپ کو زبردست قسم کی خوش خبری سننے کو ملے اور خوش خبری بھی وہ کہ جس کی تمنا نے آپ کے دل کو بہت عرصہ سے بے چین کیا ہوا ہو تو یہی حال اپنا بھی ہوا دل دھڑک دھڑک کر بے قابو ہوا جارہا تھا۔ چند لمحے تو خوب غور کر کے پڑھا کہ کہیں غلطی سے تو نہیں چھپ گیا نام (اپنے بارے میں کافی کسر نفسی سے کام لیا کرتی ہوں۔ ہمیشہ جس برائی کی بہت ڈانٹ بھی سنا کرتی ہوں کہ کیوں خود کو اتنا پیچھے رکھتی ہو) خیر فوراً فون ادارے کو فون ملایا، محترم بھائی کاشی چوہان نے ہنستے ہنستے اور ڈانٹتے ڈانٹتے تصدیق کی اور وہی اسٹینڈرڈ جملے جو گھر والوں سے بھی سنا کرتی ہوں کہ آخر کیوں خود پر یقین نہیں۔ بہنا واقعی اتنا اچھا لکھتی ہو کہ قارئین کی پسند کی اور ایوارڈ کی حقدار ٹھہری ہو۔ بہرحال تصدیق کے بعد اپنے عزیز شوہر کو فون پر ایوارڈ یافتہ ہونے کے متعلق بتایا جس پر وہ بے حد اور بے انتہا خوش ہوئے ان کے بعد فرداً فرداً فیملی کو مطلع کیا اور تہنیت کے فون اور میسجز موصول کیے۔ اب انتظار تھا تقریب کے منعقد ہونے کا جو کہ لاہور میں ہونی تھی۔ بروز جمعرات مورخہ 26 جنوری اس دن کے انتظار میں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دن گن گن کر گزارنا شروع کیے۔ لاہور میں سردی اپنے جوبن پر تھی۔ سردی میرا پسندیدہ موسم بھی ہے سو دل بھی خوب باغ و بہار تھا مگر ارمانوں پر اوس گرنا شروع ہوئی۔ جمعرات کی صبح سے ہی موسم نے یکدم کروٹ لی اور کالے کالے بادل جمع ہونا شروع ہوگئے۔ آج کے دن شوہر صاحب نے آفس سے رخصت طلب کی ہوئی تھی۔ موسم نے تو تیور دکھائے ہی دکھائے ساتھ میڈ بھی غائب ہوگئی..... ''ہائے فیداب کیا ہو گا۔'' میں مارے فکرمندی کے بار باران کو ہولاتی۔

''ارے بیگم آندھی آئے یا تیز بارشوں کے جھکڑ! خاکسار نے بھی قسم کھائی ہے اپنی زوجہ کو منزل تک پہنچانے کی۔'' موسم کے ساتھ ساتھ فہدی شوخیاں بھی عروج پر تھیں میں انہیں سوائے گھورنے کے اور کچھ کرنے لائق نہ تھی لہٰذا گھر کے کام بھی سمیٹتی رہی اور تیاری بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ کاشی بھائی کی کالز بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ دو بجے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں کپڑے استری کر رہی تھی اصل پریشانی دونوں بچیوں کی تھی۔ میری بڑی بیٹی جو کہ ساڑھے تین سال کی ہے وہ دو دن سے فلو میں مبتلا تھی اور چھوٹی تو خیر اسی مہینے سال کی ہوئی ہے۔ بہرحال تیاری شروع کی۔ خوش قسمتی سے منزل مقصود میرے آشیانے سے بھی قریب تھی۔ ہم ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہیں اور قذافی اسٹیڈیم تک پہنچنے میں تقریباً 20 منٹ لگتے تھے۔ خیر 4 بجے ہم سب تیار ہو کر روانہ ہوئے۔ بھیگا بھیگا موسم اور سرد ہوائیں، واہ مزہ آگیا۔ بچیاں بھی موسم انجوائے کر رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھیں۔ میں نے بلیک شارٹ سلک کا سوٹ پہنا تھا جب کہ ساتھ گرم مفلر اسٹائل کا ہاف سوئیٹر تھا جب کہ شوہر نامدار بلیو جینز شرٹ اور بلیک کوٹ میں کافی سے زیادہ ہینڈسم اور چارمنگ لگ رہے تھے۔

''کیا بات ہے بہت گھور رہی ہو۔'' انہیں بھی میری بار بار ان پر اٹھتی نظروں کا احساس ہو گیا تھا۔

''بہت اچھے لگ رہے ہیں آپ، ماشاءاللہ!''

''اچھا!'' انہوں نے اچھا کافی لمبا کھینچا اور مسکرائے۔

''جی جناب!'' میں بھی مسکرادی اور دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے ایک بہترین رفیق حیات سے نوازا جو میری تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں میرے ساتھ ساتھ رہے ہمیشہ اور آج ایوارڈ کے لیے وہ مجھ سے زیادہ پرجوش اور خوش تھے۔ خیر ہم پنجابی کمپلیکس کے سامنے اترے تو سامنے سے کاشی بھائی نظر آئے۔ وہ بھی بلیک کوٹ میں خوب جچ رہے تھے۔ خوب گرم جوشی سے ملے۔ فہد بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم ان کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اندر کا ماحول کافی گرم اور خوشگوار تھا۔ مہمان ابھی آنا شروع ہو رہے تھے۔ کچھ چہرے جانے پہچانے اور باقیوں سے صفحات کے ذریعے کی پہچان تھی۔ کافی اچھا سیٹ اپ تھا۔ اسٹیج پر ایک طرف سائیڈ ٹیبل پر لائن سے رکھے گئے۔ ایوارڈز نگاہوں کو خوب جچ رہے تھے اور بچتے بھی کیوں ناں! آخر کسی ایک پر اپنا بھی جو نام تھا۔ کچھ ہی دیر میں تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ تمام سیٹیں رفتہ رفتہ لوگوں سے بھرتی جارہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھتے اور اپنائیت سے مسکراتے، ظاہر ہے سب کا تعلق ایک قبیلے سے جو جڑا تھا، قلم قبیلہ، تمام فیملی ممبرز..... وہاں رضوانہ کوثر آنٹی سے ملاقات ہوئی۔ کافی سویٹ اور پیاری سی جن سے مل کر قطعاً اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ میرے ساتھ نادیہ ملک بیٹھی تھیں۔ ان سے دوستی ہو گئی جو آج بھی قائم ہے۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد خوب صورت سی نعت نے سماں باندھ دیا۔ زندہ دلانِ لاہور میں منعقد ہونے والی تقریب اپنی تمام تر رعنائیوں سے شروع ہو چکی تھی۔ خاتونِ کمپیئر اور محترم کمپیئر بھی شام کو خوب صورت بنانے میں کسی سے ہرگز کم نہ تھے۔ منزہ سہام اپنی کسی نجی مصروفیت کی بناء پر غالباً نہیں آسکی تھیں لہٰذا سپاس نامہ بھی ان کی طرف سے پیارے کاشی بھائی نے پڑھا اور کیا خوب پڑھا کہ دل میں مزید تحریک بڑھی کہ اب قلم صفحات سے ہرگز ہرگز تعلق نہیں توڑنا۔ خوب صورت گانوں نے ایک سماں سا باندھ رکھا تھا۔ اب بالآخر باری آگئی تھی۔ ایوارڈز کی اناؤنسمنٹ کی تو دل میں اچھے جذبات کے ساتھ لکھاری اسٹیج پر آتے اور ہنستے مسکراتے ایوارڈز وصول کرتے۔ دھڑا دھڑ تصویریں اور ویڈیو بن رہی تھیں۔ کاشی بھائی کی صرف جھلک ہی دکھائی دیتی رہی۔ تمام تقریب کے دوران وہ یہاں بھی نہایت جانفشانی سے تقریب کو اور مکمل اور خوب صورت بنانے میں جتے ہوئے تھے۔ جس طرح ہر مہینے کے شمارے کو سجاتے سنوارتے ہیں اسی طرح وہ اس تقریب کو منفرد اور مکمل بنانے میں جتے ہوئے تھے۔ نام پکارے جاتے رہے اور مصنفین اپنا اعزاز وصول کرتے رہے۔ باہر موسم لمحہ بہ لمحہ گہرا ہو رہا تھا۔ میں بار بار فکرمندی سے کھڑکی بھی دیکھتی، چھوٹی بیٹی بہت ڈسٹرب ہونے لگی تھی کیونکہ میں جلدی جلدی میں اس کا دودھ رکھنا بھول گئی تھی۔ تقریب کا رنگ لمحہ بہ لمحہ کھلتا جارہا تھا۔ خوب صورت برجستہ جملے، گانے.....! تقریب کیا تھی گویا رنگ اور روشنی کی کہکشاں تھی۔ جہاں ہر ستارہ اپنی مثال آپ تھا۔ میں یہ سب دیکھ رہی تھی انجوائے کر رہی تھی کہ میرا نام اناؤنس کیا جانے لگا۔ خوشی کا لمحہ تھا جو آکر رک سا گیا۔ میں دھیمے دھیمے خود کو سنبھالتی اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اسٹیج پر پہنچ گئی۔ ایوارڈ ہاتھ میں لیا تو ابو بے تحاشا، بے حساب یاد آئے۔ مجھے یہاں تک پہنچانے میں میرے پیارے محترم والد عبدالقیوم مرحوم کا ہاتھ تھا اور رہے گا۔ میری کہانیوں کو سننا، تصحیح کرنا، ان کے عنوان تجویز کرنا یہ سب وہ ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایوارڈ ریسیو کیا اور دل ہی دل میں ادارے کا سہام مرزا کا منزہ سہام کا اور پیارے قارئین کا شکریہ ادا کیا۔ جیو پرل پبلی کیشنز! جیو منزہ سہام، جیو بھیا کاشی چوہان! ٹھنڈ چونکہ کافی بڑھ چکی تھی اور واپسی کا مرحلہ سر کرنا باقی تھا سو ہم کاشی بھائی سے الوداعیہ ملاقات کرتے لوٹ آئے۔ اس وعدے اور امید کے ساتھ کہ جلد ہی یہ تقریب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دوبارہ منائی جائے گی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لائف بوائے... محافظ بن کر دکھائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

اس روز مردم شماری والے آئے ہوئے تھے۔ ثمینہ کے بچوں کی تعداد سن کر ایک نے دیدے پھیلا کر کہا۔

''دس بچے.....!''

ثمینہ گود میں لٹکی ہوئی بچی کو سنبھال کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''ایسے دیدے پھیلا کر کیا کہہ رہے ہو؟ کیا نظر لگاؤ گے میرے بچوں کو؟''

''آپ کے شوہر اور کیا کرتے ہیں؟''

اس نے پھر گھور کر پوچھا۔

''اور کا مطلب.....؟ میرے میاں ایک آفس میں ہیڈ کلرک ہیں۔ سولہ ہزار ماہانہ کماتے ہیں۔''

''یہ فلیٹ اپنا ہے؟''

ثمینہ نے انکار میں سر ہلایا تو وہ حیرانی سے بولا۔

''یہاں فلیٹوں کے کرائے بہت زیادہ ہیں۔ آپ لوگ اتنی سی تنخواہ میں کیسے گزارا کرتے ہیں؟''

وہ بولی۔

''خدا میرے بیٹے سرمد کو سلامت رکھے۔ وہ ایک موٹر گیراج میں انچارج ہے۔ ماہانہ اٹھارہ بیس ہزار روپے کما لیتا ہے۔ پہلے ہم پسماندہ علاقے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ابھی پچھلے ماہ یہاں آئے ہیں۔''

ایسے وقت ایک لڑکی باہر آئی۔ اس شخص نے پوچھا۔

''یہ آپ کی بیٹی ہے؟''

اس نے پلٹ کر فیجہ کو دیکھا پھر باچھیں پھیلا کر کہا۔

''یہ..... یہ میری بہو ہے۔ میرے سرمد کی دلہن۔'' پھر وہ اپنی گود میں لٹکی ہوئی بچی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولی۔

''یہ لو..... اسے اندر لے جاؤ میں ابھی آتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوں۔''

اس شخص نے بچی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ آپ کی پوتی ہے؟''

ثمینہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''ارے بھیا..... تم یہاں کیا ہمارے رشتے بدلنے آئے ہو؟ ابھی بہو کو بیٹی بنا رہے تھے اور اب بیٹی کو پوتی کہہ رہے ہو۔ یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ سمجھے۔''

اس شخص کے دماغ کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''یہ تو کچھ زیادہ ہی چھوٹی ہے۔''

وہ لڑنے کے انداز میں بولی۔

''ہاں تو کیا کروں؟ کھاد ڈال کر وقت سے پہلے بڑا کر دوں؟ دیکھو میاں! جس کام سے آئے ہو وہ نمٹاؤ اور یہاں سے جاؤ۔ ورنہ میں اندر جا کر دروازہ بند کر لوں گی۔'' ثمینہ نے تنک کر کہا۔

اس شخص کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اکثر یہی ہوتا تھا۔ جو سنتا' حیران رہ جاتا تھا۔

آج کے دور میں جہاں دو بچوں کو پالنا اور انہیں صحیح تعلیم و تربیت دینا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ وہاں وہ دس بچوں کے ساتھ گزارا کر رہے تھے۔ کیسے کر رہے تھے' یہ تو وہی جانتے تھے۔

دراصل گزرتا ہوا وقت انسان کو اس کے حالات کے مطابق جینا سکھا ہی دیتا ہے۔ کبھی وہ ایک بچے کے ساتھ محدود آمدنی میں بھی گزارا کر لیتے تھے لیکن پھر جیسے جیسے بچوں کی تعداد بڑھتی گئی' ویسے ویسے آمدنی کو بڑھانے کے سلسلے میں بھی عزیز احمد کی کوششیں بڑھتی چلی گئیں۔

حالات اوور ہوتے ہیں تو بندہ اوور ٹائم کرنے لگتا ہے۔ عزیز نے بھی یہی کیا۔ اوور ٹائم کرنے سے آمدنی تو بڑھ گئی تھی لیکن اتنی نہیں بڑھی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے پاتا۔

بڑے بیٹے سرمد نے بمشکل آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں۔ اس کے بعد وہ موٹر مکینک کا کام سیکھنے لگا اور سیکھتے سیکھتے ایک ماہر کاریگر بن گیا۔

لڑکے کمانے کے قابل ہو جائیں تو مائیں ان کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ لہٰذا وہ فیجہ کو تعبیر بنا کر لے آئی۔ یہی سوچا جا رہا تھا کہ وہ بھی ساس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس گلشن کو مزید گل و گلزار بنائے گی مگر تین برس گزر جانے کے باوجود ایسے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے اور ثمینہ جیسی خاتون کے لیے یہ تشویش کی بات تھی۔

فیجہ کچن میں مصروف تھی۔ اپنی دو سالہ نند کے لیے فیڈر تیار کر رہی تھی۔ نند چاہے دو سال کی ہو یا بیس سال کی..... نند ہی ہوتی ہے اس نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

دودھ کے لیے ایسے ایسے بلک رہی تھی' جیسے بھاوج کو باتیں سنا رہی ہو۔ زبانِ بے زبانی سے کہہ رہی ہو۔

''ارے! جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ کیا ماں باپ نے فیڈر بنانا نہیں سکھایا ہے؟ رو رو کر میرے گلے میں خراشیں پڑ رہی ہیں۔ کیا بھوکا مارنے کا ارادہ ہے؟''

ادھر فیجہ اس کے مسلسل رونے کی وجہ سے گھبرا سی گئی تھی۔ جلدی جلدی ہاتھ چلانے کے باوجود دیر ہو رہی تھی۔ ثمینہ نے بیٹی کو بہلاتے ہوئے کہا۔

''بس چپ کر جا میری رانی! وہ دیکھ..... تیری بھابی دودھ گرم کر رہی ہے۔ ابھی لے کر آتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے..... بس چپ ہو جا۔''

کیسا عجیب تماشا تھا؟ وہ اس عمر میں پوتے پوتیاں بہلانے کے بجائے اپنی ننھی بیٹی کو بہلا رہی تھی اور فیجہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے بجائے نند کے لیے فیڈر بنا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بوتل کو ہلاتی ہوئی ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

''یہ دیکھو! دودھ آ گیا۔ بس اب تو چپ ہو جاؤ۔''

ساس نے بوتل لے کر بچی کے منہ سے لگائی۔ وہ لپک لپک کر پینے لگی۔ ثمینہ اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو تو رو رو کر پسینہ پسینہ ہوگئی ہے۔''

فیجہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میرے پسینے چھڑا دیتی ہے۔ ایسے بلکتی ہے جیسے کبھی دودھ ہی نہ ملا ہو۔''

باقی بچے گھر میں شور مچاتے پھر رہے تھے۔ وہ پانچ کمروں کا فلیٹ پلے گراؤنڈ بنا ہوا تھا۔ ایسے وقت ایک گیند آ کر ثمینہ کے شانے پر لگی۔ اس نے گھبرا کر دودھ پیتی بچی کو دیکھا پھر دوسرے بچوں کو ڈپٹتے ہوئے کہا۔

''ارے کم بختو! باہر جا کر کھیلو۔ یہاں کیا چوکے چھکے لگا رہے ہو؟ ابھی چھوٹی کے لگ جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جاؤ باہر.....''

ایک بیٹے نے منہ بنا کر کہا۔

''باہر کوئی کھیلنے نہیں دیتا۔ ویسے بھی اتنے پتلے پتلے سے راستے ہیں کہ ہمیں مزہ نہیں آتا۔ پہلے والا گھر اچھا تھا۔

یہ لمبی چوڑی گلی تھی۔ ہم ادھر سے اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔''

چھوٹی بہن کہا۔

''ہاں..... وہاں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہاں تو کوئی ہمیں شور بھی مچانے نہیں دیتا۔''

وہ بچے اپنے معصوم سی شکایتیں کرنے کے بعد گیند اُٹھا کر پھر سے کھیل میں مگن ہو گئے تو ثمینہ بولی۔

''کیا کریں؟ وہاں گلی بڑی تھی تو گھر چھوٹا تھا۔ یہاں گھر ذرا بڑا مل گیا ہے تو گلی نہیں ہے اور بچوں کو نیچے پلے گراؤنڈ میں بھیجتے ہوئے میرا تو دل ڈرتا ہے۔ خدانخواستہ کوئی ایک آدھ اِدھر اُدھر ہو گیا تو ان کے ابا میری جان کو آ جائیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد بچی نے دودھ ختم کر لیا۔ فیجہ نے اس کی طرف بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

''لائیں مجھے دے دیں..... میں اسے تھپک کر سلا دوں۔'' وہ اُسے اپنی گود میں لے کر شانے سے لگا کر تھپکنے لگی۔

گویا نند کے نخرے اٹھانے لگی۔

فیجہ چھوٹی نند کو سلانے ہی لگی تھی کہ تیرہ سالہ نند روبینہ سر کھجاتے ہوئے ثمینہ کے پاس آ گئی۔

''اماں! میرے سر میں خشکی نے پپڑیاں جما دی ہیں۔ پتا نہیں کیسے جائیں گی یہ۔''

''اے ہے! کمبخت! آدھا آدھا پاؤ تیل ہر دوسرے دن تیرے سر میں ڈالتی ہوں۔ اب کیا اپنا خون تیرے سر میں ڈالوں۔'' یعنی ثمینہ کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہ بچا تھا۔

''اماں میں بہت تکلیف میں ہوں۔ نہ بال بڑھتے ہیں اور نہ ہی ان کا روکھا پن جاتا ہے۔ تیل پتا نہیں کہاں غائب ہو جاتا ہے۔''

''اماں! مردم شماری والوں سے کہنا کوئی ایسا نسخہ بھی دے جائیں جس سے بالوں کی ساری بیماریاں دور ہو جائیں۔'' روبینہ نے جو روبینہ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دو سال بڑی تھی اس بحث میں حصہ لینا فرض سمجھا اور بھاوج کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں! باوا کا قرضہ دینا ہے مردم شماری والوں نے جو تمہارے علاج معالجے کرتے پھریں گے۔ چل آج اپنی بھابی سے تیل میں دہی ڈال کر بالوں میں لگوا لیجو۔ انشاء اللہ خشکی ختم ہوجائے گی اور بال بھی چمک دار ہوجائیں گے۔'' شمینہ نے جیسے بات ہی ختم کردی۔

''اماں! کچھ نہیں ہوتا تیل دہی سے بھی۔ مجھے تو تیل دہی بالوں میں لگا کر متلی ہونے لگتی ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ہم ابھی تک تیل اور دہی کا پیالہ لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' روبینہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ارے بابا! بس اب یہ بالوں کا رونا بند کرو۔ میں اپنی بہن کے بالوں کا علاج خود ڈھونڈوں گی۔ بس اب کوئی کچھ نہ بولے۔ ٹھیک ہے نا۔'' فیجہ نے قصہ مکایا۔

''ہاں! تُو تو جیسے کسی سنیاسی باوا کی بیٹی ہے نا۔'' شمینہ کو ناگوار لگا تو بولنا فرض سمجھا تھا۔

''ہاں اماں! یہی سمجھ لو' مگر پلیز اب بالوں کے معاملے میں کوئی بحث نہ کرے' ڈن۔''

''ڈن!'' دونوں نندیں ایک ساتھ بولیں اور شمینہ بیٹھی بیٹھی سوتی بن گئی۔

☆.....☆.....☆

''یہ لو گڑیا! تم آج سے اِس شیمپو سے بال دھونا۔ پھر دیکھنا جادو۔''

''بھابی آپ نے پہلے کیوں مجھے نیا لائف بوائے شیمپو نہیں استعمال کرنے کو دیا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ بھیا آپ کو امپورٹڈ شیمپو لا کر دیتے ہیں سب سے چھپا کے..... جبھی تو آپ کے بال اے ون ہیں۔''

''ارے بابا! میں تو اماں کے ڈر کے مارے سب سے چھپا کر اپنے لائف بوائے شیمپو سے سر دھوتی تھی۔ ذرا میرے بالوں سے لائف بوائے شیمپو کے استعمال کے بعد کوئی بھی بیماری ثابت کر کے دکھا دے تو مانوں۔'' فیجہ نے نند کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا اور پھر روبینہ شیمپو لے کر سر دھونے چلی گئی۔ فیجہ سچے دل سے روبینہ کے بالوں کے مسائل کے خاتمے کے لیے دعا مانگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہی بچوں کی ریں ریں' شمینہ کی بے تکان بولنے والی عادت اور وہی صبح و شام کا فضیحتہ..... کچھ نہ بدلا مگر بدلا تو تھا کچھ..... اور وہ بدلاؤ تھا شمینہ کی لڑکیوں کے خوبصورت ہوتے بال..... فیجہ نے روبینہ کو نیا لائف بوائے شیمپو کیا استعمال کرایا کہ اس کی دیکھا دیکھی سب ہی نے لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کردیا۔ لائف بوائے نے اپنے نئے فارمولے' ملک پروٹین اور باداموں کی طاقت لیے کام دکھایا اور بال ہو گئے سب کے 30 گنا زیادہ مضبوط' چمکدار اور توانا.....

'ارے ارے..... آپ کو اگر یقین نہ آئے تو ذرا استعمال تو کر کے دیکھیے۔ ہمیں یقین ہے کہ نیا لائف بوائے شیمپو آپ کے بالوں پر بھی فوری اپنا اثر دکھا کر..... آپ کے بالوں کو بھی 30 گنا' مضبوط اور چمکدار بنا کر اپنے ملک پروٹین فارمولے سے بالوں کو نئی زندگی دے گا اور بال ہوں گے ہر تکلیف سے دور' رہنے پر مجبور۔

واقعی بالوں کا سچا محافظ صرف نیا لائف بوائے شیمپو ہی ہے بس استعمال شرط ہے۔

☆☆.....☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مختصر نمبر کی نکتہ پرداز، ستم ایجاد 9 قلم کاروں کی 3'3 کہانیاں

مختصر نمبر کی سوغاتیں

امنگوں، حوصلوں اور آہوں میں ڈوبی شاہ کار داستانیں

ہیر

اقبال بانو

اس ہیر کی داستان، جسے خوب صورت ہونے کی سزا زندگی ہی میں مل گئی تھی

شیما سیانی کیا ہوئی کہ گاؤں بھر میں اس کے چرچے ہونے لگے، ہر ماں کو وہی لائق بچی نظر آتی اور وہ اپنی بیٹیوں کو اس کے جیسا بننے کی مثالیں دیتیں۔ گاؤں کے لڑکے اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں پنگھٹ کے قریب شریفہ کے درخت تلے چارپائی بچھا کر تاش کھیلتے رہتے، تاش کھیلنا تو بہانہ تھا وقت گزارنے کا، اگر ایسا نہ ہوتا تو شیما جب پانی بھر کر چلی جاتی تو چند لمحے بعد شرینہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

تلے کوئی منجھی نظر نہ آتی۔

شیما جونہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کنویں پر پانی بھرنے آتی لڑکے اپنی سرمہ بھری مست نظروں سے اس کے سراپے کی بلائیں لینے لگتے۔ بے اختیار ایک ہاتھ تاؤ میں چڑھی ہوئی مونچھوں تک پہنچ جاتا اور دوسرے ہاتھ سے بال سنوارنے لگتے جیسے ان کی کج دھج شیما کو لوٹ ہی تو لیں۔ مگر وہ کنویں پر آتی ہی دور کی ہوا بن کر تھی۔ اس کی ہنسی کی جھنکار گاؤں کے گبرو جوانوں کے دلوں کے سمندر میں ہلچل مچا جاتی، مگر وہ ڈھیر سمندروں کی طغیانی سے بے پروا تھی۔

اپنے آپ میں مست۔ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی۔ بس پانی بھر کر ایک گھڑا سر پر رکھتی اور دوسرا اپنے اکہرے بدن پر بوجھ سے وہ لچک کر رہ جاتی اور گبروؤں کا دل چاہتا اس سے کہیں۔

''تم تو خود پھول ہو اتنا بوجھ نہ اٹھاؤ ہم کس لیے ہیں؟''

شیما کی لچک ہر دل کو ڈھا دیتی مگر ابھی کوئی دل کا درد لبوں پر نہ لا سکا۔ شیما کے رعب حسن سے ان کی زبان گنگ ہو جاتی اور وہ لہراتی ہوئی خرمن دل پر بجلیاں گراتی ہوئی چلی جاتی۔

شیما بچپن سے بہت پیاری سی تھی بالکل گلاب کے سرخ پھول کی مانند جسے دیکھ کر بے اختیار اس کے سرخ سرخ پھولے ہوئے گال چوم لینے کو جی چاہتا۔ عورتیں اس کے قدرتی سرخ لبوں کو دوپٹے سے رگڑ کر دیکھتیں کہ کہیں اس نے سرخی تو نہیں لگائی ہوئی۔ سب اسے ہیر کہتے تھے حالانکہ اس کی ماں جنت بی بی اور بابا عمر دین معمولی شکل صورت کے تھے۔ پتہ نہیں قدرت نے گدڑی میں لعل کیوں دے دیا تھا۔ عمر دین، چودھری رب نواز کی زمینوں پر سارا دن کام کرتا اور شام ڈھلے ہی گھر لوٹتا تھا۔

شیما کو چھوٹی سی عمر میں ہی بڑی ذمہ داری سنبھالنی پڑی تھیں۔ شیما صرف سات برس کی تھی تب جنت بی بی نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا اور پھر خود چارپائی سے لگ گئی تھی۔ ان کی ٹانگوں پر فالج گر گیا تھا۔ شیما نے آہستہ آہستہ پورا گھر کچھ اس طرح سنبھالا کہ عورتیں عش عش کر اٹھیں۔

بالی عمریا نے اس کے درحسن پر دستک دی تو پٹ کھلتے ہی چلے گئے۔ قدرت نے اسے دل بھی دل کھول کر دیا۔ بچپن کے نقوش بڑا ہونے پر اپنا اثر دکھانے لگے۔ حسن اتنا مکمل اور دلکش ہو تو بھلا کس کی نظر نہیں پڑے گی اور بھلا گاؤں کے لڑکوں کی نیندیں کیوں نہ اڑتیں۔ ہر ایک کے خوابوں میں وہ در آئی تھی اور دماغ کے گوشے گوشے میں اس کی آہٹیں گونجتیں، دل میں چپار سو وہ کٹڈ کڑے لگائے پھرتی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اب تو اس کی سکھیاں مزید اس کے نزدیک ہونے لگیں۔ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اسے بھرجائی بنالیں۔ بھلا بھائیوں کی بیقراریاں بہنوں سے کیسے چھپی رہتیں۔

بھائی تو شیما پر کیوپڈ کے تیر برسا برسا کر تھک گئے تھے مگر نشانے پر کوئی بھی نہ لگا تھا اب تو شیما کی خاطر اچھی خاصی سہیلیاں بھی ایک دوسرے کی دشمن نظر آتیں۔

سردیوں کے دن تھے وہ سب کپاس چن کر صاف کرنے کے لیے چودھری رب نواز کے ڈیرے کے احاطے میں اور عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی، تب ہی شادو نے ایک دم کہا۔

''رانو میرا ویر کل اپنی ہونے والی ووہٹی کے لیے بہت ہی پیارا ستاروں والا دوپٹہ لایا ہے۔ اس طرح لگتا ہے جیسے تاروں بھرا آسمان ہاتھ میں آگیا ہو۔''

تب لالی نے جلدی سے کہا۔

''میرا لالہ رمضان کہتا ہے کہ وہ اپنی ووہٹی کے لیے سونے کا تاج بنوائے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''تم نے دیکھا ہے ہمارا مکان بن رہا ہے۔ میرا لالہ مراد پکا کمرا بنوا رہا ہے اپنا تاکہ شادی ہو تو اس کی دلہن پکے کمرے میں آئے۔''

وہ فخر سے بولی۔

اصل میں گاؤں میں سب لوگوں کے کچے مٹی گارے کے مکان تھے۔ سرخ اینٹوں کی پکی حویلی صرف چودھری ہی کی تھی۔

''اری شیما تو بھی تو کچھ بول۔''

رانو نے اسے ٹہوکا دیا۔

''کیا بولوں؟''

پھٹی صاف کرتی شیما نے دھیمے سے کہا۔

''پھر بھی۔''

لالی نے کہا۔

''میرا تو کوئی ویر ہی نہیں ہے جو کہ مجھے بتائے کہ وہ ستاروں والا دوپٹہ لایا ہے یا وہ اپنی دوہٹی کے لئے تاج بنوائے گا یا پکا کمرا۔''

''اچھا یہ بتا سب سے اچھا خیال کس کے بھائی کا ہے؟''

سونے کا تاج بنوانے والے بھائی رمضان کی بہن لالی نے پوچھا۔

''کسی کے بھائی کا بھی نہیں۔''

شیما نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

تینوں ایک ساتھ اچھل کر بولیں۔

''میری مانو تو عورت کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہوتی ہے مرد سے اور وہ ہوتا ہے مرد کے دل میں چھپا ہوا مقدس پیار، وہ مل جائے تو عورت کو خدائی مل جاتی ہے۔''

وہ تینوں شیما کے جواب پر شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

یوں بات آئی گئی ہو گئی۔

وقت چھا آگے اور بڑھا۔

اب شیما کے گھر بھی رشتے آنے لگے۔ کئی پتھر اس بیری پر پڑے مگر نشانے پر کوئی نہ بیٹھ سکا کیونکہ شیما کی ماں نے جہیز کے نام پر ایک چندی تک نہ جوڑی تھی۔

خوبصورتی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔

اور یوں بھی عورت کا حسن شباب تو چڑھتے چاند کی طرح چڑھتا ہے اور فوراً ہی ڈھلنے لگتا ہے۔ ویسے بھی غریب لوگوں کو تو یہی آسرا ہوتا ہے کہ بیٹیوں کو جہیز دے کر گھر خالی کریں گے تو بہوئیں گھر بھر دیں گی مگر شیما کو بہو بنا کر تو ایسا آسرا تھا ہی نہیں کہ گھر بھر جاتا۔

کوئی یہ نہیں سوچتا تھا کہ جنت بی بی مفلوج تھیں۔ وہ تو خود اٹھنے بیٹھنے سے محتاج تھیں پھر بھلا بیٹی کے لئے کیا کرتیں۔

مراد اپنی ماں کرم خاتون سے الجھ پڑا۔

''آخر کیا ضرورت ہے واج جہیز کی۔''

''پتر تجھے ضرورت نہ ہو مگر اس گھر کو ضرورت ہے۔ رانو بیاہ کر چلی جائے گی تو یہ گھر تقریباً خالی ہو جائے گا۔''

''میں بھر دوں گا۔''

''ہونہہ اب تک تو بھر نہ سکا۔''

کرم خاتون نے طنزیہ کہا۔

''سارا دن شیما کی صورت سے آنکھیں سینکنے سے فرصت ملے تو کچھ کرے۔''

مراد تنتناتا ہوا پنگھٹ پر چلا گیا کیونکہ شیما کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔

ہر جوان بیٹے کی ماں کو شیما کی خوبصورتی سے خدا واسطے کا بیر تھا کیونکہ ان کے گبرو پتر جی جان سے اس پر فدا تھے۔

پھر شادو کے ویر رحیم نے رانو سے شادی کر لی۔

وہ بڑی چاہ سے شیما کے لئے جو ستاروں بھرا دوپٹہ لایا تھا اس نے رانو کو اوڑھا کر کہا۔

''یہ تو میں تیرے لیے لایا تھا۔ کتنی سوہنی لگ رہی ہے تو۔''

مراد نے گاؤں ہی کی ایک سانولی سی لڑکی زبیدہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کو اپنالیا اور رمضان احمد پور سے اپنی خالہ زاد حیات بی بی کو بیاہ لایا۔

اس طرح شیما کے سارے امیدوار ایک ایک کر کے اپنی بیویوں کے ہو گئے۔ مگر ان کے دل بیوی کی قربت میں بھی شیما کے لیے دھڑکتے اور ہمک ہمک کر کہتے۔

''کاش اس وقت میرے دل کی دھڑکنوں سے شیما کے دل کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوتیں۔''

مگر دل کے ہمکنے سے کیا ہوتا ہے۔

شیما تو اب تک کسی کی نہ ہو پائی تھی۔ وہ تو اب تک اپنی مفلوج ماں اور بوڑھے باپ کی خدمتوں پر معمور تھی جبکہ اس کی ساتھی لڑکیاں بچوں کی مائیں بھی بن گئی تھیں۔

جہاں چار عورتیں اکٹھا ہوئیں موضوع سخن شیما کی ذات ہوتی۔

''خدا ایسے حسن سے بخشے جو گھر بھی نہ بسانے دے۔''

دوسری کہتی۔

''کیا برا نصیب ہے شیما کا، نہ بیوی جیسا رتبہ پا سکی اور نہ ہی ماں والی جنت، بدنصیبی ہے بدنصیبی''

یہ سب باتیں شیما تک پہنچتیں اور اس کے خمیدہ لب مسکرا اٹھتے۔ اب تو اس کی سکھیاں بھی اسے طعنے دینے لگی تھیں۔

اور پھر ایک روز شیما کی خالہ رحمت بمع اپنے شوہر بچوں کے مستقل ان کے گاؤں آ گئی۔ عمر دین نے شیما کے خالو اللہ وسایا کو بھی چودھری رب نواز کی زمینوں کی کاشت پر لگوا دیا۔ رحمت کے آنے سے شیما بہت خوش تھی۔ اب رحمت بھی خاصا کام نمٹا لیتی تھی۔

پھر ایک روز شیما کا ماموں شیما کو آ کر لے گیا کیونکہ اس کی نانی بہت بیمار تھی اور شیما کو بلوایا تھا۔ شیما چلی گئی رتن پور۔ اور پھر صرف دو ماہ بعد ہی پورے گاؤں کو پتہ چلا کہ شیما کے نصیب کا جوڑ رتن پور میں تھا۔

جنت بی بی کو نیل گاڑی میں ڈال کر رتن پور لے جایا گیا کیونکہ بیٹی کی شادی میں انہوں نے بھی تو شرکت کرنا تھی۔

اور جب جنت بی بی اور عمر دین واپس گاؤں آئے تو بہت خوش تھے۔ ان کے سر سے شیما کا بوجھ اتر گیا تھا۔

لڑکیاں بالیاں جنت کے گرد جمع تھیں۔

''ہائے ماسی کیسا ہے شیما کا بندہ؟''

''کیا کرتا ہے؟''

''رتن پور کا زمیندار ہے، پورے اسی ۸۰ مربعے ہیں اس کے۔'' جنت بی بی ہر ایک کو فخر سے بتاتیں۔

''وہ تھی ہی کسی بڑے گھر کے قابل، یہ ٹٹ پونجیے اس کی کیا عزت کرتے۔''

رحمت نے منہ بنا کر کہا۔

شیما کے پرانے امیدواروں کے دلوں پرائی سی لگی۔

کوئی پھانس سی کلیجے میں ٹھک گئی۔

مراد نے تو اپنے دل کے درد کو چھپانے کے لیے سینے پر لیٹے اپنے تین سالہ بیٹے کو اس زور سے بھینچا کہ وہ چیخ پڑا۔

پورے ڈیڑھ برس بعد شیما اپنے چند ماہ کے بیٹے کے ساتھ گاؤں آئی۔ اس کا میاں تو نہ آ سکا تھا ڈرائیور کے ساتھ بیوی بچے کو بھیج دیا۔

سونے سے پیلی تھی شیما، پہلے سے بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ ماں بن کر تو اس کے چہرے پر عجب سا نور آ گیا تھا۔

بچے کو کھلانے کے لئے دو خادمائیں ساتھ آئی تھیں تاکہ شیما کو بچہ پریشان نہ کرے۔

کیا شان تھی شیما کی۔

اپنی سہیلیوں سے وہ اسی خلوص و محبت سے ملی تھی مگر وہ جھجک رہی تھیں آخر وہ اتنے بڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زمیندار کی بیوی تھی۔

''کیسا ہے تیرا گھر والا؟''

رانو نے پوچھ ہی لیا۔

''بہت اچھا...''

شیما کے چہرے پر اس کے ذکر پر سرخی آ گئی۔

''اسے میری ضرورت تھی نہ کہ جہیز کی اور ویسے بھی رانو جہیز کی ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے گھر کچھ نہ ہو۔ بھوکے ننگے ہوں، کبھی کچھ نہ دیکھا ہو اور.. فضل احمد تو پشت ہا پشت کا رئیس ہے اسے کیا ضرورت تھی ان چیزوں کی۔''

شیما نے نہایت فخر سے کہا۔

''تو بہت خوش ہے؟''

شادو نے پوچھا۔

''خوش کیوں نہ ہوں مجھے فضل احمد کی بھرپور محبت ملی ہے۔ میرے گرد یوں چکر کاٹتا ہے جیسے چاند چکور کے گرد.... میں سوئی ہوئی ہوں تو کبھی بھی مجھے نہیں جگاتا.... جس عورت کو مرد کی محبت کے ساتھ ساتھ دنیاوی آسائشیں بھی مل جائیں وہ بہت خوش قسمت ہوتی ہے میری طرح۔''

شیما نے کہا اور کوئی یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے کالے کالے نینوں میں شبنم سی جم رہی ہے۔

ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ملک فضل احمد شیما کو لینے آ گیا۔ اس کی جیپ گاؤں کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں نہ جا سکتی تھی اس لیے اس نے برگد تلے جیپ رکوالی۔

سب عورتیں اپنے گاؤں کی ہیر شیما کے شوہر کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکل آئیں اور جس نے بھی ملک فضل احمد کو دیکھا منہ میں انگلیاں داب لیں۔

چند لمحے بعد ہی رانو۔ جیراں سے کہہ رہی تھی۔

''تم نے شیما کا گھر والا دیکھا....؟''

''ہاں دیکھا ہے، قسمت ہے بے چاری کی۔''

مراد جو کنگھا کر رہا تھا اس نے چونک کر بہن کو دیکھا تو اس کی بیوی زبیدہ بولی۔

''ایسا بھی کیا مرد، نہ دیکھنے کو جی کرے نہ ہی دل ٹھہرے۔''

سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور مراد سوچ رہا تھا۔

''کم بخت اسی بھتنو کے لئے اپنی جوانی کے کانچ کو سنبھال سنبھال کر رکھتی تھی جیسے کہ اسے کوئی غریب نہیں تخت ہزارے کا رانجھا بیاہ کر لے جائے گا۔''

اور جب شام کا ملگجا اندھیرا پھیل رہا تھا تو شیما فضل احمد کے ساتھ رتن پور جا رہی تھی۔ فضل احمد نے بچے کو گود میں لیا ہوا تھا اور اس کی نظریں شیما کے خوبصورت چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

اس کی سہیلیاں اسے جیپ تک چھوڑنے گئیں، کسی نے بھی نہ دیکھا کہ شیما کے مسکراتے ہوئے لبوں نے کتنی چیخوں کو دبا رکھا ہے۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے بوجھل ہو رہی تھیں، وہ اچک کر ملک صاحب کے ساتھ بیٹھ گئی اور جیپ ایک جھٹکے سے چل پڑی۔

رانو، شادو اور جیراں کی آنکھیں دھندلا گئیں وہ دھندلائی ہوئی نظروں سے اس دھول کو دیکھ رہی تھیں جو جیپ کے پیچھے اڑ رہی تھی اور اس جیپ میں ان کے گاؤں کی ہیر تھی جسے تخت ہزارے کے وارث کی خاطر چوتھی بیوی بنایا تھا اور سونے کا انبار اور اطلس کے کپڑوں میں چھپ کر اس کا جوان اور امنگوں سے بھرپور دل اپنی آرزوؤں کو تو نہ بھولا تھا اگر ایسا ہوتا تو بات بے بات شیما کی آنکھیں کیوں بھر آتیں، وہ سوچتی تھی۔

''یا میرے رب! تو نے مجھے میری خوبصورتی کی اتنی بڑی سزا کیوں دی؟''

اور اپنے اس سوال کا جواب اس کے پاس کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہمارے عہد کی صاحب بیاں داستان کارہ کا دوسرا شاہ کار

لڑکیاں

اقبال بانو

لڑکیاں صرف ایک ہی خمیر سے بنی ہوتی ہیں، فرق صرف گارے کا ہوتا ہے

''اف! یہ لڑکیاں.... مجبور و بے بس لڑکیاں۔''

خاندان کی عزت و لاج یہی لڑکیاں۔

رسموں، ریتوں کو نبھائیں تو یہی لڑکیاں۔

والدین کا سر جھکائیں تو لڑکیاں۔

رسوائیوں کا موجب بنیں تو یہی لڑکیاں۔

آنگن کی چڑیاں تو لڑکیاں۔

گھروں کے گرتے ستون سنبھالنے والی بھی لڑکیاں،

عزتوں پر قربان ہوں تو لڑکیاں۔''

''مجھے بتائیں آخر یہ کیوں.... آپا کیا سب کچھ لڑکیوں کی ذمہ داری ہے؟'' زبیدہ نے حمیدہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''یہ تو برسوں سے روایت چلی آرہی ہے کہ لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔'' حمیدہ کے لب کپکپائے۔

''میں غلط روایات کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہتی۔ میں بہت مختلف ہوں اور لڑکیوں سے۔ میں مجبور نہیں ہوں۔ آپ بابا جان سے کہہ دیں۔'' زبیدہ نے ترشی سے کہا۔

''تم... تم ایسا سوچو بھی مت، وہی ہوگا جو بابا چاہیں گے۔''

''تو پھر بابا جان سے بھی کہہ دیں کہ وہ بھی ایسا نہ سوچیں اگر اس میٹرک پاس سے میری شادی کرنا تھی تو مجھے تعلیم کیوں دلوائی۔ مجھے اتنی آگہی کیوں دی؟'' زبیدہ تیزی سے بولی۔ ''وقت کا تقاضہ یہی ہے۔'' حمیدہ نے ہولے سے کہا۔

''تو میرا انکار بھی وقت کا تقاضہ ہے آپا۔ آپ کو تو علم ہے کہ آگہی کے دکھ بہت برے ہوتے ہیں۔ پلیز آپ بابا جان سے کہہ دیں۔'' زبیدہ کا لہجہ نہایت ملتجیانہ تھا۔

''نا... نا۔'' حمیدہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''تو پھر میں خود انکار کردوں گی۔'' وہ پھر گرم ہوئی۔

''فلموں کی ہیروئن مت بنو زبیدہ! مجھے دیکھو اور منہ سے بھاپ بھی مت نکالو۔'' حمیدہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے۔'' زبیدہ نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے تو حمیدہ زور سے ہنس دی۔ ایسی ہنسی جس میں کئی آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ زبیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم دونوں لڑکیاں ہیں، مجبور و بے بس۔ چپ چاپ اپنی قسمت کے فیصلے سن کر گردن جھکا لیتی ہیں۔ کوئی فرق نہیں تم میں اور مجھ میں اور اس ملک کی ہزاروں لڑکیوں میں۔ ہم گونگی، بہری اور اندھی ہیں۔'' حمیدہ کی آنکھوں کی اداسی گہری ہوگئی۔

''نہیں.... نہیں۔'' زبیدہ چیخی۔

''ہاں زبیدہ ہم گونگی ہیں۔ اپنی قسمتوں کے غلط فیصلوں پر بھی احتجاج نہیں کرسکتیں۔ ہم بہری ہیں سب کچھ سننے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باوجود بھی یہی محسوس ہونے دیتی ہیں کہ کچھ نہیں سنا اور کنواں دیکھنے کے باوجود بھی جب ہمارے بزرگ اس کنویں میں دھکیلتے ہیں تو ہم آرام سے اس کنویں میں اتر جاتی ہیں۔ سرخ جوڑا پہن کر سونے سے جسم کو پیلا کر کے... کیونکہ....''

''اندھے لوگوں کو کچھ بھی تو نظر نہیں آتا.... اور ہم اندھی نہ ہوتے ہوئے بھی اندھی بن جاتی ہیں، یہ ہماری روایت ہے۔'' یہ برسوں کے اصول ہیں جن کو کوئی بھی نہیں توڑ سکتا۔'' حمیدہ نے سمجھایا۔

''میں توڑ دوں گی ان برسوں پرانی روایات کو، ان کھوکھلے اصولوں کو۔'' زبیدہ کا لہجہ چٹان کی طرح سخت تھا۔''زبیدہ...! خدا کے لیے ...!'' حمیدہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''آپا.... آپا.... آخر ہم کب تک...؟'' زبیدہ اس کے ہاتھ تھام کر روہانسی ہوگئی۔

''جب تک ہماری ماؤں کا دودھ ہماری شریانوں میں سرخ خون بن کر دوڑتا رہے گا، جب تک ہمارے والدین کا ہم پر مان رہے گا۔ کیا تم والدین کو اتنا بھی حق نہیں دینا چاہتیں کہ وہ اپنی محبتوں شفقتوں کے بدلے میں تم سے نہایت چھوٹی سے بات منوالیں۔'' حمیدہ نے کہا۔'' آپا...! یہ چھوٹی سی بات ہے....؟'' زبیدہ چمک کر بولی۔

''ہاں میرے نزدیک تو یہ بہت چھوٹی بات ہے۔ ان محبتوں کے مقابلے میں جو ماں باپ بیٹیوں پر پھولوں کی طرح نچھاور کرتے ہیں، ہر بات، ہر خواہش پوری کرتے ہیں تم خود سوچو کیا بابا جان نے ہماری ہر ضد پوری نہیں کی، ہمیں اعلیٰ تعلیم سے نہیں نوازا، ہمارے خاندان کی کسی لڑکی نے اسکول کے بعد کالج کی شکل نہیں دیکھی مگر بابا جان نے ہم تینوں بہنوں کو یونیورسٹی میں تعلیم کی اجازت دی۔ تم ان باتوں.... احسانوں کا موازنہ بابا جان کی چھوٹی سی خواہش سے کرو تو خود ہی شرمندہ ہو جاؤ گی۔'' حمیدہ نے کہا۔'' آپا.... بابا جان میری کوئی بات نہ مانتے مگر میرے مستقبل کے فیصلے کی ڈور میرے ہاتھ میں تھما دیتے۔'' زبیدہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے نہایت دکھ سے کہا۔

''اولاد ہمیشہ سے ناشکری رہی ہے۔'' حمیدہ کے لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھنچ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"یہ ناشکری نہیں ہے۔ یہ میرا حق ہے جو میں ان سے مانگنا چاہ رہی ہوں۔"

"تم کوئی انوکھی نہیں ہو مجھے اور زاہدہ کو دیکھو۔" حمیدہ کو بھی اس کے مسلسل انکار پر غصہ آ گیا۔ "سچ سچ بتائیں چودھرانی بن کر آپ کے اندر کی لڑکی زندہ ہے کیا۔ کیا ان بھاری زیورات نے آپ کے دل کو بھی سونے کا بنا دیا ہے جو کبھی نہیں تڑپتا مچلتا۔ کیا آپ کو وہ نیلی آنکھوں والا آفتاب حیات کبھی یاد نہیں آتا؟"

"ز.....بید.....ہ!" حمیدہ حیران و ششدر رہ گئی۔

"آپ سمجھتی ہیں مجھے کچھ علم نہیں..... آج وہی آفتاب حیات یونیورسٹی کا ہر دل عزیز پروفیسر ہے جس نے اب تک شادی نہیں کی، وہ آپ جیسی روایت پرست لڑکی کو چاہنے کا جرم کر بیٹھا تھا اور اسے اس جرم کی پاداش میں کیا ملا۔ تمام عمر کی کسک، خلش..... کیا وہی کسک آپ کے دل میں نہیں ہے جو اس نیلی آنکھوں والے کی آنکھوں کے نیلے پانیوں کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔" زبیدہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں الجھائے کہے جا رہی تھی۔

"بس کرو زبیدہ!" حمیدہ تڑپ کر رہ گئی۔

"کیا ان بھاری زیورات کی چھما چھم نے آپ کی آنکھوں کو چندھیا دیا ہے؟" وہ تو تیر چلاتی ہی گئی۔

"کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے؟" حمیدہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ "نہیں۔" زبیدہ کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"پھر انکار کی وجہ؟" حمیدہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "میں نے سوچا ہوا ہے کہ میری زندگی کا ساتھی وہ ہو گا جو مجھ سے زیادہ تو نہیں میرے جتنا ضرور تعلیم یافتہ ہو۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی ہو۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" حمیدہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "یہ زندگی کی حقیقت ہے جس سے آپ نظریں چرا رہی ہیں۔ بس آپ بابا جان سے کہہ دیں کہ میں سکندر سے شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گی۔" زبیدہ نے حتمی لہجہ میں کہا۔

"تم اس کی ٹھیکرے کی مانگ ہو۔" حمیدہ نے یاد دلانا چاہا۔ "میں پرانی باتوں کو نہیں مانتی۔" زبیدہ نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"زبیدہ تم تو پگلی ہو۔ بیٹیاں تو جب پیدا ہوتی ہیں تب ہی ان کی زندگیوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور تمہارے نام کے ساتھ اگر لوح محفوظ میں سکندر کا نام لکھا ہوا ہے تو اسے کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔" حمیدہ نے سمجھانا چاہا۔

"ہونہہ!" زبیدہ نے غصہ سے ہنکارا بھرا اور کمرے سے نکل گئی۔

حمیدہ ہلتے ہوئے پردے کو حسرت سے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی باتوں کو اندرونی طور پر تو حمیدہ نے تسلیم کر لیا تھا کبھی بالکل ایسے ہی اس کے اپنے خیالات تھے ایسے ہی باغیانہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو تہس نہس کر دے اور اس نیلی آنکھوں والے آفتاب حیات سے جو وعدے کیے تھے انہیں پورا کر دے مگر جب بابا جان نے اسے امی جی کے ذریعے کہلوایا کہ اب وہ شہر نہ جائے کیونکہ صرف ایک ہفتہ بعد احمد سے اس کی شادی قرار ہونا پائی ہے تو وہ گم سم ہو کر رہ گئی۔ بس گونگی اندھی اور بہری بن گئی اور پھر سرخ جوڑے میں ملبوس وہ احمد کی ہو گئی۔ احمد جو صرف مڈل پاس تھا، مکمل جاٹ اور ہر وہ عیب اس میں موجود تھا جو دولت والوں کا شیوہ ہوتے ہیں۔ دولت ایک ایسی چادر ہے جس سے ہر عیب چھپ جاتا ہے۔ حمیدہ نے خود کو روایات پر قربان کر دیا۔

پھر یہی کہانی زاہدہ کے ساتھ بھی دہرائی گئی۔ طالب علی بھی بہت بڑا زمیندار تھا، وہ پانچویں کلاس سے ایسا بھاگا کہ پھر اسکول ہی نہ گیا۔ بس زمینیں بہت تھیں اور دولت کی بہتات تھی، زاہدہ بھی سونے کے پنجرے میں قید ہو گئی۔ اور اب زبیدہ کی باری تھی۔

مگر وہ تو بہت تیز نکلی۔ اس نے تو حمیدہ کے سامنے چیخ چلا کر اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا مگر وہ بھی تو تھیں جنہوں نے منہ سے بات تک نہ نکالی تھی اور خاموش رہی تھیں۔ ملک رحیم بہت بڑے زمیندار تھے ان کی کئی اراضی زمین تھی۔ تین بیٹیاں زاہدہ، حمیدہ اور زبیدہ تھیں، دو بیٹے زاہد اور ظہیر تھے جو کہ بیٹیوں سے چھوٹے تھے۔ ملک رحیم نے اپنی تینوں بیٹیوں کو شہر میں پڑھایا۔ وہ زیادہ تر بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹلوں میں رہیں۔ انہوں نے بیٹیوں کو ہر قسم کی آزادی دی مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔

ان بے چاریوں کے تو پر نکلنے سے پہلے ہی کاٹ دیے جاتے تھے۔ پیدا ہوتے ہی جب ان کی مٹھیاں بھی صحیح طور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پر نہ کھلتی تھیں تو ان کی انگلیوں میں آئندہ زندگی کے ساتھیوں کی مہریں انگوٹھیوں کی صورت ثبت کردی جاتیں۔ قسمت ایسی کہ ان کے منگیتر اسکولوں سے آگے نہ پڑھ پائے جب کہ وہ تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے یونیورسٹی تک جا پہنچیں۔ مگر بابا جان نے جوان کے پیدا ہوتے ہی فیصلے کردیئے تھے ان سے ایک انچ نہ ہلے۔

اور آج ہی انہوں نے حمیدہ کے ذریعے زبیدہ کو کہلوایا تھا کہ ایک ماہ بعد اس کی رخصتی ہے اور اب وہ شہر نہ جائے کیونکہ زبیدہ نے ان سے پی ایچ ڈی کی اجازت چاہی تھی اور اس کا جواب انہوں نے یہ بھجوایا تھا۔ تبھی وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ وہ کسی صورت بھی سکندر جیسے میٹرک پاس زمیندار کو اپنی زندگی کا ساتھی نہ بنا سکتی تھی.... جسے بات کرنے تک کی تمیز نہ تھی۔ زبیدہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آجاتی جیسے کہ سالم ہی نگل جانے کا ارادہ ہو آنکھوں کے راستے۔ مونچھوں تلے اس کے ہونٹ ہر دم مسکراتے رہتے۔

پھر وہی ہوا جو بابا جان چاہتے تھے۔ زبیدہ روئی پیٹی، زہر کھانے کی دھمکی دی مگر بابا جان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب اس نے کہہ دیا کہ عین نکاح کے وقت انکار کردے گی۔ امی جی تھرا کر رہ گئیں۔ حمیدہ کو یوں محسوس ہوا جیسے پورا ٹرک اسے روندتا ہوا گزر گیا ہو۔

پھر امی جی آگے بڑھیں۔

''تو.... تو ایسا نہیں کرے گی زبیدہ۔''

''میں ایسا کروں گی۔'' وہ گرجی۔

''نہیں تو ایسا نہیں کرے گی ورنہ میں جیتے جی مرجاؤں گی اور کوئی خبر نہیں کہ تیری ڈولی کی بجائے میرا جنازہ اس گھر سے اٹھے۔''

''خدا نہ کرے امی جی۔'' زبیدہ تڑپ اٹھی۔

''پھر تو انکار نہ کر۔'' امی جی کا لہجہ نہایت ٹوٹا ہوا تھا۔

''تو پھر امی جی میرے جنازے کا بندوبست کردیا جائے۔'' زبیدہ کا لہجہ باغیانہ تھا۔

پھر امی جی نے کچھ نہ کہا بس اپنا بے داغ سفید دوپٹہ اتارا۔ اب ان کے سامنے یہی راستہ تھا۔ مشرقی مائیں اپنی بات منوانے کے انداز بھی جانتی ہیں۔ ماں جھک گئی تو زبیدہ کو یوں لگا جیسے نیل گگن اس کے قدموں میں آرہا ہو۔ ''نہیں.... نہیں.... امی جی آپ پر ہزاروں زبیدہ قربان ہوسکتی ہیں۔ میں کچھ نہیں کروں گی چپ چاپ دار پر چڑھ جاؤں گی۔'' زبیدہ روتے روتے ماں سے لپٹ گئی۔

سمجھو خطرہ ٹل گیا تھا۔ مان قائم رہ گیا تھا۔ عزت باقی تھی۔ بیٹی نے لاج نبھادی تھی۔

اپنے دل کے ٹکڑے کردیئے تھے۔

ہزاروں لڑکیوں کی طرح.... اپنے دل و ذہن پر کڑے پہرے بٹھادیئے تھے اور بڑی بہنوں کی طرح گونگی، بہری اور اندھی ہوگئی تھی وہ۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ ہم مقدر کے تابع ہیں۔ لوح محفوظ کے لکھے ہوئے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ مشرقی اور مغربی لڑکی میں بہت فرق ہے بلکہ یہی تو مشرق اور مغرب کا فرق ہے۔ ''ہماری قدریں، ہماری روایات ہمارا سرمایہ ہیں، ہماری پہچان ہیں اور یہ قدریں، یہ روایات اب مجھے بھی عزیز ہیں۔''

''امی جی کی خاطر۔'' ''بابا جان کی وجہ سے۔''

''اور پھر سب سے بڑھ کر مشرق کی بیٹی کی حیثیت سے، ہم کتنے ہی بولڈ بنیں... کتنی بھی آگہی حاصل کرلیں گے، رہیں گی وہی مجبور بے بس لڑکیاں.... روایات کی بھینٹ چڑھنے والی لڑکیاں۔ اب میں بھی بھاری زیورات کے بوجھ تلے دب کر سب کچھ بھول جاؤں گی اور آگہی کے تمام روزن بند کرکے روایتی چودھرائی بن جاؤں گی۔ جس کا فرض یہی ہے کہ اپنے شوہر کی خامیوں کو بھی خوبیاں سمجھ کر گلے لگالے، میں بھی وہی.... وہی.....'' زبیدہ نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور روایات سے ٹکرانے کا عزم رکھنے والی زبیدہ.... خود کو مختلف لڑکی سمجھنے والی زبیدہ.... باغی ذہن رکھنے والی زبیدہ.... دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر عام سی مجبور اور بے بس لڑکی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

پتا نہیں یہ آنسو زیادہ آگہی کے تھے یا روایات کی بھینٹ چڑھنے سے پہلے وہ آنسوؤں سے اپنے چہرے کو غسل کروا رہی تھی جس پر اب اسے خول چڑھا لینا تھا۔

اور اب اس نے جانا تھا کہ لڑکیاں مختلف نہیں ہوتیں۔ سب کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھتا ہے۔ بے بسی اور مجبوری کے گارے سے ہی سب بنتی ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہمارے عہد کی صاحب بیاں داستان کار کا تیسرا شاہ کار

تیرے سنگ رہنا سدا

اقبال بانو

محبتوں پر قربان ہو جانے والوں کی داستانِ عبرت

موسم نہایت خوشگوار تھا۔ بھری دوپہر ہونے کے باوجود بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ کالی کالی گھٹاؤں نے آکاش کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور آثار تھے کہ ابھی بارش ہوا ہی چاہتی ہے۔ حمید تقریباً آدھ گھنٹہ سے شیشم کے درخت تلے کھڑا تھا یہ آدھا گھنٹہ اسے صدیوں پر محیط لگ رہا تھا اور سڑک پار گورنمنٹ ہائی اسکول کا گیٹ تھا کہ کھلنے ہی میں نہیں آرہا تھا۔

اور پھر ایک دم ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ آنکھوں میں انوکھی چمک عود آئی یوں لگا جیسے کہ سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو، وہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی ہمیشہ کی طرح اس نے کریم کلر کی چادر سے اپنے پورے وجود کو ڈھانپ رکھا تھا۔ حمید سڑک پار کر کے تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

''آج دیر ہوگئی۔'' وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''میں سمجھی تم نہیں آئے ہوگے، میں کینٹین میں بیٹھی رہی۔'' وہ بولی۔

''پورا آدھ گھنٹہ ہوگیا ہے۔'' حمید بولا۔

''اچھا۔'' وہ ہنس دی۔

''اڑا لو مذاق۔'' حمید منہ بنا کر بولا۔

''تمہیں علم ہے کہ آج میرا آخری پرچہ تھا۔'' شاہدہ نے کہا۔

''ہاں بھئی بتاؤ کیسا ہوا۔''

''ٹھیک ہی ہوگیا ہے۔''

''شاہدہ!'' حمید کی گمبھیر آواز میں کہا۔

''ہوں۔''

''اب میں تمہیں کیسے دیکھوں گا؟'' اس نے بونگا سا سوال کر دیا۔ ''یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا۔''

''پلیز! شاہدہ کچھ کرو نا؟'' حمید نے نہایت ملتجی لہجے میں کہا۔

''میں کیا کر سکتی ہوں حمید۔'' شاہدہ نے کہا۔

''کچھ بھی کرو۔'' وہ بے قرار تھا۔

''تم یوں کرو میرے گاؤں آجایا کرنا۔'' شاہدہ نے رائے دی۔ ''اتنی دور۔'' حمید نے کہا۔

''بس بے چینی ختم۔'' شاہدہ نے مذاق اڑایا۔

''یہ بات نہیں ہے شاہدہ.....''

''تم مجھے دیکھنے کے لیے بے قرار بھی ہو اور گاؤں بھی نہیں آنا چاہتے۔'' شاہدہ چمک کر بولی۔

''ٹھیک ہے میں ہر جمعے تمہارے گاؤں آیا کروں گا۔ مگر یہ بتاؤ کہ ملوگی کہاں۔'' حمید مان گیا۔

''ہمارے گاؤں سے باہر ایک کنواں ہے اس کے قریب ہی شیشم کا درخت ہے۔ بس دن چھپنے سے پہلے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں وہاں آجایا کروں گی۔'' شاہدہ بولی۔

''تم دوپہر میں آنا۔''

''وہ کیوں؟''

''دیکھو نا مجھے گھر جاتے جاتے کافی رات ہوجایا کرے گی اور ویسے بھی بھری دوپہر میں کون ہمیں دیکھے گا۔'' حمید نے کہا۔

''تمہارا گھر تو نزدیک ہی ہے۔''

''پہلے میں اپنے تایا کے ہاں رہتا تھا۔ اسکول تایا جی کے گھر کے نزدیک تھا۔ اب میں اپنے گاؤں جارہا ہوں جہاں سے لاری کا یہاں تک کا راستہ ڈھائی گھنٹے کا ہے۔''

''پہلے تم نے نہیں بتایا۔''

''کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا۔''

اب وہ دونوں کپاس کے کھیت کے بیچوں بیچ بنے ہوئے چھوٹے سے راستے سے گزر رہے تھے۔

اور پھر جب شاہدہ کا گاؤں تھوڑی دور رہ گیا تو حمید نے رک کر ہولے سے کہا۔

''اچھا شاد خدا حافظ میں جمعہ کو آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔'' شاہدہ نے نظریں اٹھا کر حمید کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں خواہ مخواہ ہی شبنم چمکنے لگی۔ وہ حمید کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تو جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

حمید کتنی ہی دیر تک کیکر کے تنے سے ٹیک لگائے اسے جاتا دیکھتا رہا حتی کہ وہ اس گاؤں کے کچے پکے مکانوں کی دیواروں کے پیچھے گم ہوگئی۔ حمید دل میں ہزاروں ڈیرے اداسیوں کے ڈال کر واپس پلٹ آیا۔

شاہدہ ملوک شاہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ملوک شاہ لکڑیوں کا بیوپاری تھا اور اس کا گزارہ گاؤں کے ان لوگوں سے اچھا ہوتا تھا جو کہ زمیندار کے مزارے تھے۔ ملوک شاہ اپنے بیوپار کے سلسلے میں شہر جایا کرتا تھا اور جب وہ کسی اسکول کے بچوں کو اجلے اجلے یونیفارم پہنے یوں ہی گلے میں بستہ ڈالے لڑکائے دیکھتا تو اس کے دل میں یہ خواہش پھول بن کر کھل اٹھتی کہ اس کی بیٹی شاہدہ بھی اس طرح یونیفارم پہنے یوں گلے میں بستہ ڈالے ہو اس نے شاہدہ کو اسکول میں ڈال دیا۔ جو کہ گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔

وہ ایک آفیسر کالونی تھی جس میں وہ پرائمری اسکول تھا۔ جہاں کالونی کے بچے پڑھا کرتے تھے۔

وہیں حمید اور شاہدہ کی پہلے روز ہی دوستی ہوگئی۔ شاہدہ کی کوئی اور سہیلی نہ تھی۔ وہ اور حمید ہر دم ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حمید کا گھر کالونی میں ہی تھا۔ حمید کو تو اسکول آنے میں کوئی دقت نہ ہوتی جب کہ شاہدہ کو بہت سویرے گھر سے نکلنا پڑتا۔ ملوک شاہ نے اس کے اسکول لانے اور جانے کے لیے ایک ملازم دنیور رکھا ہوا تھا۔ جو شاہدہ کو لے جاتا تھا۔ اور چھٹی ہونے تک اسکول کے باہر ہی چپڑاسی سے گپ بازی کرتا تھا۔ یوں ہی وقت گزرتا رہا۔ شاہدہ اور حمید میں گاڑھی چھنتی۔ شاہدہ ذرا ذرا سی چیز حمید کے لیے چھپا چھپا کر رکھتی اور دوسرے روز حمید کو دیتی تو وہ بہت خوش ہوتا۔ شاہدہ کے ننھیال والے بھی اس گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ بہت اعتراض کرتے کہ شاہدہ نہ پڑھے مگر ملوک شاہ نے کسی کی نہ سنی۔ پرائمری کے بعد شاہدہ کو سیکنڈری سکول میں داخل کروایا گیا اور یوں حمید اور شاہدہ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ حالانکی حمید بھی کالونی کے ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا مگر یہاں لڑکوں کی دوپہر میں اور لڑکیوں کی صبح شفٹ ہوتی تھی۔ پھر جب چھٹی ہوتی حمید گیٹ پر اپنی ساتھی سے ملنے کے لیے موجود ہوتا، اس کی ایک جھلک ہی حمید کو سرشار کر دیتی۔ وہ دونوں بچے ہی تو تھے اتنی شدت اور گہرائی کا مطلب وہ نہ سمجھ سکتے۔ مگر گزرتے وقت نے انہیں آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھا دیا۔

شاہدہ کو پتہ چل گیا کہ حمید کو سامنے پا کر اس کا دل کیوں دھڑک دھڑک بے حال ہوتا ہے۔ پلکیں اتنی بوجھل کیوں ہو جاتی ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتیں اور ویسے بھی لڑکیاں تو وقت سے پہلے بڑی ہو جاتی ہیں۔ ہر بات سمجھنے لگتی ہیں جب شاہدہ بھی ہر سمجھنے لگی تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آٹھویں کلاس میں بری طرح فیل ہوگئی جب کہ حمید پاس ہو گیا۔۔۔ پھر بھی اس نے شاہدہ کو دلاسہ دیا کہ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے تم دوبارہ امتحان دے دینا۔ شاہدہ نے اس کی بات پلے باندھ لی ورنہ اب تو اس کا دل پڑھنے کو ہی نہیں چاہتا تھا اب شاہدہ اسکول اکیلی جاتی۔ پھر ہوا یہ کہ ملوک شاہ نے بیٹی کو برقعہ اوڑھا دیا اور یہ واضح سگنل تھا کہ اب شاہدہ ہرنی کی طرح قلانچیں نہیں بھرے گی۔ حمید سے شاہدہ نے ڈوبتے دل سے کہا۔

''حمید اب تم اسکول کے گیٹ پر مت کھڑے ہوا کرو۔''

''کیوں؟'' حمید نے حیرت سے پوچھا۔

''لوگ کیا کہیں گے۔'' شاہدہ بولی۔

''کچھ نہیں۔ پہلے کوئی کچھ کہتا ہے۔''

''اب ہم بڑے ہو گئے ہیں حمید۔'' شاہدہ نے ہولے سے کہا۔

''شاہدہ میں تمہیں نہ دیکھوں تو نجانے مجھ کو کیا ہو جاتا ہے۔'' حمید نے بیقراری سے کہا۔

''میں کیا کروں؟'' شاہدہ بے پروائی سے بولی۔

''اچھا پھر اس طرح ہے کہ میں صبح کے وقت اسکول کے پچھواڑے باغ میں آجایا کروں گا۔ تم ذرا جلدی آیا کرو۔'' حمید نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' شاہدہ نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

....اور پھر یہی ہونے لگا کہ شاہدہ اسکول جلدی آجاتی اور حمید اور وہ دس پندرہ منٹ ساتھ گزار لیتے۔ اور پھر یہ جذبے جو اپنا آپ منوا کر رہتے ہیں۔ حمید نے بھی اپنے دل میں محسوس کیے شاہدہ سے دوری کا تصور بھی اس کے لیے سوہان روح تھا... اور ایک روز وہ شاہدہ کا ہاتھ تھام کر نہایت پریم سے بولا۔

''شاد میں تجھ سے شادی کروں گا۔ تو کرے گی نا؟''

حمید نے اتنی معصومیت سے کہا کہ شاہدہ ٹک ٹک اسے دیکھے گئی۔ جو بات اس کے دل میں تھی۔ حمید نے برملا کہہ دی نہایت سیدھے سادھے لفظوں میں وہ دریائے حیرت میں غوطہ زن تھی۔

''بتاؤ شاد مجھ سے شادی کرو گی؟'' حمید نے بے قراری سے پوچھا۔

''ہاں۔'' شاہدہ نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا اور حمید کی تو دل کی کلی کھل گئی۔

اب ان کی ملاقاتیں ہوتیں تو وہ پہلے جیسی معصوم باتیں نہ ہوتیں بلکہ مستقبل کے انہوں نے خواب دیکھے جاتے۔ چھوٹے سے گھر کے سپنے دیکھے جاتے۔ حمید منصوبے بناتے رہتا اور شاہدہ مسکرا مسکرا کر سنتی رہتی۔ حمید کے چھ اور بھائی بھی تھے مگر ان کی کوئی بہن نہ تھی اور ان ساتوں بھائیوں کو بہن کا بڑا ارمان تھا۔ حمید کے والد کی شورکوٹ میں زمینیں تھیں۔ اس لیے یہ لوگ زمیندار کہلاتے تھے۔ حمید نے میٹرک کے بعد شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا اور وہ اب بھی کسی نہ کسی طور شاہدہ سے ملنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ضرور آتا اور جب دونوں بچھڑتے تو دونوں کے چہروں پر ہجر کی کہانیاں واضح طور پر پڑھی جاتیں۔

☆.....☆

یوں ہی وقت کے بہتے سمندر میں کچھ اور سمندر پڑے اور جب شاہدہ نے انٹر کا ایگزام دیا تو حمید بی۔اے میں تھا، خدا کو ان کا سنجوگ منظور تھا اور حمید نے والدین سے ضد کر کے شاہدہ کے ہاں رشتہ لینے کے لیے بھیجا۔ حالانکہ اس کے دو بڑے بھائی ناراض ہوئے کہ وہ غیر برادری میں شادی کر رہا ہے مگر جب والدین راضی تھے تو وہ کیا کرتے.... ملوک شاہ بڑی مشکل سے مانا کیونکہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی اور پھر یہ بات دونوں سسر داماد میں طے ہوگئی کہ حمید ایک ماہ بعد یہاں آجائے گا اور گھر داماد کے طور پر رہے گا۔ ملوک شاہ بس اسی بات پر مان گیا اور یوں ایک گلابی شام وہ بچپن کے ساتھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہوگئے۔

حمید تو شاہدہ کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ دونوں کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ہوگئے ہیں اور پھر حسب وعدہ حمید شاہدہ کو لے کر واپس سسرال آگیا۔ حالانکہ اس کے والدین نے بہت شور مچایا مگر حمید نے کہا۔

''بابا جان میں چاچا ملوک سے وعدہ کر چکا ہوں اور ویسے بھی میں بچپن سے تایا جی کے پاس رہا ہوں۔ اب اگر میں اپنے سسرال رہوں تو کیا حرج ہے۔ آخر آپ کے چھ اور بیٹے بھی ہیں۔ ویسے بھی وہاں سے کالج جانے سے آسانی رہے گی۔'' حمید نے بہانوں سے باپ کو راضی کر لیا اور ملوک شاہ کے ہاں آگیا۔

چند روز تو ٹھیک گزرے مگر حمید نے یہ بات شدت سے محسوس کی۔ کہ ہاجرہ بی بی جو کہ شاہدہ کی ماں تھی۔ وہ اس سے خوش نہیں بلکہ اس نے دیکھا کہ شاہدہ بھی مرجھائی سی رہنے لگی ہے حمید اور شاہدہ اگر کمرے میں ہوتے تو ہاجرہ فوراً شاہدہ کو آواز دے کر بلا لیتی جیسے کہ وہ اپنے شوہر کے پاس نہیں بلکہ غیر مرد کے پاس بیٹھی ہو اور پھر ایک روز جب حمید کالج سے آیا تو اس نے دیکھا شاہدہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے کہ روئی رہی ہو۔

اس نے زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر حمید کا استقبال کیا۔ حمید کمرے میں چلا گیا۔ شاہدہ سے وہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ تو اداس کیوں ہے؟ تب ہی ہاجرہ بی بی نے آواز لگائی۔

''شاہدہ ادھر آ'' اور وہ کھٹ سے کمرے سے نکل گئی۔

پھر کھانا بھی حمید کو ملازمہ نے لا کر دیا اور شاہدہ اسے نظر نہ آئی بے تحاشا بھوک ہونے کے باوجود بھی حمید نے کھانا نہ کھایا۔

شاہدہ کی سوجی آنکھوں نے حمید کے دل میں چھالے ڈال دیے تھے اور وہ رات کا منتظر تھا۔ جب شاہدہ اس کے پاس آئی تھی۔ کیونکہ اس وقت ملوک شاہ آجاتا تھا۔ اور ہاجرہ ملوک شاہ کے سامنے انہیں کھلی چھوٹ دے دیتی تھی۔

اور رات کو شاہدہ نے حمید کے سینے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

''حمید مجھے یہاں سے لے چلو میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

''کیوں؟ آخر کیا ہوا؟'' حمید نے بے چینی سے پوچھا۔

''اماں ہر وقت طعنے دیتی ہیں کہ پڑھنے جاتی تھی قسم کر بیٹھی۔ اصل میں وہ اپنے بھانجے سے میرا بیاہ کرنا چاہتی تھیں ان کی نشتر زنی مجھے جینے نہیں دیتی۔''

''میں تمہارے بابا سے بات کروں گا۔'' حمید نے شاہدہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اور پھر شاہدہ اس کی بانہوں میں اپنے سارے غم بھول گئی۔

حمید نے ملوک شاہ سے علیحدہ رہنے کی بات کی تو وہ نہ مانا۔

''تم وعدہ کر چکے ہو ساتھ رہو گے میں شاہدہ کو خود سے جدا نہیں کر سکتا۔'' اس نے حمید کی ایک بھی نہ سنی۔

اور پھر یہ ہوا کی جب شاہدہ کا رزلٹ نکلا تو حمید نے اپنے ہی کالج میں اسے بی۔اے میں ایڈمشن دلا دیا۔ حالانکہ ہاجرہ بی بی نے منع کیا مگر حمید نہ مانا۔ یہ تو تھا کہ شاہدہ کی اس کل کل سے جان چھوٹی تھی۔ صبح وہ اسکوٹر پر شاہدہ کو لے کر کالج چلا جاتا اور سہ پہر کو وہ دونوں گھومتے گھامتے واپس لوٹتے۔ شاہدہ کی شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ دونوں بہت خوش تھے اور پھر ایک روز حمید نے شاہدہ سے کہا۔

''ہم الگ گھر بنائیں گے۔ شاہدہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ سسرال میں پڑا رہوں۔''

''میں نے تو پہلے بھی کہا تھا تم نہیں مانے۔'' شاہدہ بولی۔

''بس ایگزام دے لوں کہیں سروس کے لیے اپلائی کر دونگا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''بالکل ٹھیک۔'' شاہدہ نے کہا۔

اور حمید اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ کیوں الگ رہنا چاہتا ہے۔

اس نے چند روز سے گھر کے ماحول میں عجیب تبدیلی دیکھی تھی۔

قریبی گاؤں کا زمیندار مراد خان ان کے ہاں روزانہ آنے جانے لگا تھا حمید کو اڑتے اڑتے خبر ملی تھی کہ وہ گئے دنوں میں ہاجرہ بی بی کا محبوب تھا جب پڑھنے شہر گیا تو پیچھے ہاجرہ بی بی کی شادی ملوک شاہ سے ہوگئی تھی۔ اور اب اتنے برسوں بعد وہ اپنی محبتوں کو تازہ کرنے آجاتا۔ جب کہ حمید کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ گھنٹوں ہاجرہ بی بی سے گپیں ہانکتا اور شام کو ملوک شاہ کے آنے سے پہلے چلا جاتا۔ حمید اور شاہدہ کالج سے آتے تو پہلے سے موجود ہوتا اور حمید کا خون کھول کر رہ جاتا ایک روز دبے دبے لفظوں میں اس نے ہاجرہ بی بی سے کہا۔

''ماسی مجھے اچھا نہیں لگتا کہ مراد خان یہاں آئے۔''

''یہ میرا گھر ہے جو چاہے آئے تم کون روکنے والے ہوتے ہو۔'' ہاجرہ چمک کر بولی۔

اور حمید نے سوچا واقعی اگر یہ میرا گھر ہوتا تو اس طرح منہ پر تھپڑ تو نہ پڑتا۔

پھر ہاجرہ بی بی نے بہانہ کیا کہ مراد خان شاہدہ کو پڑھایا کرے گا۔

حمید نے کہا۔ ''جب میں پڑھا دیتا ہوں تو کیا ضرورت ہے کسی ٹیوٹر کی۔''

اور حمید کی اس بات پر ہاجرہ بی بی کا دل سلگ اٹھا۔ تب اس نے عہد کیا کہ حمید تم یہاں نہیں ہوگے۔ تم میرے لیے خطرہ ہو۔ حمید امتحان سے فارغ ہوا تو اسے اپنے دل میں درد محسوس ہونے لگا۔ بیٹھے بیٹھے وہ ٹھنڈے پسینوں میں ڈوب جاتا اور شاہدہ بولائی بولائی پھرتی اور پھر ایک روز تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے جب حمید نے منہ بھر کر سرخ خون سے سفید چادر پر گل وگلزار بنا دیے۔

''حمید کیا ہوا؟'' شاہدہ رو دی۔

''میرے دل میں کچھ ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے دل کو کوئی کاٹ رہا ہے۔'' حمید بولا اور پھر بے ہوش ہوگیا......

ملوک شاہ بری طرح گھبرا گئے.....اور پھر کون سا علاج تھا جو کہ انہوں نے داماد کا نہ کرایا۔ صرف ایک ماہ میں ہی حمید نچڑ کر رہ گیا۔ حمید کے والدین اسے لینے آئے مگر وہ نہ مانا۔ وہ اپنی شاہدہ کے ہاتھوں ہی میں دم دینا چاہتا تھا۔ بعض مرتبہ کہتا۔

''شاد میں مر جاؤں تو تم شادی کر لینا زندگی کو روگ نہ لگانا۔'' تب شاہدہ تڑپ تڑپ کر رو دیتی۔

پھر حمید کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ ایکسرے ہوئے مگر ڈاکٹروں کی سمجھ میں کوئی مرض بھی نہ آیا۔ حمید کا باپ اور سسر پانی کی طرح پیسہ بہا رہے تھے۔ حمید کے لیے اس کے چھ بھائیوں نے خون دیا، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔

زہرہ بیگم اپنے کڑیل جوان بیٹے کو خون تھوکتے دیکھتیں تو دل پکڑ کر رہ جاتیں۔ ڈاکٹر ان کے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کر رہے تھے اور آخر وہ اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے ایک پیر صاحب تک پہنچ گئیں۔ ان کا بہت شہرہ تھا کئی لوگ اپنی مرادیں پا چکے تھے اور زہرہ بیگم بھی مایوس نہ تھیں۔

انہوں نے اپنے بیٹے کی تمام کیفیت پیر صاحب کو بتا دی۔ انہوں نے چند لمحے آنکھیں بند کر کے کچھ دیر سوچا اور پھر آنکھیں کھول کر اپنی سرخ سرخ نظروں سے زہرہ بیگم کو دیکھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' ان کے لب کپکپائے۔

''تمہارا بیٹا زندہ نہیں رہ سکتا......''

''آپ کچھ نہیں کر سکتے.....''

''کرنے والا تو وہ نیلی چھتری والا ہے وہ چاہے تو مردے میں جان ڈال دے، پر اس کے کلام میں بھی تو اثر ہے، تمہارے بیٹے پر سفلی عمل کرا دیا گیا ہے۔''

''نہیں.....نہیں۔'' زہرہ بیگم کی خوفزدہ سی چیخ نکل گئی۔

''جاؤ اور وہ جہاں رہتا تھا اس گھر کی دہلیز کو کھود دو، وہاں مٹی کا منہ بند لوٹا دفن ہے۔ اس میں تین جنگلی کالے بچھو ہیں جو کہ دو ڈھائی ماہ سے بالکل بھوکے ہیں اور جب وہ مارے بھوک کے لوٹے کی خالی سطح کو ڈنگ مارتے ہیں غذا کی خاطر تو تمہارے بیٹے کے دل میں سوراخ ہو جاتا ہے اور روز ہی کتنے سوراخ ہوتے ہیں مجھے تو حیرت ہے کہ وہ ایک دن میں مر کیوں نہ گیا۔ اب تک زندہ کیسے ہے تم جاؤ اور ان بچھوؤں کو آزاد کر دو جب تک وہ زندہ ہیں تمہارا بیٹا بھی زندہ ہے، جیسے ہی وہ مرے وہ بھی مر جائے گا۔''

پیر صاحب بولتے گئے اور زہرہ بیگم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ پھر نجانے ان میں کیسے اتنی ہمت آئی وہ پیر صاحب کے حجرے سے نکلیں چپل پہننے کا بھی ہوش نہ رہا اور بھاگتی ہوئی بس اسٹینڈ پر پہنچی وہاں سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رکشہ لیا اور گاؤں گئیں۔ ان کے ذہن میں پیر صاحب کا جملہ گونج رہا تھا۔

''ان کو آزاد کردو۔ جب تک وہ بچھو زندہ ہیں تمہارا بیٹا بھی زندہ ہے۔'' گاؤں سے باہر رکشہ رکا تو انہوں نے پلو میں جتنے پیسے بندھے ہوئے تھے رکشے والے کو دے دیے اور پھر بیٹے کے زندگی بچانے کے لیے ممتا کی ماری ماں گاؤں کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں دیوانہ وار دوڑی جارہی تھی اور پھر ملوک شاہ کے دوزارے کی دہلیز پر وہ تیورا کر گر پڑی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے عورتوں سے بھرے آنگن کو تکنے لگیں جہاں ایک چارپائی کے گرد عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور شاہدہ چارپائی کی پٹی سے سر ٹکرا رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے زمین آسمان کانپ رہے تھے۔ عورتیں اسے تھامنے کی ناکام کوشش کررہی تھیں اور کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ ایک دکھیاری ماں اس دروازے کی چوکھٹ پر گری پڑی ہے جہاں وہ بچھو دفن تھے اور زہرہ بیگم کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کی ان کا جوان کڑیل پتر موت سے ہار گیا۔ اور پھر سب نے دیکھا کہ وہ ہاتھ سے اس چوکھٹ کو کھودنے لگیں۔ ہاجرہ بی بی تیزی سے آگے بڑھی اس کا رنگ امتاس کے پھولوں کی طرح زرد ہورہا تھا۔

''یہ کیا کررہی ہو حمید کی ماں۔''

''مجھے یہ چوکھٹ اکھاڑنی ہے ہاجرہ..... جہاں میرے بیٹے کی موت کا سامان دفن ہے۔'' زہرہ بیگم نے چٹانوں کی سی سختی سے کہا.... پھر ہاجرہ بی بی اور دوسری عورتوں کے روکنے کے باوجود وہ نہ رکیں۔ قریب پڑا ہوا کدال اٹھا کر کھدائی شروع کردی اور چند لمحے بعد ہی وہ مٹی کا منہ بند لوٹا ان کے ہاتھ میں تھا جس کو کھولا تو واقعی اس میں تین سیاہ مردہ بچھو موجود تھے۔

ہاجرہ بی بی تو کانپ رہی تھیں... اور زہرہ بیگم سمجھ گئیں کہ یہ چال کس کی ہے۔ بہت ہی شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔

''تم جیت گئیں ہاجرہ میں ہارگئی۔ میرا حمو مجھ سے روٹھ گیا۔ خدا کرے تم بھی ایسی دلخراش جدائی دیکھو۔ جس طرح میرا دل پھٹا ہے تمہارا بھی پھٹے۔'' انہوں نے ہاجرہ بی بی کو گریباں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

یہ بات سب جگہ پھیل گئی کہ دہلیز سے بچھو نکلے ہیں مگر زہرہ بیگم اس قابل ہی نہ تھیں کی بتائیں انہیں کس طرح پتا چلا بس وہ تو ایک ہی بین کیے جارہی تھیں۔

''حمو تیرے دشمن تجھے کھا گئے وہ خوش نہیں تھے تجھ سے تو کیوں آیا اس جگہ.....''

پھر حمید کی لاش لاری کے ذریعے اسی کے گاؤں لے جائی گئی کیونکہ حمید کے بھائی اسے اپنے آبائی گاؤں کے قبرستان میں دفنانا چاہتے تھے۔ شاہدہ بھی انہیں کے ساتھ چلی گئی اور جاتے جاتے ہاجرہ بی بی سے کہنے لگی۔

''اماں آپ کو پسند نہیں تھا کہ حمید یہاں رہے، آپ یونہی کہہ دیتیں ہم چلے جاتے مگر آپ نے میرا ہنستا بستا گھر تباہ کردیا ہے۔ اب یہاں اکیلی رہیں۔ شادیانے بجائیں میں اپنے سسرال میں رہوں گی۔ حمید کی قبر پر روز دیا جلاؤں گی ہم بچپن کے ساتھی ہیں میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اب میں اس آس پر زندہ رہوں گی حمید کے پہلو میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو اور وہ قبر میری ہوگی۔''

پھر ملوک شاہ کے روکنے پر بھی وہ نہ رکی اور اپنی روتی بلکتی ساس کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار کیے اس کے گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل آئی۔

آج کئی سال ہوگئے ہیں شاہدہ پلٹ کر میکے نہیں گئی ... وہ روز شام کو حمید کی تربت پر اپنے اشکوں کے ہار چڑھاتی ہے اور دیا جلاتی ہے اور لوگ اس جوان اور اسیر وفا بیوہ کو دیکھ کر آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ جس کی ماں نے اس کے ہنستے بستے چمن کے تنکے بکھیر دیے تھے صرف اس لیے اس کا داماد پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی ساس کا گئے دنوں کا محبوب اپنی یادیں تازہ کرنے ان کے گھر آجائے اور مزے کی بات تو یہ ہے کی ہاجرہ بی بی کا وہ محبوب اب نہیں آتا۔ کیونکہ مراد خان نے اسے کہا۔

''جب تم اپنی بیٹی کی خوشیوں پر شب خون مار سکتی ہو تو میں کون ہوتا ہوں۔ مجھے تو تمہاری محبت پر بھی بھروسہ نہیں۔''

اور ہاجرہ بی بی ہاتھ ملتے ہوئے سوچے جاتی ہے۔

کیا آیا میرے ہاتھ.... سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں۔ صرف اپنی خوشی کی خاطر رہا تنی کڑی سزا ہے کہ میری کوکھ سے جنی بیٹی بھی میری نہیں ہوئی.... پتہ نہیں وہ ماں سے ناگن کیسے بن گئی۔ پچھتاوے اسے چین نہیں لینے دیتے۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیمان ہونا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشہور صحافی اور داستان گو کے قلم کی پہلی عبرت انگیز تحریر

میرا کیا قصور

جاوید راہی

اُس شخص کی داستان جس کے نصیب میں انہونیاں لکھ دی گئی تھیں

''یار منظور اب کیا ہے؟ سو جاؤ چین سے۔'' میرے ساتھ والے قیدی افتخار نے اپنا منہ دیوار کی طرف کرتے مجھے بیٹھے دیکھ کر کہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ تقدیر اس طرح سے بھی کھیل کھیلے گی اگر یقین سے کہا جائے تو میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کوئی معمولی نوعیت کے نہیں تھے جیل کی سلاخوں سے پار باریک جالی سے نظر آنے والے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھا۔ چاند کی بدلی کی اوٹ میں گم مدھم روشنی میں بدل چکا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل میرے رویہ سے خوش تھا۔ میری مشقت' اُن پڑھ قیدیوں کو جیل میں پڑھانے کی ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ رہائی میں چند روز باقی رہ گئے تھے اس لیے باہر کی فضا میں سانس لینے کی آرزو بے چین کیے ہوئے تھی۔

رہائی تو مل گئی مگر میرے اندر کی توڑ پھوڑ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ میں کچھ چاہتا تھا کیا چاہتا تھا کوئی خبر نہیں تھی۔ میں تمام دن اور رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا جب اُکتا جاتا تو گاڑی نکال کر یونہی آوارہ گردی پر نکل پڑتا۔ میرے دل پر اور ضمیر پر بوجھ تھا کہ میں قاتل ہوں چاہے اپنے کیے کی سزا کاٹ کر باہر آ گیا تھا مگر اپنے اندر کی جیل میں دن رات قید تھا۔

سڑکیں ویران تھیں۔ میں نے تیز رفتاری سے بائیں جانب موڑ کاٹا اور ایک گھر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ پیچھے آنے والی ایک اور کار کے ڈرائیور نے پوری قوت صرف کر کے بریک لگائے تھے اور چلا کر ان سب کو جو عموماً آگے پیچھے دیکھے بغیر اور اپنی یا دوسروں کی زندگی سے بے نیاز ہو کے ایسی غیر ذمے دارانہ ڈرائیونگ کرتے ہیں گالی دی مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ مجھے احساس تک نہ تھا کہ اپنی بے پروائی کی عادت کے باعث وہ کیسے جان لیوا حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔ کار میں نے گھر کے پورچ کے بجائے گیراج کے بند دروازے سے چند انچ کے فاصلے پر روکی۔ طویل و عریض کار حرکت سے یکلخت قیام کی حالت میں آنے کے باعث احتجاجاً تھوڑا سا اوپر نیچے ہوئی پھر اس کا متلاطم وجود ساکت ہو گیا تاہم میں نے کار سے اُترنے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا میں کچھ دیر اسی طرح پیر پھیلائے اور ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے بیٹھا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر فیصلے کو ناگزیر سمجھتے ہوئے میں نے ایک دروازہ کھولا اور باہر آ کے سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد آدھی سگریٹ کو جوتے سے مسل دیا۔ رومال نکال کے میں نے اپنی جبیں پر سے پسینہ پونچھا جس کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں اب بھی تذبذب کا شکار تھا میں نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جس کے دیوار و در سے آشنائی کا رشتہ بہت پرانا تھا مگر اس سے وابستہ یادیں بہت تلخ تھیں۔ گھر میں اندر کے کسی کمرے سے صرف ٹیلی وژن کی آواز باہر آ رہی تھی اور روشنی بھی صرف ایک ہی کمرے میں تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے جذباتی فیصلے پر نظر ثانی کی۔ واپس لوٹ جانے کے بارے میں سوچا اور اپنی دلائل سے اس خیال کو رد کر دیا جواب تک میں خود کو باہر دے چکا تھا۔ اپنے اقدام کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کی یہ ذہنی کشمکش مدت سے جاری تھی اور یہاں تک پہنچ جانا اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ میرے اندر کا وہ آدمی جو اس کی مخالفت کرتا تھا ہار گیا ہے۔ میں نے کال بیل بجا کے ایک منٹ تک انتظار کیا۔ آوازوں سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کوئی دروازہ کھولنے آ رہا ہے۔

جس شخص نے دروازہ کھولا وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا آسودہ حال اور مطمئن نظر آنے والا عام سا آدمی جو زندگی کی جدوجہد میں دن صرف کرنے کے بعد شام کے ہر لمحے کو سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ ساحل سمندر پر سیپیاں چننے والے کی طرح جو اس خیال کی دسترس سے دور نکل گیا ہو کہ دنیا میں قدر زر کتنی تیزی سے گھٹ رہی ہے اور ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ کتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

''جی؟'' اس نے مجھے متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے مہذب لہجے میں کہا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''شہریار صاحب۔'' میں نے خاموشی سے مختصر وقفے کے بعد کہا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟'' دروازہ کھولنے والا اپنے نام سن کے تھوڑا سا چونکا اور اس نے اپنی یاداشت پر شرمندہ ہو کے غور سے دیکھا۔

''میں..... معاف کیجئے گا میں پہچان تو رہا ہوں لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کچھ یاد نہیں آتا۔''

''میں سلیم ہوں۔'' میں تھوڑا سا آگے روشنی میں آکے بولا۔ رومال اب اس کے ہاتھ میں تھا۔

''سلیم احمد؟'' شہریار نے زیر لب دہرایا۔ ''وہ انشورنس ایجنٹ!''

''نہیں..... دیکھئے' میں نے ہی آپ کی بیوی کو قتل 'میرا مطلب ہے مارا تھا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

شہریار بالکل غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہوگیا۔

''تو تم..... وہ سلیم احمد ہو..... ہاں..... مگر.....''

''شہریار صاحب مجھے احساس ہے کہ..... کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر میں آگیا۔''

شہریار کا وہ چہرہ جو قناعت کی تصویر تھا عذاب کے پیکر میں ڈھل گیا۔ یادوں کے تاریک سائے اس کی صورت پر نفرت کا رنگ بن کر پھیل گئے وہ اپنی بیوی کے قاتل کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔ مجھے بار بار خیال آیا تھا۔'' میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''لیکن مجھے موقع نہیں ملا۔ آج اتفاق سے میرا گزر اس طرف ہوا۔ میں نے سوچا شائد پھر اس سے بہتر موقع نہ ملے' بات اتنی پرانی ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے آپ کے رنج و غم کا وجود نہیں رہا۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے اور صدمے کی شدت شائد اب پہلے جیسی نہیں ہوگی مگر پھر بھی میرے یہاں آنے کا مقصد اس غم کو تازہ کرنا نہیں۔''

شہریار نے سر ہلایا۔ ''پھر؟'' اس نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ''اب کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے رومال سے بے وجود پسینہ خشک کرنے کا عمل جاری رکھا۔ ''بس کچھ باتیں کرنی تھیں اگر اجازت ہو اور کوئی قباحت نہ ہو تو میں اندر آجاؤں؟'' شہریار نے بے خیالی میں سر ہلایا۔

''اب کیسی قباحت۔ آؤ..... آجاؤ۔'' وہ اور پیچھے ہٹا اور پلٹ کے چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے رہا۔ یہ متوسط طبقے کے ایک فرد کا چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں آسائش کے سب لوازمات تھے اتنی جگہ تھی کہ گھر کے مکیں آرام سے رہ سکیں اور وہ آرائش تھی جس سے دولت کا نہیں اعلیٰ ذوق اور نفاست کا پتہ چلتا تھا۔ یہ سلیقہ اور حسن انتظام بھی کسی عورت کی موجودگی کا مظہر تھا مگر ابھی تک وہ عورت نظر نہ آئی تھی۔

ہم دونوں ایک کشادہ، صاف ستھرے اور خاصے آراستہ کمرے میں جا بیٹھے جہاں ٹیلی وژن پر کوئی فلم چل رہی تھی۔ کرسی پر وہ اخبار رکھا تھا جو شہریار پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا اور کافی کا آدھا مگ رکھا تھا جو شہریار پی رہا تھا اور اگر میں مخل نہ ہوتا تو وہ میز پر پیر پھیلائے ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے کبھی اخبار کو اور کبھی ٹی وی کو دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ٹی وی کو بند کیا اور دوسرا مگ لے کر آیا۔ اس وقت تک میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے پھر شادی کرلی ہے۔'' میں اسے مگ بھرتا دیکھتا رہا۔ ٹی کوزی کے نیچے چائے دانی میں کافی اب بھی بہت گرم تھی۔ شہریار نے اقرار میں سر ہلایا اور مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ ''المیہ یہی ہے کہ ہم کمینے اور خود غرض انسان اس وقت تک محبت کے دعوے کرتے ہیں جب تک خود نہیں مرتے، مرنے والوں کو اور ان کی محبت کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔''

''تمہاری بیوی مجھے دکھائی نہیں دی؟'' میں نے بے چینی میں پہلو بدلا۔ ''بچے ہیں؟''

''دو بچے ہیں اب تو۔'' شہریار نے اپنا آدھا مگ پھر اُٹھا لیا۔ ''بڑا لڑکا اس سال آٹھویں کا امتحان دے گا۔ چھوٹی لڑکی اس سے دو سال پیچھے ہے ابھی میں نے ڈانٹ کر سلا دیا ہے دونوں کو۔ ایسی سنجیدہ فلمیں جن میں ذرا بھی ایکشن نہیں ہوتا وہ بھی خوامخواہ دیکھتے رہتے ہیں۔ ٹی وی ساری رات چلے تو ساری رات نہ اُٹھیں مگر انہیں صبح صبح اسکول جانا ہوتا ہے اور نظر بھی تو خراب ہوتی ہے۔ کافی ٹھنڈی تو نہیں ہوئی؟''

''کافی؟'' میں چونکا۔

''نہیں..... بالکل نہیں!!''

''معاف کرنا میں نے خود ہی بنائی ہے۔ بیوی ساتھ والے بنگلے میں گئی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی شادی یا مہندی کی رسم ہو رہی ہے۔ ان عورتوں کو تم جانتے ہو۔ سات سال کی بچی ہو یا ستر سال کی بڑھیا۔ شادی میں پاگل ہو جاتی ہیں۔ اب رات بھر ڈھولک بجائیں گی، ناچیں گی، گائیں گی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، رسموں کے معاملے میں سب ایک ہیں۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''اصل میں ہمارے یہاں نسوانیت کا ایک مخصوص مزاج اور سانچہ ہے۔''

''تم اپنی موجودہ ازدواجی زندگی سے بہت خوش۔ میرا مطلب ہے مطمئن ہو۔'' میں نے کہا اور مسکرایا۔

شہریار کی شگفتگی کافور ہوگئی۔ ''ہاں میں اس بات سے انکار نہیں کرسکتا۔'' یہ بات میں اس وقت بھی کہتا تھا جب نغمہ..... میری پہلی بیوی زندہ تھی۔ شائد یہ تقدیر کی رحم دلی اور مہربانی تھی کہ اس نے مجھے سلمیٰ جیسی بیوی دے کر اس سے زیادہ دے دیا جتنا مجھ سے چھینا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میرا مقصد مرحومہ کی روح کو صدمہ پہنچانا نہیں۔ وہ بھی بہت اچھی تھی۔ اتنی اچھی کہ زندہ رہتی تو شائد میں زیادہ خوش اور مطمئن ہوتا۔ خوبیاں اُس میں بھی تھیں اور اِس میں بھی ہیں۔ میرا خیال ہے اور بہت سی ایسی ہی عورتیں۔ ہوں گی جو ایسے ہی گھر آباد کرچکی ہیں یا کرسکتی ہیں مگر میں اسے قدرت کی فیاضی نہ کہوں تو کیا کہوں کہ اس نے مجھ سے ایک مثالی بیوی کو چھینا تو دوسری دے دی اگر خدا نے ایک مرد کے لیے ایک عورت تخلیق کی ہے تو میں کیا ہوں۔ بدقسمت یا خوش قسمت؟ آخر وہ بھی تو کوئی مرد ہوگا جسے ایک بھی ایسی عورت نہیں ملے گی۔''

میں غور سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شہریار یہ سب باتیں اپنے آپ سے کررہا ہے اس کی نظر ٹی وی پر رکھے کتاب کی طرح کھلنے والے چاندی کے بنے ہوئے ڈبل فریم پر تھی جسمیں ایک طرف وہ خوبصورت سوٹ پہنے کھڑا تھا دوسری جانب ایک بے حد حسین اور جاذبِ نظر نقوش کی مالک عورت دلہن کے روپ میں موجود تھی۔

''یہ شادی کی تصویر ہے۔ نو سال پرانی۔'' شہریار نے کہا۔ ''مگر سلمیٰ اب اس سے کہیں زیادہ حسین ہوچکی ہے۔''

''حسن!'' میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک احساس کا نام ہے جو دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔''

''ہاں۔ شاید۔'' شہریار بولا۔ ''میں غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کرسکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال!'' میں نے بوکھلا کر کہا اور مگ نیچے رکھ دیا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''نغمہ زیادہ حسین تھی یا سلمیٰ زیادہ حسین ہے؟'' شہریار نے کہا۔ ''تم نے تو اسے دیکھا تھا۔''

مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ ''نہیں حقیقت یہ ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔''

''پھر تم نے اسے قتل کیسے کردیا تھا۔'' شہریار نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''دیکھے بغیر؟''

''میں..... میں یہی وضاحت کرنے کے لیے آیا تھا۔'' میں نے رومال کو ماتھے پر پھیرا۔ ''گو اب اس کی ضرورت کسی کو نہیں۔ سوائے میرے۔''

''کیوں؟ تمہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟'' شہریار نے کہا۔

''اس لیے کہ جو کچھ میں نے عدالت میں کہا تھا اسے کسی نے سچ نہیں مانا تھا اور بہت کچھ میں نے اپنے وکیل کی ہدایت پر بھی کہا تھا لیکن یہاں تمہارے گھر میں جو کچھ میں کہوں گا جھوٹ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں میں سچ بول کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اندیشہ مجھے یہ تھا کہ میری صورت دیکھتے ہی تم مشتعل ہوجاؤ گے اور میری کوئی بات سنے بغیر مجھے گالیاں اور دھکے دے کر نکال دو گے۔ تم نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ مجھے اتنی مہلت دی کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ قانون نے مجھے مجرم سمجھا تھا۔''

''لیکن تمہیں وہ سزا تو نہیں ہوئی جو قاتل کو دی جاتی ہے۔'' شہریار نے طنز سے کہا۔

''ہاں۔ قانون کے فیصلے حالات کے پس منظر میں کیے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم نے بہت بڑا وکیل کیا تھا۔'' شہریار نے گالی دے کر خالی مگ کو میز پر پٹخ دیا۔ ''اس نے تمہیں بچالیا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے قید بامشقت کے تین سال کاٹے۔ تمہارا عذاب تو میری سزا سے بہت پہلے ختم ہوگیا تھا۔ غالباً ایک سال بعد ہی تم نے دوسری شادی کرلی تھی اور تمہیں معلوم ہے جیل کا ایک دن کتنا لمبا ہوتا ہے۔ خیر اس بات کو بھی جانے دو۔ یہ سزا تو مجھے ملنی ہی چاہئے تھی۔ جب میں رہا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ بعد میں میری ماں مرگئی کیونکہ جو پنشن میرے باپ کو ملتی تھی اس سے وہ پیٹ بھر کے روٹی بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں کھا سکتے تھے۔ ماں کا علاج کیسے ہوتا تم تو جانتے ہو کہ ان کا واحد سہارا میں تھا اور ان دنوں میں اور تم ایک ہی پوسٹ پر تھے۔ اب تم کیا ہو؟''

شہریار نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں ڈائریکٹر ہوں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میں تم سے سینئر تھا خیر جب میں رہا ہو کے حیدر آباد پہنچا۔ میں سکھر جیل سے رہا ہوا تھا تو میرا باپ بستر مرگ پر تھا۔ سرکاری ملازمت کے قواعد وضوابط تم سمجھتے ہی ہو۔ میں جیل جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے سرکاری نوکری کے لیے نااہل ہو گیا ہوں اور کہیں چپڑاسی تک نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عرصہ میں کبھی مجھے تمہارا خیال نہیں آیا تھا۔ آیا تھا مگر مجھے فرصت نہیں تھی اور اب چلا جاتا تو پھر نہ جانے کب فرصت میسر آتی۔ تم میری بات پر اعتماد کرو گے نا؟''

''میں..... میں کوشش کروں گا۔'' شہریار نے کہا۔

''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب..... جب میں نے گولی چلائی تو بقائمی ہوش وحواس سے نہیں چلائی تھی۔''

''یہی مؤقف تمہارے وکیل کا تھا۔'' شہریار طنز سے بولا۔ ''اس نے کہا تھا کہ تم پیہو ئے تھے۔''

میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ محض قانونی نکتہ پیدا کرنے والی بات تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی حرام شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میرے کہنے کا مقصد تھا کہ میں نے جانتے بوجھتے تمہاری بیوی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ قانون تو قسم پر اعتبار نہیں کرتا مگر یہاں صرف تمہارے سامنے میں حلف اٹھا کے کہوں تو تمہیں مان لینا چاہئے کہ سچ یہی ہے۔ مجھے اب جھوٹ سے کیا فائدہ؟..... لغہ..... تمہاری پہلی بیوی کی جان میرے ایک احمقانہ فعل کا نتیجہ تھی۔ میرا باپ مجھے عقل کا اندھا کہتا تھا۔ اس لیے کہ بچپن میں بھی سوچے سمجھے بغیر کام کرتا تھا اور نقصان اٹھاتا تھا۔ میری کھوپڑی اُلٹی تھی اور اس میں جو خیال آتا تھا وہ سیدھا بہت کم ہوتا تھا مگر میں نفع نقصان کی بعد میں سوچتا تھا قدم پہلے اٹھاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کچھ بھی کہو، غیر ذمے دار، عاقبت نااندیش، کوتاہ بیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتے کی دم والی مثال میرے جیسے لوگوں پر صادق آتی ہے حالانکہ کتے کی دم کو کسی نے بارہ سال نلکی میں رکھنے کا تجربہ نہیں کیا مگر یہ سچ ہے۔''

شہریار مسکرایا۔ ''آدمی کی فطرت واقعی نہیں بدلتی۔''

''جب میں آٹھ سال کا تھا تو میں نے آنگن میں درخت پر گرگٹ کو اپنی غلیل سے نشانہ بنایا۔'' میں نے کہا۔ ''درخت کے نیچے میری ماں ہنڈیا میں کڑھی گھوٹ رہی تھی۔ گرگٹ سیدھا ہنڈیا میں گیا اور کڑھی کے زرد رنگ میں گرگٹ کا خون مل گیا اس کے بعد میری ماں تمام عمر کڑھی نہ کھا سکی۔ اسکول میں لکڑی کے زینے کی ریلنگ پر سے پھسلنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک بار میں اوپر سے راکٹ کی طرح آیا اور ایک ہلکے پھلکے کم عمر کے بچے کو روندتا ہوا لے گیا۔ وہ اور میں ایک ساتھ نیچے گرے لیکن میں اوپر تھا مجھے کچھ نہ ہوا۔ اس بچے کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور مجھے پتہ نہیں کتنے لوگوں نے مارا۔ کلاس کے بڑے لڑکوں نے پھر ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر نے، گھر پر ماں نے اور پھر باپ نے اور آخر میں اس لڑکے کے باپ نے۔ چودہ سال کی عمر میں مجھے میرے ماموں نے چھرّے والی ایئر گن لا دی۔ جس سے چڑیاں کوّے مارتے مارتے میں نے ایک روز دودھ والے کو زخمی کر دیا۔ نشانہ میں نے اس کے گھڑے کا لیا تھا وہ باڑے کا خالص دودھ مٹکے میں لے کر آتا تھا میں نے سوچا اس میں چھرّے سے جتنے سوراخ ہوں گے اتنی ہی دودھ کی دھاریں نکلیں گی اور اس منظر کے تصور نے مجھے عملی قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا مگر چھرّے کے گھڑے کے بجائے اس کی گردن میں لگے جس سے مٹکا گر کر پھوٹ گیا اور دودھ والے کی گردن سے خون پھوٹ پڑا۔ وہ چیختا دہاڑتا میرے باپ کے پاس فریادی بن کے پہنچا اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا یعنی جوتا کاری کا طویل عمل۔''

شہریار بے ساختہ ہنسا۔ ''بچے بعض اوقات جلیلے پن میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ دو کا خون تم پہلے بہا چکے تھے بلکہ گرگٹ سمیت تین کا۔''

''ہاں کبھی نہ کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بعد میں میرے باپ نے ائیر گن چھین لی اور خنجر تو درکنار مجھے پنسل تراشنے کے لیے کسی چاقو تک رکھنے سے منع کر دیا۔ وہ کہتا تھا یہ لڑکا تو خونی ہے۔ کسی روز سچ مچ کسی کو خون کر دے گا اور ہماری عاقبت خراب کرے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے کہا۔ ''عاقبت کا تو مجھے علم نہیں لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ تقدیر نے سچ کر دکھایا۔ آپ کی بیوی کی موت تو بہت بعد میں پیش آنیوالا آخری حادثہ تھی اس سے پہلے کالج میں یہ ہوا کہ کرکٹ میں بیٹنگ کرتے ہوئے میں نے چھکا مارنے کے لیے بیٹ گھمایا۔ گیند نکل گئی اور بیٹ میرے ہاتھ سے نکل کر مڈ آف پر مجھ سے چند گز دور کھڑے ہوئے مخالف ٹیم کے کپتان کے منہ پر جالگا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔ دوسری ٹیم والوں نے میری ٹھکائی لگائی پھر میری ٹیم بھی میدان میں آ گئی اور بڑا گھمسان کا رن پڑا جس میں امپائر سمیت سب پٹے۔ وہ معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا کیونکہ دانستہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔''

''معاف کرنا میں تمہیں سگریٹ پیش نہیں کر سکتا۔'' شہریار نے کہا۔ ''میری بیوی نے یہ عادت چھڑا دی ہے اور بہت سی غلط عادتوں کے علاوہ۔''

''بیویاں سب سے چھڑا دیتی ہیں۔'' میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''میرے پاس اپنے سگریٹ ہیں۔'' میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر سے جلائی۔ ''بات میں اس دن۔۔۔ اس منحوس دن کی کرنا چاہتا تھا لیکن جو کچھ اس روز ہوا وہ میرے ماضی کے پورے کردار کو سامنے رکھے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہ باتیں میں نے عدالت میں کہاں بتائی تھیں۔ میں خود کو عقل کا اندھا اور اتنا عاقبت نااندیش ثابت کرتا تو مجھے حالات کی رعایت کہاں ملتی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ایک پارٹی میں شریک تھے۔ تمہیں یاد ہوگا ہمارے ساتھ ایک اور پٹھان افسر تھا۔ اس کی شادی کا ولیمہ تھا۔ مجھے نام یاد نہیں آ رہا ہے اس کا۔ شیر محمد خاں یا شیر باز خاں۔ اس نے مجھے ایک ریوالور دکھایا کہ یہ وزے کا بنا ہوا ہے۔ بتاؤ اس میں اور دلائتی ریوالور میں کوئی فرق ہے۔ میں نے ریوالور لے کر دیکھا اور پٹھان کاریگروں کے ہنر کی تعریف کی۔ اس کا توازن دیکھنے کے لیے میں نے ریوالور کھلی کھڑکی سے باہر رکھتے ہوئے نشانہ لیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ریوالور خالی ہے لیکن اسے خود معلوم نہ تھا کہ چیمبر میں ایک گولی موجود ہے۔ میں ریوالور کا ٹریگر دباتا گیا اور کسی خاص سمت میں دیکھے بغیر فائر کرتا گیا۔ جب آخری چیمبر کی گولی کا دھماکہ ہوا تو میں اُچھل پڑا۔ میرے ہاتھ میں بھی شدید جھٹکا آیا تھا کیونکہ میں فائر کے لیے تیار نہ تھا۔ میرا دوست گھبرا گیا۔ اس نے مجھ سے ریوالور چھینا اور بھاگ گیا۔ وہ وزے سے غیر قانونی طور پر لایا ہوا ریوالور تھا اور میرے دوست کے پاس اس کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ گولی کی آواز کے بعد کسی عورت کی چیخ سنائی دی تھی اور میں نے اوپر سے دیکھا تو نیچے مہمانوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ میرا دوست کہنے لگا یار غضب ہو گیا گولی کسی عورت کو لگ گئی ہے۔ اس وقت تک ہم دونوں میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ عورت کون ہے۔ میرے دوست نے کہا یار جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میرا نام مت لینا کہ میں نے ریوالور دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں گولی نہیں۔ صرف ایک دن پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ وہ بھی پھنس جاتا۔ میں نے کہا اور کیا کہوں وہ بولا کہہ دینا ریوالور یہاں پڑا تھا اتنے مہمان جو شادی میں شرکت کے لیے پشاور، کوہاٹ، مروان اور بنوں سے آئے ہیں ان سب کی موجودگی میں کسی ایک پر الزام نہیں آ سکتا۔ تم کہنا کہ پستول کو خالی سمجھا تھا میں تمہیں بچالوں گا۔ میں ہکا بکا اور ذہنی طور پر مفلوج کھڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ نادانستگی میں ہی سہی مگر میں نے ایک قتل کر دیا ہے۔ ایک جیتی جاگتی عورت کو مار دیا ہے۔ میں وہیں کھڑا تھا کہ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور میں نے وہی کہہ دیا جو میرے دوست نے کہا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تمہاری بیوی تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے۔ یہی کہ اس کی قضا آ گئی تھی۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا اسے میرے ہاتھوں اسی طرح مرنا تھا۔ وعدے کے مطابق بعد میں میرے دوست نے میری بہت مدد کی۔ اس نے پولیس کو دے دلا کر سب مشتبہ مہمانوں کو پکڑنے سے باز رکھا جو اس کے مہمان تھے۔ تم جانتے ہو مہمان کی عزت پر تو پٹھان جان دے دیتے ہیں۔ وکیل وغیرہ بھی اس نے کئے تھے اور بیچارا جب تک یہاں رہا مجھ سے ملنے کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ باقاعدگی سے جیل آتا رہا آجکل دوبئی میں ہے۔ میں اپنی مقدس ترین چیز یعنی اپنے ضمیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ایک حادثاتی قتل تھا۔ غیر ارادی اور میری اسی احمقانہ عاقبت نااندیشی کا نتیجہ۔ ریوالور خالی ہو تب بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خلا میں آسمان کی طرف رُخ کر کے گولی چلانی چاہیے۔ اس وقت جب یہ حادثہ پیش آیا تو میری حالت ایسی تھی جیسے میں واقعی نشے میں ہوں۔ مجھے اپنا ہوش بالکل نہ تھا۔ بعد میں وکیل نے اسی نکتے پر میری جان بچالی مگر یہ جھوٹ مجھے اس عذاب سے تو نہیں بچا سکتا تھا جو میں نے تین سال کے شب و روز کے ہر لمحے میں جھیلا۔ جرم سے زیادہ یہ احساسِ گناہ تھا جس سے مفر نہ تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کیا جو ایسے ہی حادثات سے بھری پڑی تھی اور مجھے اپنے باپ کی بات اکثر یاد آتی جس نے کہا تھا کہ یہ لڑکا کسی روز سچ مچ کوئی قتل کر دے گا۔ دنیا کی طرح انھوں نے بھی یقین نہیں کیا کہ میں نے اس عورت کو بلا وجہ مار دیا' جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی مجھ سے جیل میں ملنے تک نہیں آیا تھا سوائے اس دوست کے جس کی بیوی میری شکر گزار تھی کہ میں نے اس کا سہاگ بچالیا اور ان کے خاندان کی عزت بچالی۔ میرے لیے یہ خیال بھی باعثِ آزار تھا کہ میرے والدین سے بیٹا ہی نہیں چھنا معقول آمدنی کا ایک ذریعہ بھی چھن گیا۔ اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھاتے ہوں گے اور کیسے گزارا کرتے ہوں گے۔ میں نے طے کیا کہ سارا قصور میری لاأبالی فطرت کا ہے۔ مجھے دنیا میں رہنا ہے تو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا اور عجلت میں آگے پیچھے دیکھے بغیر قدم اُٹھانے کی عادت بلکہ فطرت کو بدلنا ہوگا۔ فطرت کو بدلنا آسان کام نہیں مگر آدمی قوتِ ارادی سے کام لے تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ قوتِ ارادی کی کمی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

''اب یہاں آ کے مجھے یہ سب کچھ بتانے کا مقصد کیا ہے؟'' شہریار نے موقع پاتے ہی پہلو بدلا اور اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ کے جماہی لی۔ ''پتا نہیں تسلّی کب آئے گی؟''

''میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں میرے ارادے کو ایک فیصد بھی دخل نہیں تھا'' میں نے کہا۔

''مجھے اب تمہاری بے گناہی میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔'' شہریار نے کہا ''جو ہوا اسے تم بھی بھول جاؤ۔''

''میں ایسے نہیں بھول سکتا شہریار صاحب'' میں نے کہا۔ ''جب تک آپ مجھے صدقِ دل سے معاف نہیں کر دیتے میں قانون کا نہیں آپ کا مجرم ہوں۔''

شہریار میری صورت کو غور سے دیکھتا رہا کہ میں تین سال کی قید بامشقت کاٹنے کے باوجود اپنے ضمیر پر ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا اور واقعی شرمندہ تھا۔ خود اپنی نظر میں گناہ گار تھا اور نادانستگی میں سرزد ہو جانے والے جرم پر اب اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور میرے پاس آ گیا۔ ''اگر تم اس سے مطمئن ہو سکتے ہو دوست تو میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی کدورت نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے دبایا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اس کی بہت کم امید تھی۔'' میرا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ ''لیکن آپ واقعی فراخدل اور عظیم آدمی ہیں۔ میں اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور نیا آدمی محسوس کر رہا ہوں۔''

''گنہگار ہم سب ہیں غلطی ہم سب کرتے ہیں۔'' شہریار نے کہا۔ ''مگر خدا نیت کا حال جانتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ مجھے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی۔ میں بہت خوش تھا اور بہت جوش میں تھا۔ میں نے دیکھے بغیر کار کو تیزی سے ریورس گیئر میں ڈال کر واپس کیا۔ کسی عورت کے چیخنے کی آواز اس وقت آئی جب کار اس سے ٹکرا چکی تھی اور دیو پیکر کار کے پہیے جھٹکا کھا کر اس کے اوپر سے گزر چکے تھے۔ میں نے شہریار کے چلانے کی آواز بھی سنی اور گھبرا کے نیچے اُترا۔

کار کے نیچے ایک حسین عورت مری پڑی تھی۔ اس کا بھاری سرخ جوڑا جو اس نے شادی کی رسم کے لیے پہنا تھا لہو سے تر ہو گیا تھا اور اس کے مہندی لگے ہاتھ فریاد طلب انداز میں پھیلے رہ گئے تھے۔ وہ ساتھ والے بنگلے سے آئی تھی اور وہی عورت تھی جس کی تصویر گھر کے اندر ٹی وی پر چاندی کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مشہور صحافی اور داستان گو کے قلم کی دوسری عبرت نظیر تحریر

گھاؤ

جاوید راہی

اِک عورت کی ستم ظریفی کی داستانِ حیرت

گوتم بدھ نے کہا تھا کہ زندگی دکھوں کا گھر ہے ہستری کی کتاب میں پڑھا مگر کوئی بات پلے نہ پڑی۔ میری بربادی کا آغاز اسی روز سے شروع ہو چکا تھا جب میں چھٹی کلاس میں پڑھ رہی تھی میرے گھر والوں کا شمار محنت مزدوری کر کے بچوں کو پالنا اور سفید پوشی کو برقرار رکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ میرے والد شہر میں دوکان کرتے تھے یوں ہمارے گھر کی گزر اوقات ہوتی۔ ہم بہنیں بھائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کچھ خواب ماں باپ دیکھ رہے اور کچھ ہم بن رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا میرے والد گھر پر کام کر رہے تھے کہ ایک شخص جو شکل وصورت سے انتہائی شریف انسان دکھائی دیتا تھا میرے والد صاحب کے پاس آ کر رکا، پہلے تو گھر والوں نے سمجھا کوئی کام ہوگا اسے مگر چند پل بعد وہ سیدھا اندر چلا آیا میں گھر کے کام میں لگی ہوئی تھی۔ اس شخص کو اچانک اندر پا کر بڑی پریشانی ہوئی مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ یہ صاحب جن کا نام فاروق ہے ہمارے دور کے رشتہ داروں میں سے ہیں اور اسی شہر میں کسی کام کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں اور مجھے دیکھنے کی غرض سے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

ہمارے گھر آئے ہیں کیونکہ میرا رشتہ اپنے لیے مانگ رہے تھے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے دیکھ لیا بات یہاں ختم ہو گئی میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔

دونوں خاندانوں میں ہمارے رشتوں کی بات چلتی رہی میں نے میٹرک پاس کرلیا اور گھر میں بیٹھ گئی اس کے بعد گھر کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے نوکری کرلی۔ بچوں کو تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی کا کام بھی سکھاتی رہی اسی دوران میری منگنی فاروق سے ہوگئی۔ میری شادی جس حالات میں انجام پائی اس کا ذکر کرنا اس لیے مناسب نہیں کہ عزت والے لوگ اپنی لڑکیوں کو بس اپنے گھر سے چلتا کرتے ہیں میرے سسرال والوں نے بھی اسی پر اکتفا کیا کہ مجھے بیاہ کر ہی لے گئے۔ میں نے اپنے میاں کے گھر کا ماحول دیکھا اور خود پر جبر کرتے ہوئے نبھا کرنے پر تیار ہوگئی۔

میری ہر ممکن کوشش ہوتی کہ میں کسی کو شکایت کا موقع نہ دوں مگر میری ساس روایتی ساس سے بھی زیادہ سنگدل واقع ہوئی۔ میرے میاں جو ابھی تک زیر تعلیم تھے ان کی حوصلہ افزائی پر میں ہر طرح کے ستم ہنس کر سہہ جاتی میرے ساتھ یہاں تک سنگدلی کا مظاہرہ کیا جاتا کہ افطاری پر سارا گھر برف والے مشروبات سے افطاری کرتا مگر میں اپنے کمرے میں خدا کا لاکھ بار شکر ادا کرتے ہوئے گھڑے کے اُبلے پانی سے روزہ کھولتی۔ سارے گھر کا کام میرے ذمہ ہوتا، میرے سسر جو انتہائی سفاک انسان تھے میری حالت پر برہم ہو جاتے اور مجھ پر طعنہ زنی کی بوچھاڑ کر دیتے، میں تڑپ اٹھتی اور اپنے ناکردہ گناہ کی سزا تصور کر کے چپ ہو جاتی۔

سُنا کرتی تھی کہ کچھ سسر نام کے سسر ہوتے ہیں اندر سے وہ شیطان صفت ہوتے ہیں اس کی مثال مجھے اپنے گھر میں نظر آتی تھی۔ میرا دیور مجھے اپنی طرف راغب کرتا جبکہ سسر صاحب کی عنایت اپنے اندر کسی اور جہان کی خبر دیتی۔ میں ثبت قدم کانٹوں پر رینگتی رہی مگر شکوہ تک نہ کیا میرے شوہر اسی دوران لاہور شفٹ ہوگئے انہیں کام مل گیا تھا اور میں ایک بیٹے کی ماں بن گئی اب میں نے اپنے بیٹے کی خاطر جینا سیکھ لیا تھا۔ گھر میں جو وقت ملتا وہ دوسروں کے کپڑے وغیرہ سی کر اپنی ضروریات پوری کرتی۔ میرے شوہر جو کماتے اپنے ماں باپ کے ہاتھ پر لا کر رکھتے اس گھر میں میری حیثیت ایک کام کرنے والی کی سی تھی اگر کسی کے کام میں کوتاہی ہوتی تو میرے شوہر میرا جینا حرام کر دیتے ان کا رویہ میرے لیے بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ فاروق کا یہ انداز میرے لیے رہی سہی قوت برداشت کو بھی ختم کر گیا میں اس گھر میں فضول چیز سمجھ کر پھینک دی گئی میں نے اپنے گھر والوں کو سارے حالات سے آگاہ کیا جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے کئی ماہ تک میرے شوہر اور اس کے گھر والوں نے میرا حال تک نہ دریافت کیا آخر مجبوراً مجھے خود ہی اپنے شوہر کے گھر جانا پڑا۔

میں اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے اپنے کمرے میں پڑی رہتی میرا شوہر آتا بھی تو اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں میں زیادہ وقت صرف کرتا میرا شوہر جو تعلیم کے ساتھ ساتھ شہر میں کسی جگہ ٹیوشن پڑھانے کا کام بھی سرانجام دیتا تھا جس گھر کے بچے پڑھاتا تھا اسی گھر میں اسے رہنے کے لیے جگہ بھی مل گئی تھی پہلے تو گاؤں آجاتا تھا پھر اس نے یہ سلسلہ بھی بند کر دیا۔ اس کے سارے گھر والے اسے شہر جا کر مل لیتے جب واپس آتے تو اس گھر کی مالکن کی بہت تعریف کرتے میرے دل میں ایک عورت کا دل تھا میں اپنی تباہی کا منظر اپنے ذہن کے کینوس میں آہستہ آہستہ بن رہی تھی۔

ایک روز میرے شوہر آئے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر شہر آگئے یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر کی مالکن کو زچگی کے مراحل سے دوچار ہونا تھا اور مجھے اس کی خاطر داری کے لیے لایا گیا تھا۔ مجھ پر جلد یہ انکشاف ہوگیا کہ میرا شوہر کیوں گاؤں آنا پسند نہیں کرتا تھا ٹیوشن کی آڑ میں گھر کی مالکن کو پڑھانے میں مصروف تھا۔ وہ میری موجودگی میں کھانا اکٹھے کھاتے وہ عورت ذرا سا بیمار ہو جاتی تو میرا شوہر رات گئے تک اسے دباتا اور مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیتا۔ میں اپنے سامنے اپنی بربادی کا تماشا دیکھتی اور منہ سے کچھ نہ بولتی۔ جب میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھے وہ گاؤں چھوڑ آئے وہ بھی شائد اسی انتظار میں تھا فوراً مجھے تیار کرایا اور گاؤں لے آیا تمام راستے وہ بات بات پر میری بے عزتی کرتا آیا۔

گھر آئی تو اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھی وہ بیمار پڑا تھا۔ میں دوسرے گھر میں غیر بچوں کی دیکھ بھال میں لگی تھی اُدھر میرا بیٹا سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا میرا بیٹا جو باپ کی شفقت کو ترس گیا تھا اپنے باپ کو سامنے پا کر ایک دم اس کی جانب لپکا مگر اس سنگدل انسان نے یہ کہہ کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پیچھے کر دیئے کہ کیا اپنا انفیکشن دوسروں کو دینے کا ارادہ ہے؟ جتنی دیر تک وہ رُکا اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے باتیں کرتا رہا میں اپنے بیٹے کی حالت پر اتنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پریشان تھی کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے دو تین بار اپنے شوہر سے کہا کہ منے کی حالت بہت خراب ہے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں اس نے بات سنی اَن سنی کر کے اپنے چھوٹے بھائی کی ذمہ داری میں دے دیا۔ میرا شوہر شام تک رکا پھر واپس چلا گیا میں نے اپنے گھر والوں کو لکھا اور میری والدہ مجھے اور میرے بیٹے کو ساتھ لے آئی۔ یہاں آکر میرے غریب والدین نے دن رات ایک کر کے میرے بیٹے کا علاج کروایا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ میری والدہ اور میری خالہ میرے شوہر کے پاس گئیں اور اسے سمجھایا کہ تم جس آگ سے کھیل رہے ہو وہ تمہارا سب کچھ جلا کر راکھ کردے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا اُس عورت نے میری والدہ اور خالہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میرے شوہر نے اس عورت کی طرفداری کرتے ہوئے میری والدہ کو مارنا شروع کر دیا میری والدہ کی بزرگی کا اس شخص کو خیال نہ آیا میری والدہ آنسو بہاتی واپس آگئی۔

میں کئی ماہ تک اپنے ماں باپ کے گھر رہی میرے سسرال والوں کی جانب سے نہ کوئی آیا اور شاید نہ ہی کسی کو آنا تھا۔ میرا باپ اس صورتحال سے اتنا پریشان تھا کہ اکثر انہیں میں نے رات کو اپنی چارپائی پر پڑے روتے دیکھا میری وجہ سے میری دوسری بہنیں بھی پریشان تھیں۔ میں نے اپنے والد سے اجازت طلب کی کہ وہ تو مجھے نہیں لینے آئیں گے میں بھائی کو ساتھ لے کر چلی جاتی ہوں بہرصورت اب زندگی کا سفر طے تو کرنا ہے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر بھائی کے ہمراہ گاؤں چلی آئی پورے گھر کے لوگ ہمارے آنے سے بیزار سے نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سب کی پروا کیے بغیر سارے گھر کے کام کاج پھر سے سنبھال لیے میرا بھائی مشکل سے ایک دو روز ٹھہرا اور واپس چلا آیا میرے دیور کو میرے آتے ہی بھیج دیا گیا کہ وہ میرے شوہر کو گاؤں لائے۔

زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا میرا شوہر چوتھے روز گاؤں آگیا دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے مجھے بالوں سے پکڑ لیا اور میرے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی اور گندی گالیاں نکالنا شروع کر دیں کہ اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ میرے سسر اور دیور بھی میرے شوہر کی طرفداری کر رہے تھے۔ میرا سسر طلاق دینے پر زور دے رہا تھا میرا بیٹا سہم کر دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، جب میرا شوہر مجھے مارتے مارتے بے دم ہو گیا تو مجھے گھسیٹ کر سب سے آخر والے کمرے میں لے آیا دوپٹے سے میرے بازو پشت پر باندھ دیئے اور چارپائی پر پھینک دیا۔ اس کے دل کا زہر اس کی زبان سے بہہ نکلا وہ کہہ رہا تھا کہ فریدہ اگر تم نے مجھے دوسری شادی کی اجازت نہ دی تو میں تمہارا خون کر دوں گا۔ اب میرے ذہن میں اس درندہ صفت انسان کی بات آئی کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا تھا میں اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو کیسے آگ لگا سکتی تھی؟ میں اس کے آگے تن گئی کہ میرے جیتے جی یہ کبھی نہیں ہو سکتا وہ مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

میں اپنے خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گئی کہ اگر میرے نصیب میں یہ کچھ لکھا ہے تو پھر گلہ کیسا؟ رات کے اندھیرے پھیل رہے تھے کہ میرا شوہر پھر آگیا اب اس کا رویہ کچھ نرم تھا۔ میں اس کے لہجہ کا بدلا ہوا رنگ محسوس کر کے سمجھ گئی کہ اب یہ اس کی نئی چال ہے میں نے اس کے ارادوں کو سختی سے جھٹک دیا اور وہی جواب دیا جو پہلے دے چکی تھی۔ وہ پھر آگ بگولا ہو گیا اور مجھ پر لاتوں، گھونسوں کی بارش شروع کر دی اور باہر نکل گیا جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل تھی جو اس نے مجھ پر چھڑک دی۔ میرے سامنے موت کا خوفناک تصور رقص کرنے لگا میرے شوہر نے ماچس کی تیلی نکالی اور کھینچ کر مجھ پر اُچھال دی۔ ایک دم میرا جسم آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو گیا میرے منہ سے دلخراش چیخوں کی آواز سن کر باہر لوگ اکٹھے ہو گئے۔ میرا سسر جلدی سے اندر آگیا اور مجھ پر رضائی وغیرہ پھینک کر آگ پر قابو پالیا میں موت و زندگی کی کشمکش میں پھنسی بے ہوش ہو چکی تھی۔ میرے شوہر وغیرہ نے باہر یہ بات مشہور کر دی کہ میں بتی جلاتے ہوئے جھلس گئی ہوں مجھے گاؤں سے شہر لایا گیا اور ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے زیر علاج رکھا گیا، جب تھوڑی سی چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو فوراً گاؤں لے آیا گیا تاکہ میں کسی پر آگ لگانے کا راز افشاں نہ کر دوں کہ مجھے قتل کرنے کی نوبت کیوں آئی۔

اس طرح دو ماہ گزر گئے میری نگرانی ہوتی رہی، میرا چہرہ مکروہ اور خوفناک بن چکا تھا میں سارا دن چادر میں منہ چھپائے پڑی رہتی میرے گھر والوں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ مجھے ساتھ لے آئے میں اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے آئی، میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب فاروق کے پاس کبھی نہ جاؤں گی اپنے گھر آکر میں نے اسکول میں نوکری کر لی۔ میرے میاں نے میرے پیچھے کئی الزام لگا کر طلاق بھیج دی، میں اس آخری گھاؤ کو بھی مقدر کا لکھا جان کر سہہ گئی میرا بیٹا اب بھی مجھ سے اپنے ابو کو ملنے کے لیے ضد کرتا ہے میں اس کے ننھے منے جملوں کا زہر اپنی ممتا میں سمیٹ کر تڑپ اٹھتی ہوں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشہور صحافی اور داستان گو کے قلم کی تیسری عبرت نظیر تحریر

ایک تھی عظمیٰ

جاوید راہی

ایک نرس کی دردناک کتھا، جس کی قیمت میں صرف ستم ہی ستم درج تھے

جیل میں قیدی خواتین تک رسائی حاصل کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ بڑی تگ و دو کے بعد مجھے 302 کی ملزمہ عظمیٰ سے ملنے کا آخر کار موقع مل ہی گیا۔ میرے سوال پر اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مجھ سے سوال کیا:

''راہی صاحب کیا میرے مقدمے پر اس صورتحال کا کوئی بُرا اثر تو نہیں پڑے گا؟''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''یہ ملک کا بہت بڑا پرچہ ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں چھپی آپ کی حقیقت بیانی کسی ذمہ دار آفیسر کی نظر سے گزرے اور آپ کو انصاف مہیا ہو جائے۔'' میری تسلی پر اس نے کہنا شروع کیا۔

''سوچتی ہوں اپنی بربادی کی داستان کہاں سے شروع کروں۔

میرے والد جو پوسٹ ماسٹر کی نوکری سے ریٹائر ہو کر اب ہمارے محلّہ میں ہی چھوٹا سا جنرل سٹور چلا رہے ہیں نے ہم تین بہن بھائی کو اعلیٰ تعلیم دِلوانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر نصیب نے نہ ہمارا ساتھ دیا اور نہ ہی میرے والدین وہ خواب دیکھ سکے جو انہوں نے کبھی سوچے ہوں گے میں اپنے گھر میں بڑی تھی مجھ سے چھوٹا کاشف اور اس سے چھوٹی رفعت۔ والدہ صاحبہ چونکہ تعلیمی زیور سے محروم تھیں والد صاحب اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ ہمارے لئے ٹیوشن کا انتظام کرتے ہمارا تعلیمی معیار بس برائے نام ہی تھا ہم بہن بھائی خود ہی اپنی کوشش سے پڑھائی میں مصروف رہتے یا پھر والد صاحب ہمیں تھوڑا بہت وقت نکال کر پڑھا دیتے۔ کاشف تو مشکل سے میٹرک کر سکا جسے ابو نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد پوسٹ مین بھرتی کروا دیا میں نے ایف۔ ایس۔ سی کر کے میڈیکل میں داخلے کے لیے بہت ٹکریں ماریں مگر بے بس ہو کر بیٹھ گئی۔ رفعت نویں میں پڑھ رہی تھی مگر اس کا دل بھی پڑھائی سے اچاٹ سا لگتا تھا میں گھر میں بیکار بیٹھی کڑھتی رہتی کہ میں اپنے والدین کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ میری ایک سہیلی سلمیٰ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں میڈیکل میں تو نہیں جا سکی مگر ایک راستہ ہے دُکھی انسانیت کی خدمت کا کہ تم لیڈی ہیلتھ وزیٹر (LHV) کا کورس کر لو۔ اس کی بات میرے دل کو اچھی لگی اور میں نے اپنے ابو سے اس سلسلہ میں بات کی انہوں نے میری خواہش کے پیش نظر داخلہ دلوا دیا۔ ہوسٹل کا ماحول میرے لیے اجنبی تھا مگر میں نے خود کو یہاں ڈھال لیا۔ تین ماہ پی۔ ٹی۔ ایس میں لگے اس کے بعد میری ڈیوٹی ہسپتال میں لگ گئی ہسپتال کا اصول نرسنگ سکول سے قدرے مختلف تھا۔ یہاں ڈیوٹی کے دوران کچھ آزادی تھی اور پھر دوسری بات یہ تھی کہ ہمیں سٹوڈنٹس کی حیثیت سے ہر کسی کی بات کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ لیبر روم میں ڈیوٹی لگے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرا تیسرا روز تھا اور حسب سابق ڈاکٹر طارق لیبر روم میں چھٹے کیس کو نپٹانے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''سسٹر آپ پریشان تو نہیں؟'' میں کوئی جواب دیئے بغیر سامان درست کرنے لگی۔ وہ پھر مخاطب ہوئے۔

''سسٹر یہ آخری کیس کر کے کھانے کے لیے چلتے ہیں۔ میں اس بار بھی خاموش رہی اور کام کرتی رہی۔ ڈاکٹر طارق بھی سٹوڈنٹ تھے اور ان کی ڈیوٹی بھی کچھ روز قبل لیبر روم میں لگی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر طارق مجھ سے ضرورت سے زیادہ فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اپنے غریب ماں باپ کی عزت کا بھرپور احساس تھا۔ اس لیے میں ڈاکٹر طارق کی بے باک باتوں کے جواب میں صرف خاموش رہتی کہ ڈاکٹر طارق خود بخود اپنی سوچ کو بدل لیں گے۔

میں ڈیوٹی سے آف ہو کر نیچے لان میں آ کھڑی ہوئی تا کہ سکول کی گاڑی میں واپس جا سکوں ابھی گاڑی نہیں پہنچی تھی اور دوسری لڑکیاں بھی اِکا دُکا نیچے آ رہی تھیں۔ اتنے میں میرے قریب ڈاکٹر طارق آ کر رُکے۔ انہوں نے پہلی بار میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا۔

''مس عظمیٰ میں آپ کو وارڈ میں تلاش کر رہا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ میں آپ کو چائے پلانا چاہتا تھا۔'' ''آئیں'' کہتے ہوئے ڈاکٹر طارق ہسپتال کی کنٹین کی طرف بڑھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دوں وہ اصرار کرنے کے سے انداز میں بولے۔

''مس یہ چائے میں آپ کو اپنے پہلے آپریشن کی خوشی میں پلا رہا ہوں۔'' میں نے بہانہ پیش کیا۔

''میری گاڑی آنے والی ہے۔''

''آپ کی نہیں نرسنگ سکول کی گاڑی اور وہ آپ کا انتظار کرنے کی پابند ہے اور پھر وہ کنٹین کے پاس ہی رُکتی ہے اس لیے فکر کی ضرورت نہیں۔'' چائے پر تکلف تھی مگر ڈاکٹر طارق کی باتیں تکلف کی حد عبور کرتی جا رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ڈاکٹر طارق نے مجھے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میرے اندر بھی ایک تحریک نے سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اگر ڈاکٹر طارق نظر نہ آتے تو میں ان کو تلاش کرنا شروع کر دیتی۔ چھ ماہ کے طویل عرصہ میں ڈاکٹر طارق کے اصرار پر میں نے ایک چھٹی اپنی ڈائری میں پرمٹ کروائی اور ہم دونوں تمام دن پارکوں اور مشہور مقامات پر گھومتے رہے کھانا ہوٹل میں کھایا اور پکچر ہاؤس میں فلم بھی دیکھی۔ واپس ہوسٹل آ کر میں سارے دن کی گفتگو کے بارے میں سوچتی رہی مجھے ڈاکٹر طارق کی باتیں مسلسل متاثر کرتی جا رہی تھیں۔ میں اکثر ڈاکٹر طارق کے ہمراہ آنے جانے لگی تھی اور ایک روز میں ڈاکٹر طارق کے ہمراہ جذبات کی رو میں بہہ کر بہت ہی دور چلی گئی۔ اور پھر اُس کی محبت کے سمندر میں ڈوب کر اپنے آپ سے اور اپنے خاندان کی عزت سے بیگانہ ہو گئی، آہستہ آہستہ ڈاکٹر طارق کا رویہ ایک دم تبدیل ہونے لگا وہ

Downloaded From Paksociety.com

مجھ سے بات کرتے کرتے ایک دم سے چونک جاتا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُٹھتا اور یہ کہہ کر وارڈ میں چلا جاتا کہ ابھی آیا مگر وارڈ کا کہہ کر وہ نرسوں کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ میں اس کا یہ انداز محسوس کر کے تڑپ اُٹھتی۔ حالانکہ مجھ میں بکھر کر دوبارہ سنبھل کر چلنے کا عزم پکا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا دھارا تلخ ایام سے منسوب کرتے ہوئے اس حادثہ کو اپنی لغزش سمجھ کر خود کو اس کا سزاوار تصور کر لیا تھا مگر میرے اندر جو جذبوں کی جھوٹی سچی تحریک تھی اس کے آگے میں بے بس ہو جاتی ایک روز میں وارڈ میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آفس کی طرف آ رہی تھی کہ سامنے ڈاکٹر طارق روزی کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا روزی اسٹاف تھی اور ڈاکٹر طارق سے بہت فری تھی میرے اندر نہ جانے کون سی حس نمودار ہوئی اور میں آپے سے باہر ہو گئی جب ڈاکٹر طارق میرے قریب لمحہ بھر کو رُکا میرا ہاتھ فضا میں خاصی گونج چھوڑ گیا روزی جو اس اچانک حملہ کے لیے تیار نہ تھی گھبرا کر آگے بڑھ گئی اور ڈاکٹر طارق ہونق بنا میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ میرے منہ سے زہریلا فقرہ اُبھرا۔

''مکار انسان ابھی کس کس کو اور برباد کرو گے۔'' کہتی ہوئی میں بھاگ کر اپنے آفس میں آ بیٹھی آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے میری روم میٹ مقدس نے آ کر میرا شانہ ہلایا اور وہ میرے دُکھ کو جانتی تھی اس کے سمجھانے پر میں بڑی مشکل سے سنبھلی اور اس کے ہمراہ واپس جانے کے لیے تیاری کرنے لگی مڈوائفری کا کورس پاس کرنے کے بعد میری ڈیوٹی نرسنگ سکول کی ڈسپنسری میں لگ گئی۔ میرے احساسات کا تاج محل تو ڈاکٹر طارق نے چور چور کر ڈالا تھا اب تو میرے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ میں دُکھی انسانیت کے لئے یکسوئی سے کام کروں وقت کی دھول نے میرے سارے خواب گرد آلود کر دیئے تھے۔

مردوں کی فطرت کے بارے میں جو میں نے دوسروں سے سنا تھا اس کا مشاہدہ میں خود کر بیٹھی تھی اس لیے ہر کام میں کیڑے نکالنا میں نے اپنی عادت میں شامل کر لیا میری اس عادت سے باہر کے لوگ تو نالاں تھے ہی گھر والے بھی بیزار ہو گئے۔ مردکی بے اعتنائی کے سبب میری پرسکون زندگی میں گہری مایوسیاں نمودار ہو کر میرے اعصاب کو ہر وقت اپنے جال میں جکڑے رہتی تھیں۔ ایل۔ ایچ۔ وی کا کورس میں نے جس اذیت سے پاس کیا وہ میں ہی بہتر جانتی ہوں۔ سرکاری ملازمت کے لئے بھی کئی مردوں سے واسطہ پڑا۔ جو مجھے دوسرے جہان کے افسانے سنانے میں پیش پیش نظر آئے اسی دوران میرے والد نے شہر کی ایک سماجی تنظیم کے ایک خیراتی ہیلتھ سنٹر میں مجھے ملازمت دلوادی۔ یہاں مجھے کئی ایک نورانی چہروں سے واسطہ پڑا جو بظاہر تو انسانیت کی اعلیٰ معراج کے علمبردار تھے مگر جب ان کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو چہروں کی نقاب کشائی کے بعد ان میں صرف زیرِ زبر کا فرق نکلا ورنہ بات وہی تھی، میں اس سماجی تنظیم کے عہدیداران کی ناز برداریاں نہ اُٹھا سکی اور مجھے نکمی اور بدکلام ہونے کی پاداش میں نکال دیا گیا۔ میں حیران تھی کہ وہ کونسا ایسا دن ہے جو میری زندگی کے اوراق میں ایک نیا باب رقم کر گیا ہو گا۔ میرے دور کے ایک رشتہ دار کو ہمدردی ہوئی اور وہ میرے لئے بڑے پریشان رہنے لگے اکثر ہمارے گھر آ نکلتے اور کئی کئی روز اپنی نوازشات کے نشتر میری رگوں میں اُتارتے رہتے وہ کچھ عرصہ سعودی عرب میں رہ کر آئے تھے اور اکثر ہمارے والد صاحب سے وہاں کے حالات اور پیرامیڈیکل اسٹاف کی آمدن کے خواب دکھاتے رہتے۔ میں اس کی آنکھوں کی بھوک اور منہ سے ٹپکتی رال کو دیکھ کر اپنے دل میں ہنس دیتی وہ اس آس میں مبتلا تھے کہ میرے والدین ملک سے باہر نوکری کے لئے بھجوا دیں۔ میرے تمام اخراجات وہ خود برداشت کرنے کی بات کرتا۔ میں حیران تھی کہ ابھی تک ان کی طرف سے کوئی بھی ایسی دل نواز پیش نہیں ہوئی تھی جو ان کی بے حیا آنکھوں اور مکر مسکراہٹ کا حتمی ثبوت فراہم کرتی میرے والدان کا احسان قبول کرنے کو بالکل تیار تھے اگر میں باہر جانے کی حامی بھر لیتی تو۔ اپنے گھر کے تنگ حالات کے سامنے تو بے بس تھی کیا کرتی باہر جانے کے لئے این او سی بھی ضروری تھا اسی دوران مجھے محکمہ صحت کی طرف سے کال موصول ہوئی جو ایک نواحی بنیادی مرکز صحت میں کام کرنے کے سلسلہ میں تھی والد صاحب کی اجازت سے میں نے ملازمت اختیار کر لی آنے جانے کا بڑا مسئلہ تھا میں ہفتہ بھر وہاں ہی رہتی میرے ہمراہ ایک دائی بھی تھی جو میرے کوارٹر میں ہی میرے ساتھ رہتی۔ ایک روز اس کی زبانی علاقہ کے بڑے زمیندار کا پیغام ملا کہ وہ گھر پر مریض دیکھنے کے لئے بُلا رہے ہیں۔ میں دائی کو لے کر اس کے گھر چل دی۔ راستے میں زبیدہ کی باتیں بڑی بدلی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ چوہدری صاحب کی تعریفوں کے پل بنا رہی تھی میں کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ساتھ چلتی رہی۔ زبیدہ مجھے گھر کی بجائے ڈیرہ پر لے آئی چوہدری نواز باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور اس کے اردگرد کئی ایک اور لوگ بھی موجود

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرایا اور زبیدہ کو اندر جانے کا اشارہ کیا میں سمجھی شاید مریض اندر ہے اس لئے میں بے دھڑک اس کے ساتھ اندر چلی گئی مگر بیٹھک خالی تھی میں نے حیران نظروں سے زبیدہ کی طرف دیکھا اور مریض کا دریافت کیا اتنے میں چوہدری نواز بھی اندر آ گیا اور آتے ہی مخاطب ہوا۔

''میری مرضی کے بغیر یہاں ملازمت کرنا بہت مشکل ہے۔ زبیدہ تم نے اپنی بی بی کو سب کچھ بتا دیا ہے نا۔'' اس کے چہرے کی شیطانی مسکراہٹ کو میں فوراً بھانپ گئی اس سے پیشتر وہ کچھ اور کہتا میں تیزی سے دروازے کو دھکا دیتی باہر نکل آئی اور گرتی پڑتی اپنے کوارٹر میں آ گئی۔ آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یہ بات میں نے ڈسپنسر انچارج کو بتائی وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔ دو روز بعد میرے تبادلے کے آرڈر آ گئے اور تبادلہ ایسی جگہ تھا جہاں ہمارے ضلع کی حد ختم ہو جاتی تھی۔ خاموشی سے سفر کی تیاری کرنے لگی اس سنٹر میں صرف ایک چوکیدار تھا یا میں، مریض نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ نائب قاصد اور ڈسپنسر ہفتہ میں ایک بار آ کر حاضری لگا جاتے ہیں اور بس یہ چند ڈبے گولیوں کے یا پرانی نکسچر پڑی ہے کوئی آ جائے تو اسے میں ہی گولیاں دوا دے دیتا ہوں اور یہ مرکز اس حوالے سے محکمہ صحت کے کاغذوں میں چل رہا ہے میں نے خدا کو یاد کر کے اپنے کمرے کی جھاڑ پونچھ شروع کر دی اور اسے بیٹھنے کے قابل کیا۔ گاؤں میں روزانہ وزٹ کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ کچھ مریض یہاں آنے لگے تھے، جو ادویات پڑی تھیں میں ان سے کام چلا لیتی کیونکہ میڈیسنز الماریوں میں بند تھیں۔ ایک دن میں پورے گاؤں کا وزٹ کر کے لوگوں کو صحت کے بارے میں بہتر مشورے دیئے۔ مگر ہر گھر سے مجھے یہی جواب ملا کہ ہسپتال تو صرف برائے نام ہے یہاں عملہ صرف چوکیدار کی حد تک ہے اب کون ڈاکٹر کا انتظار کرے اس لئے گاؤں کے حکیم جی ہی سے سب لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ تھکی ہاری جب چوکیدار کے ہمراہ ہسپتال آئی تو سامنے ڈسپنسر صاحب کو موجود پایا جو شان بے نیازی سے میز پر ٹانگیں پھیلائے سگریٹ پینے میں مصروف تھے مجھے سر سے پاؤں تک گھور چکنے کے بعد گویا ہوئے۔

''تو آپ ہیں ایل ایچ وی مس عظمیٰ۔''

''جی!'' میں نے رجسٹر میز پر رکھتے ہوئے ادب سے جواب دیا۔

''آپ کو علم ہے کہ میں آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ کم از کم آپ کو میرا انتظار تو کرنا چاہیے تھا۔

''میں آپ کا پچھلے پانچ روز سے انتظار کر رہی ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے کا زہر چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کون ہیں مجھ سے پوچھنے والی آپ نے مجھ سے بدتمیزی کی ہے میں ابھی دفتر اطلاع کرتا ہوں۔''

کہتے ہوئے ڈسپنسر صاحب نے لکھنا شروع کر دیا اور چٹھی لکھ کر اسے درج کر کے اپنے ساتھ آئے نائب قاصد کو دیتے ہوئے کہا۔

''دفتر ڈائری کروا کے گھر آ جانا۔'' ڈسپنسر صاحب بدستور جلال میں اُٹھے اور اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے دھول اُڑاتے ہسپتال سے نکل گئے۔

''باجی صاحب آپ نے لاشاری صاحب کو ناراض کر کے اچھا نہیں کیا۔'' نائب قاصد نے چٹھی جیب میں ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا میں خاموشی سے بیٹھی رہی میں نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ بھی چلا گیا۔ اب میں اور چوکیدار رہ گئے وہ بھی بے چارہ میری طرح پریشان تھا۔ دوسرے دن قاصد صاحب دستی چٹھی لے آئے مجھے ڈی ایچ او صاحب نے دفتر طلب کیا تھا۔ میں اپنے امتحان کا جائزہ لے رہی جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے حاضری رجسٹر میں آفس جانے کا تحریر کیا اور شہر آنے کے لئے گاؤں کے تانگہ سٹینڈ پر آ گئی بس جانے والی تھی سیٹ مل گئی ورنہ دو گھنٹے بس کا بھی انتظار کرنا پڑتا۔ دفتر بند ہونے سے کچھ دیر پہلے پہنچ گئی پہلی بار ڈی ایچ او صاحب کے سامنے پیش ہو رہی تھی میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں میرے اندر آنے پر ڈاکٹر صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بڑے دھیمے انداز میں مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے چٹھی نکال کر ان کے آگے رکھ دی انہوں نے عبارت پڑھی اور گھنٹی بجائی چپڑاسی اندر آیا انہوں نے اسے ڈی ایچ او کو بلانے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک نوعمر لڑکا اندر آیا جس نے میری طرف بڑی بے باکی سے دیکھا۔

''جی سر!'' میڈیم کا کیا مسئلہ ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ او صاحب نے پوچھا۔

''لاشاری نے آ کر بتایا تھا کہ ایل ایچ وی نے اس کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی ہے۔'' میرے ضبط کے باوجود آنسو نکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آئے اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب بولتے اے ڈی ایچ او مجھ سے براہ راست مخاطب ہوئے۔

''مس عظمی آپ کے بارے میں ہمارے پاس بہت مواد ہے آنسو بہانے کی بجائے اپنے آپ کو درست کریں۔'' ڈاکٹر صاحب اس پر برس پڑے اور اسے واپس بھیج دیا پھر مجھ سے بولے۔

''بی بی آپ بتائیں کیا معاملہ ہے؟''

میں نے ساری صورتحال انہیں بتا دی وہ تھوڑی دیر سوچ میں ڈوبے رہے پھر مجھے مخاطب ہو کر بولے۔

''بی بی میں تمہاری جنرل ڈیوٹی ڈسٹرکٹ ہسپتال میں لگا رہا ہوں تاکہ تم آسانی سے آجا سکو میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد مجھے نیا آرڈر مل گیا اور میں لے کر اپنے گھر آ گئی یہاں میری بدنصیبی کا دور شروع ہو گیا۔ ہسپتال کے اندر میرا کمرہ تھا تین ان ٹرینڈ اور ایک ٹرینڈ دائی میرے پاس تھیں۔ یہ ڈیوٹی مجھے بڑی بہتر لگی ایک تو گھر میں دوسرا کسی قسم کا فکر نہ تھا مجھے یہاں ایک سال ہو گیا تھا اب میں اپنے اردگرد کے ماحول سے خاصی باخبر ہو گئی تھی۔ پروین نامی پیشنٹ کئی ماہ سے میرے پاس علاج کی غرض سے آ رہی تھی اس کا خاوند رکشہ ڈرائیور تھا اکثر میں اُس کے ساتھ بیٹھ کر آتی وہ میرا بہت احترام کرتا اسے اپنی بیوی کے حوالے سے بھی مجھے لانے میں خوشی محسوس ہوتی۔ پروین کے آخری دن تھے اور مجھ سے اس نے وعدہ لے رکھا تھا کیس میں ہی کروں گی۔ مجھے اس کا کیس کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ میں نے جس محنت سے اس کا علاج کیا تھا اس کا ثمر خدا کی طرف سے اسے ملنے والا تھا دوپہر کو میں گھر آ کر آرام کر رہی تھی کہ باہر دستک ہوئی میرے بھائی نے آ کر بتایا کہ پروین نامی کسی عورت کا خاوند آیا ہے اور آپ کو بلا رہا ہے میں اُٹھ کر دروازے میں آئی باہر اسلم کھڑا تھا۔

''باجی صاحبہ پروین کی طبیعت خراب ہے آپ کو فوراً بلایا ہے۔''

میں کچھ سوچ کر تیار ہوئی اور گھر بتا کر اس کے ہمراہ رکشہ میں بیٹھ کر اس کے گھر آ گئی پروین کا کیس تیار تھا میں نے ضروری انتظامات کے بعد پروین کو انجکشن دیا اور بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ خدا نے پروین کو بیٹا دیا تھا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے اسلم مٹھائی کا ڈبہ لے آیا میرے لئے نیا سوٹ اور کچھ روپے جن کا اس نے شاید پہلے سے انتظام کر رکھا تھا میں انکار کرتی رہی آخر ان کے اصرار پر مجھے لینا پڑے رات کافی ہو چکی تھی۔ میں نے گھر چلنے کا کہا وہ رکشہ نکال لایا اور میں پروین کو ضروری ہدایات کرتی رکشہ میں بیٹھ گئی راستے میں بڑی سڑک عبور کر کے جب ہم بے نظیر روڈ پر آئے تو اچانک ہمارے پیچھے سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل رکشہ کے آگے آ کر رُک گئی۔ اگر اسلم بریک نہ لگاتا تو حادثہ ہو جاتا موٹر سائیکل جس پر دو آدمی سوار تھے۔ ''اسلم یار اکیلے ہی؟''

آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے کہا اور مجھے بڑی واہیات نظروں سے دیکھنے لگا۔ اسلم نے فوراً رکشہ کے اندر لگا بلب بند کرتے کہا۔

''نذیر راستہ چھوڑ دو یہ میری اپنی سواری ہے۔''

میں نے کب کہا ہے کہ کوئی غیر سواری ہے۔ میں نے بھی تو اپنی سواری جان کر تمہارا پیچھا کیا ہے۔ یار نثار تم ہی سمجھاؤ نذیر کو۔'' اسلم نے بڑی بے چارگی سے اس کے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بازاری مال سب کا مشترکہ ہوتا ہے۔'' اسلم نے طیش میں آ کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا اور وہ دونوں اس پر جھپٹے میرے دیکھتے ہی دیکھتے نذیر نے پستول نکال لیا۔ اسلم نے نثار کو بُری طرح دبوچ رکھا تھا جسے اسلم نے نذیر کہہ کر مخاطب کیا تھا اس نے فائر کیا سنسان سڑک پر ایک خوفناک چیخ اُبھری۔ پھر نذیر کو موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ رکشہ کی بتی جلی یہ نثار تھا جو خون میں لت پت پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ میں میڈیکل سے وابستہ تھی مگر مجھ میں یہ جرأت نہ تھی کہ میں آگے بڑھتی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی پھر اس نے ہمارے سامنے دم توڑ دیا پہلے ہمارے قریب ایک گاڑی رُکی پھر گاڑیاں رُکتی گئیں۔ پولیس آئی لاش کے قریب پستول بھی پڑا تھا جو پولیس نے قبضہ میں لے لیا مجھے اور اسلم کو قتل کے جرم میں دھر لیا گیا۔ اسلم بھی معمولی رکشہ ڈرائیور تھا اور میں ایک غریب گھر کی لڑکی بہت زور لگایا کہ اس ناکردہ گناہ سے چھٹکارا مل جائے مگر مخالف سرمایہ دار تھے۔ پولیس نے آلہ قتل اسلم سے برآمد کیا۔ مجھے اس کی داشتہ قرار دیتے ہوئے 302 کے جرم میں برابر کی شریک کر لیا۔'' یہ کہتے ہوئے عظمیٰ کی آنکھیں بے اختیار جھلک پڑیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

قارئین کے پسندیدہ نامور قلم کار کا پہلا شہ پارہ

ڈراپ سین

ممتاز احمد

جلد بازی میں کیے گئے فیصلے بعض اوقات ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں

کالج میں نیا نیا داخلہ لیا تھا اوپر سے اچھی شکل وصورت کے ساتھ چڑھتی جوانی، طبیعت میں مستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی تو کسی کو خاطر میں نہ لانا ایک عالم تفاخر سے کالج آجا جانا بھئی آفٹر آل ہم کالجیٹ جو ٹھہرے تھے۔ بڑی شان سے مابدولت کی سواری علی الصبح ایک نئے نکور سائیکل پر گھر سے نکلتی، بڑی ادائے خاص سے روڈ پر سائیکل لہراتے ہوئے کالج پہنچنا، سائیکل اسٹینڈ کے چوکیدار کو ماہانہ اسٹینڈ چارجز کے علاوہ تیس چالیس روپے کی ٹپ دینا جس کے بدلے میں وہ میری سائیکل کو صاف کرکے شیشے کی طرح چمکا دیتا۔ بڑے بھائی کی شادی ہوچکی تھی۔ عطیہ بھابی کا کوئی بھائی نہ تھا۔ وہ پانچ بہنیں تھیں۔ ہم تین بھائی تھے۔ ہماری بھی کوئی بہن نہ تھی تو عطیہ بھابی نے ہماری بہن کی کمی پوری کردی۔ انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو کبھی دیور نہیں سمجھا، اپنا چھوٹا بھائی سمجھتیں اور ہمارے لاڈ، ناز نخرے خوب اٹھاتیں۔ اسی طرح ہم بھی انہیں سگی بہن کی طرح عزت احترام دیتے۔ بھابی سب گھر والوں کا بہت خیال رکھتیں، انہیں ہر رشتے کی نزاکت اور اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ وقت پر کھانا بنا کر سب کو کھلانا، گھر کی صفائی ستھرائی، مہمانداری میں وہ طاق تھیں۔ امی ابو سمیت ہم سب گھر والے بھابی سے بہت خوش تھے۔ بدلے میں بھابی کو بلا ناغہ ڈھیر ساری دعائیں، پیار اور عزت واحترام ملتا۔ وہ ہمارے کپڑے، یونیفارم دھونے اور استری کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

کے ساتھ ساتھ ہمارے جوتے بھی پالش کر دیا کرتیں۔

ان سب باتوں کے برعکس میں انتہائی نکما اور نالائق طالب علم ثابت ہوا تھا۔ کالج میں پروفیسرز صاحبان کے مختلف نام بگاڑ کر رکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ہمارے ایک پروفیسر انعام صاحب تھے جو سرخ و سفید رنگت کے مالک تھے، ان کا نام نام ٹماٹر رکھا ہوا تھا۔ اسی طرح پروفیسر گلریز صاحب جو کبھی کبھی پڑھانے اور ہنسنے کے دوران اپنے دونوں ہاتھ تالی بجانے کی شکل میں آپس میں ٹکراتے تھے تو ان کا نام گلو مانگے مار (تالیاں بجانے والا) رکھا تھا۔ پروفیسر اللہ دتہ صاحب بہت خوش خوراک اور اچھے خاصے صحت مند موٹے تھے تو ان کا نام دتو سانڈھ (بھینس کا جوان پلا ہوا بچھڑا) رکھا ہوا تھا۔ پروفیسر رشید صاحب کا نام شیدا ٹلی رکھا ہوا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

امی، ابو اور بھابی سے روزانہ تیس روپے جیب خرچ کے لیے اینٹھ لیتا۔ سستا زمانہ تھا تو ان روپوں سے اپنے کلاس فیلو دوستوں کو کھلاتا پلاتا۔ یہی وجہ تھی کہ دوستوں کی ٹولی میں راجہ اندر بنا ہوا تھا۔ بھائی کے آنے سے پہلے شام کے ٹائم عطیہ بھابی اپنا بناؤ سنگھار کرتیں تو انہیں دیکھ کر مجھے بھی بہت شوق تھا کہ جلد از جلد میری بھی شادی ہو۔ میری دلہن آئے اور وہ بھی بھابی کی طرح خوب بناؤ سنگھار کرے۔ کالج کے ایک ڈرامے میں میں نے دولہا کا رول ادا کیا تھا تو اس دن کے بعد مجھ پر دولہا بننے کا شوق جنون کی حد تک طاری ہو گیا۔ میری شدید خواہش تھی کہ میری شادی ہو اور میں دولہا بنوں۔ عطیہ بھابی سے میری خاصی فرینکنس تھی تو اپنی یہ خواہش آرزو ان کے گوش گزار کی۔ پہلے تو انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ابھی تمہاری عمر شادی کی نہیں ہے مگر میں کہتا بھابی عمر کو چھوڑو میں جوان ہو گیا ہوں۔ میرے بے حد اصرار پر بالآخر بھابی نے میری درخواست امی ابو کو پیش کی تو انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ خوب لتاڑا کہ پہلے پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ، کمانے کے قابل ہو جاؤ تب تمہاری شادی کا سوچیں گے۔ میرے سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا تھا مگر ہر وقت شادی کے خواب دیکھتا رہتا۔

ایک دن آخری دو پیریڈ خالی تھے تو اپنے دوستوں کی ٹولی کے ساتھ بازار مٹر گشت کرنے نکل گیا۔ ہم سب دوست خوش گپیوں اور شرارتوں میں مگن جا رہے تھے کہ ایک رکشہ میری سائیکل سے ٹکرا گیا جس کی وجہ سے سائیکل کا مڈگارڈ تھوڑا سا دب گیا اور کچھ خراشیں بھی پڑ گئیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے رکشہ ڈرائیور کا گریبان پکڑا اور اسے باہر نکال کر خوب مارا اور گالیاں دیں۔ میرے دوست بھی اس کام میں پیچھے نہ رہے اور انہوں نے بھی حسب توفیق رکشے والے کی پٹائی میں اپنا حصہ ڈالا جبکہ حقیقت یہ تھی رکشے والے کا کوئی قصور نہ تھا۔ میں نے سائیکل کو ہینڈل سے پکڑا ہوا تھا اور ہم سب سڑک کے درمیان پیدل چل رہے تھے۔ کچھ راہگیروں نے رکشے والے کی ہم سے گلوخلاصی کروائی۔ وہ بے چارا مجھے بددعائیں دیتا چلا گیا۔

شادی کا جنون مجھ پر بہت زیادہ طاری رہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ میرا جب ایف اے کا رزلٹ آیا تو میں تھرڈ ڈویژن میں E گریڈ لے کر بمشکل 35% نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ میرے اتنے کم نمبر تھے کہ کسی بھی کالج میں بی اے میں داخلہ نہ ملا۔ اب میں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی کہ جلدی جلدی کوئی ملازمت مل جائے تاکہ شادی ہو سکے۔ اتفاق سے اپنے ایک دوست کی معرفت ایک بندے سے ملاقات ہوئی جسے عرف عام میں بلو بھائی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ کچہریوں میں کسی وکیل کا کارندہ تھا۔ میں نے اس سے نوکری کی بات کی تو اس نے کہا کہ اپنی میٹرک، ایف اے کی اسناد، ڈومیسائل، شناختی کارڈ کی کاپی اور تین تصویروں کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ دو تو وہ ایک مہینہ کے اندر اندر سرکاری نوکری لگوا دے گا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ لاکھ روپیہ کہاں سے لاؤں تو انہی دنوں بھابی کی ایک لاکھ روپے کی کمیٹی نکلی۔ جب میں نے نوکری والی بات عطیہ بھابی کو بتائی اور ان کی منت سماجت کی کہ آپ وہ ایک لاکھ روپیہ مجھے دے دیں تو نوکری لگتے ہی کمیٹی ڈال کر آپ کو واپس کر دوں گا۔ بہرحال بھابی نے مجھے رقم دے دی جو کہ میں نے اپنے کاغذات کے ساتھ بلو بھائی کو دے دی۔ حیرت انگیز طور پر ایک ماہ کے بعد بلو بھائی نے مجھے ایک سرکاری محکمے کا اپائنٹمنٹ لیٹر دیا۔ میری کلرک کی بھرتی ہوئی تھی اور اپنے ہی شہر میں میری پوسٹنگ ہوئی۔ میں نے فوراً نوکری

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جوائن کرلی۔ ادھر میری نوکری لگی ادھر میں نے گھر میں شادی کی رٹ لگادی۔ عطیہ بھابی کی دن رات منتیں خوشامدیں کرتا کہ اب تو سرکاری نوکری مل گئی ہے اب شادی نہ کرنے کا کیا عذر ہے؟ میری دن رات شادی کی رٹ سے تنگ آکر ایک رشتہ کروانے والی عورت کی وساطت سے واجبی سی شکل کی سانولے رنگ والی لڑکی کا رشتہ مل گیا۔ لڑکی تھوڑی موٹی بھی تھی۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق تین ماہ کے اندر میری شادی ہوگئی۔ خانم میری دلہن بن کر آگئی۔ دفتر سے واپس آکر سارا دن اور رات بیڈ روم میں گھسا رہتا۔ خانم مجھے حور پری لگتی تھی، میں اس پر نہال ہوہو جاتا۔ عطیہ بھابی ہمارا ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا بیڈ روم میں پہنچا دیتیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینہ گزر گیا تو امی نے خانم سے کہا کہ بہت ہوگئی تمہاری ناز برداریاں اب عطیہ سے مل کر گھر سنبھالو۔ خانم نے گھر خاک سنبھالنا تھا اس کو تو آملیٹ تک بنانا نہیں آتا تھا۔ کریلا اوپر سے نیم چڑھا کے مصداق انتہائی پھوہڑ اور بدمزاج ثابت ہوئی۔ گھر داری سیکھنے کی بجائے الٹا عطیہ بھابی اور امی سے بدتمیزی کرتی۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوجاتی۔ اسے منانے کے لیے مجھے ہزار منتیں کرنی پڑتیں۔ کچھ دن گزرے تو آفس میں ایک خبر بجلی بن کر مجھ پر گری وہ یہ کہ میری کلرک کی تقرری کو بائیکورٹ میں چیلنج کردیا گیا تھا۔ میرے ساتھ کچھ اور کلرک بھی بھرتی ہوئے تھے اور یہ سب بھرتیاں آؤٹ آف میرٹ رشوت لے کر کی گئی تھیں۔ میرٹ کی دھجیاں اڑائی گئی تھیں جو اہل امیدوار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور سب کے سب فرسٹ ڈویژن اے گریڈ میں پاس ہوئے تھے ان کو نظر انداز کرکے تھرڈ ڈویژن پاس لڑکوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ ہائیکورٹ نے سارا ریکارڈ طلب کیا۔ چھان بین کے بعد ہماری بھرتیوں کو غلط قرار دے کر سب کو نوکری سے فارغ کردیا گیا اور حکم دیا گیا کہ دوبارہ سے صاف شفاف میرٹ پر پورا اترنے والے امیدواروں کو بھرتی کیا جائے۔ میں انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر آیا تو خانم امی اور عطیہ بھابی سے تو تکار کررہی تھی۔ میں نے خانم کو سمجھایا کہ عطیہ بھابی اتنی خوش اسلوبی سے گھر چلا رہی ہیں تو ان سے کچھ سیکھ لو۔ اس پر خانم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ اگر عطیہ بھابی اتنی ہی گھڑ ہے تو اس سے شادی کرلینی تھی۔ مجھے یہ سن کر غصہ آگیا اور میں نے خانم کو تھپڑ مار دیا۔ پھر کیا تھا اس نے رونے پیٹنے کے ساتھ سارا گھر سر پر اٹھالیا اور طوفان بدتمیزی بپا کردیا۔ اپنا کپڑوں کا بیگ اٹھایا اور روٹھ کر میکے چلی گئی۔ میں نوکری ختم ہونے کی وجہ سے پہلے ہی انتہائی پریشان اور دکھی تھا اوپر سے خانم کا یوں بلاوجہ روٹھ کر میکے چلے جانا مجھ پر بہت گراں گزرا۔

میں سارا دن گھر میں بیکار پڑا رہتا۔ ایک دن امی اور بھابی کے سمجھانے پر خانم کو منانے اور واپس گھر لانے کے لیے اپنے سسرال گیا تو سب کے موڈ آف تھے۔ مجھ سے بے دلی اور سرسری طور پر ملے، میرے آنے کا مقصد پوچھا تو یہ شرط رکھی گئی کہ خانم کو الگ گھر لے کر دوں۔ میں نے کہا کہ میری نوکری ختم ہوگئی ہے کیسے الگ گھر لے کر دوں تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ تمہاری دردسر ہے جہاں سے بھی جیسے بھی کما کر لاؤ۔ اب خانم الگ گھر میں رہے گی۔ میں نے بڑی منتیں ترلے کیے مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ میں ناکام گھر آگیا۔ انہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا کہ خانم مجھ سے دس سال عمر میں بڑی ہے، صرف پانچ جماعتیں پاس ہے جبکہ ہمیں ایف اے پاس بتایا گیا تھا۔ شادی سے پہلے اس کے کئی معاشقے بھی چلتے رہے ہیں، میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دل میں آیا کہ خانم کو طلاق دے دوں۔ جب نکاح نامہ کھول کر پڑھا تو بہت ساری شرائط کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ طلاق دینے کی صورت میں پانچ لاکھ روپیہ، سارا زیور اور ماہانہ خرچ بھی دینا پڑے گا۔ قصہ مختصر میرا نہ تو کوئی روزگار تھا نہ نوکری رہی تو میرا رشتہ بچانے اور گھر بسانے کے لیے بھائی بھابی نے قربانی دی۔ وہ الگ ہوگئے۔ مجھے اپنے تمام سسرالی رشتہ داروں کے سامنے خانم سے معافی مانگنی پڑی تب وہ میرے ساتھ گھر واپس آئی۔ بھائی بھابی نے دو مہینے کا راشن ہمارے گھر ڈال دیا۔ ابو کی پنشن سے بمشکل بجلی گیس پانی کے بل ادا ہوتے۔ بالآخر گھر چلانے اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے مجھے قسطوں پر چنگ چی رکشہ لے کر چلانا پڑا۔ وہی خانم جو مجھے حور پری لگتی تھی اب چڑیل، ڈائن اور انتہائی خوفناک لگتی ہے۔ میں صبح سات بجے سے لے کر رات گیارہ بجے تک موٹر سائیکل رکشہ چلاتا ہوں۔ اب مجھے رفیق کی بجائے فیقا رکشے والا کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پیار کی تلاش

ممتاز احمد

کبھی کبھی پہلے پہ دہلا اس طرح ہوتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے

نام تو اس کا قاسم تھا مگر اسے قاسو کے نام سے پکارا جاتا تھا، لاری اڈے کا ماحول ہی ایسا تھا کہ ہر کسی کا نام بگاڑ کر بلایا جاتا۔ پینتیس سالہ قاسو کی لاری اڈے میں چھوٹی سی پرچون کی دوکان تھی۔ دکان اس کی اتنی چلتی تھی یا نہیں مگر وہ خود ایک چلتا پھرتا پرزہ تھا۔ اکثر بسیں اور ویگنیں تھوڑی دیر کے لیے اس کی دکان کے پاس رکتیں تو وہ دکان سے اٹھ کر مختلف آئٹمز کی آواز لگاتا اس طرح کچھ سواریاں اپنی مطلوبہ اشیاء بتا دیتیں تو وہ گاڑی میں بیٹھی سواریوں کو فروخت کر دیتا۔

قاسو خود تو بہت ہی تیز طراز، ہوشیار چالاک اور خرانٹ بندہ تھا جبکہ اس کی چھبیس سالہ بیوی نازلی بہت سیدھی سادھی، شریف اور معصوم سی۔ صرف آٹھ جماعتیں پاس تھی مگر تھی بلا کی حسین اور خوبصورت۔ سب سے بڑی بات اس کی آواز بہت پیاری سریلی اور دل موہ لینے والی تھی۔

نازلی نے غریب گھرانے میں جنم لیا اور غربت زدہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح خواب تو اس کے بھی بہت اونچے تھے مگر یہاں خواب کب پورے ہوئے ہیں کسی کے۔

جونہی نازلی کی عمر بیس یا اکیس سال ہوئی اسے قاسو کے پلے باندھ دیا گیا، قاسو کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا تو نازلی ساس، نندوں، دیورانیوں، جٹھانیوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی۔ ایک کمرہ، باتھ روم، باورچی خانہ اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل کرائے کے مکان میں قاسو کے ساتھ اسے رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے جہاں اسے کوئی دکھ تکلیف تو نہ تھا مگر کوئی خاص سکھ بھی نہیں تھا۔ وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔

قاسو صبح سویرے دکان پر چلا جاتا اور رات سات آٹھ بجے گھر لوٹتا۔ نازلی سارا دن گھر میں اکیلی رہتی، گھر کے کام نمٹا کر تیسرے درجے کے عشقیہ رسالے پڑھتی جو وہ اپنی ایک سہیلی لاڈو جو کہ اس کی پڑوسن بھی تھی سے لے آتی۔ لاڈو اس کی بہت گہری سہیلی تھی۔

ایک دن قاسو اپنی چیزیں بیچنے کے لیے ایک بس میں داخل ہوا تو اس کی نظر ایک سیٹ کی پچھلی طرف لکھے موبائل نمبر پر پڑی جس کے ساتھ ہی لکھا ہوا تھا ''پیار کی تلاش''۔ قاسو نے کچھ سوچ کر وہ نمبر یاد کر لیا اور دکان میں آ کر اپنے موبائل میں محفوظ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

(Save) کرلیا۔ قاسو کے ذہن میں ایک شرارت آئی۔ شام تک اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنالیا۔ رات کو جب وہ گھر آیا تو اس نے کھانا کھا کر نازلی سے کہا کہ ''وہ ایک نمبر ملا رہا ہے، جب اگلا بندہ کال اٹینڈ کرے تو صرف ہیلو ہیلو رخسانہ بول کر اپنی آواز سنانی ہے، بس اور کچھ نہیں کہنا۔''

نازلی نے پوچھا۔ ''معاملہ کیا ہے؟''

تو قاسو کہنے لگا۔ ''اس بندے کو یقین دلانا ہے کہ یہ قاسو کا نمبر نہیں ہے۔''

قصہ مختصر جب قاسو نے نمبر ملایا تو تیسری یا چوتھی گھنٹی پر اس بندے نے کال اٹینڈ کرلی تو قاسو نے فوراً موبائل نازلی کو پکڑا دیا۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق ''ہیلو ہیلو رخسانہ'' بولنے لگی۔ چند سیکنڈ کے بعد قاسو نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق ایک منٹ کے بعد ''جی کون اور آپ نے کس سے بات کرنی تھی'' کا میسج آ گیا تو قاسو نے جواب دیا۔ ''جی میں نازیہ ہوں اور اپنی سہیلی رخسانہ سے بات کرنی تھی مگر سگنل پرابلم کی وجہ سے آواز نہیں آ رہی تھی۔''

اس پر اس بندے نے جواب دیا۔ ''جی یہ رخسانہ کا نمبر نہیں ہے۔''

قاسو نے فوراً جوابی میسج بھیجا۔ ''اوہ سوری! جی لگتا ہے رانگ نمبر مل گیا۔''

اگلے بندے کو نازلی کی سریلی آواز سن کر یقین ہوگیا کہ یہ نمبر کسی لڑکی کا ہے تو وہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا اور میسج پر میسج کرنے لگا۔

اس دن نازلی کے سر میں درد تھا۔ وہ سر درد کی گولی کھا کر جلد سوگئی۔ اب قاسو نازیہ بن کر اس لڑکے کی میسجز کے جواب دینے لگ گیا۔ پہلے تو اس نے لڑکیوں اور عورتوں کی طرح خوب نخرے کیے، مصنوعی غصہ کیا اور اسے منع کیا کہ میسج نہ بھیجے مگر وہ لڑکا کب باز آنے والا تھا۔ وہ تو خود کسی لڑکی یا عورت کے نمبر کی تلاش میں تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اب یہ رانگ نمبر اپنے آپ ہی مل گیا تھا تو وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر رات گیارہ بجے تک کافی تکرار اور اس لڑکے کی منتوں کے بعد نازیہ کی اس سے دوستی ہوگئی۔ اس لڑکے نے اپنا نام یاسر بتایا۔ وہ اٹھائیس سال کا کنوارا لڑکا تھا۔ قریبی شہر کے ایک دیہات کا رہنے والا تھا۔ اس کی اپنی بہت ساری زمینیں تھیں۔ وہ کسی لڑکی یا عورت سے دوستی کا بہت خواہشمند تھا مگر اتفاق سے اس کی دوستی کسی لڑکی کے ساتھ نہ ہوسکی تھی۔

یاسر ایک سیدھا سادا لڑکا تھا۔ قاسو نے نازیہ بن کر اسے بتایا کہ وہ شادی شدہ چھبیس سال کی لڑکی ہے۔ اس کا خاوند بہت شکی مزاج، ظالم اور بدمزاج ہے، اس کی ساس سارا دن اس سے گھر کے کام کرواتی ہے، وہ بہت مظلوم لڑکی ہے اور پیسے پیسے کو ترستی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اب قاسو کے ہاتھ بہترین مشغلہ آ گیا۔ وہ فارغ اوقات میں نازیہ بن کر سارا دن یاسر کو میسیج کرتا، رات کو گھر آ کر اپنے سامنے نازلی کی یاسر سے دو چار منٹ کی بات بھی کروا دیتا۔ نازلی اس سے پوچھتی تو قاسو ہنس کر کہتا وہ اپنے ایک دوست سے شرارت کر رہا ہے، اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔

اب ہر دوسرے دن قاسو سو سو روپے کا موبائل بیلنس یاسر سے منگواتا، مختلف حیلوں بہانوں سے ہزاروں روپے بذریعہ ایزی پیسہ بھی منگواتا جس کے لیے وہ نازلی کا شناختی کارڈ نمبر بھیجتا کہ اگر وہ تصدیق بھی کروائے تو عورت کا ہی نام پتا چلے۔ قاسو ان روپوں سے ڈھیر سارا پھل، چٹ پٹی کھانے کی چیزیں اور نازلی کے لیے سوٹ وغیرہ لے کر آتا۔ نازلی جب پوچھتی تو وہ کہتا۔ ''میری جان تو بس عیش کر، مت سوچا کر۔''

نازلی کے پرزور اصرار پر ایک دن قاسو نے اسے ساری بات بتا دی کہ یہ چکر اور معاملہ ہے۔ قاسو نے کہا نازلی تم جتنی لگاوٹ سے بات کرو گی وہ اتنے ہی زیادہ پیسے بھیجا کرے گا۔

ایک دن قاسو نے یاسر کا نمبر ملایا اور موبائل نازلی کو پکڑا کر ہدایت کی کہ خوب پیار سے محبت سے بات کرنا۔ اب نازلی پوری بات سمجھ چکی تھی۔ گھٹیا درجے کے عشقیہ رسالے پڑھ پڑھ کر اسے بھی عاشقانہ جملے بولنے آ گئے تھے۔ جیسے ہی یاسر نے کال اٹینڈ کی اور نازلی نے بات کرنا شروع کی اسی وقت قاسو کا کوئی ملنے والا آ گیا تو وہ اس سے ملنے چلا گیا جبکہ نازلی اس سے بات کرتی رہی۔ دس منٹ کے بعد قاسو اسے فارغ کر کے کمرے میں آیا تو نازلی نے کہا اچھا یاسر پھر بات ہوگی میرے شوہر گھر آ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی اور موبائل قاسو کو پکڑا دیا۔

اگلے دن یاسر نے قاسو کو تین ہزار روپے بذریعہ ایزی پیسہ بھیجے۔ قاسو بہت خوش تھا کہ وہ یاسر کو بیوقوف بنا کر اس سے پیسے لوٹ رہا ہے۔ اس کا پروگرام تھا کہ وہ مزید کچھ اور پیسے لے کر یہ کھیل ختم کر دے گا اور اپنی یہ سم بند کروا دے گا مگر اس سے پہلے ہی یاسر کا موبائل بند ملنے لگا۔ وہ ڈھیروں میسیج بھیجتا مگر کوئی جواب نہ ملتا اسی طرح کال ملاتا تو نمبر پاور آف ملتا۔

قاسو بہت پریشان اور مایوس ہوگیا کیونکہ اس کی مفت کی اچھی خاصی آمدنی جو بند ہوگئی تھی۔ وہ پورا مہینہ یاسر کا نمبر ملاتا رہا مگر سوائے مایوسی کے اس کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

ایک دن قاسو رات کو گھر آیا تو نازلی گھر میں نہیں تھی۔ تو وہ سمجھا شاید محلے میں کسی کے گھر گئی ہے۔ وہ پورے دو گھنٹے نازلی کا انتظار کرتا رہا مگر نازلی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ نازلی کے پاس موبائل بھی نہیں تھا ورنہ وہ کال کر کے اس سے پوچھ لیتا۔ اس نے سوچا کہ وہ محلے میں آس پڑوس سے جا کر پوچھتا ہے کہ نازلی ان کے گھر میں تو نہیں ہے۔

قاسو پریشان تھا کیونکہ جب بھی وہ گھر آتا تو نازلی اسے ہمیشہ گھر میں ملتی تھی۔ آج پہلی بار وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گھر میں موجود نہیں تھی۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ کوئی نیا نامعلوم نمبر تھا۔ قاسو نے کال اٹینڈ کی۔ کال کرنے والے نے سلام کیا اور قاسو کا حال چال پوچھنے کے بعد کہا۔ ''قاسو تم یقیناً گھر پہنچ چکے ہوگے اور نازلی کو گھر میں نہ پاکر پریشان ہورہے ہوگے؟''

قاسو نے جواب دیا۔ ''ہاں ہاں مگر تم کون ہو اور نازلی کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

اس پر اس بندے نے جواب دیا۔ ''مسٹر قاسو آرام سے میری بات سنو۔ میں یاسر بول رہا ہوں اور نازلی اس وقت میرے پاس بیٹھی ہے، لو اس سے بات کرو۔'' تو اسے نازلی کی آواز سنائی دی۔ اس نے قاسو سے کہا کہ ''وہ نازلی ہے اور اس کا گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ قاسو غصے سے تلملا اٹھا اور مغلظات بکنے لگا کہ ''کیا بکواس کررہی ہو۔''

نازلی کہنے لگی۔ ''وہ بکواس نہیں کررہی اسے یاسر سے سچ مچ پیار ہوگیا ہے۔ تم نے تو یاسر کو بے وقوف بنانے کے لیے جو کھیل شروع کیا تھا اس کا ڈراپ سین تو ہونا تھا، باقی حقیقت یہ ہے کہ یاسر بہت پیار کرنے والا انسان ہے اور بہت امیر بھی ہے۔ وہ مجھ سے عشق کرتا ہے اور مجھے چوہدرائین بنا کر رکھے گا۔''

قاسو ایک دم دہاڑا اور بولا۔ ''بے غیرت بکواس بند کر۔''

نازلی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''بے غیرت وہ نہیں قاسو ہے۔''

قاسو نے حواس باختہ ہوکر پوچھا۔ ''تیرا رابطہ کیسے یاسر سے ہوا؟''

تو نازلی نے بتایا کہ ''جس دن تم مجھے فون پکڑا کر باہر اپنے کسی ملنے والے کے پاس گئے تھے تو اس نے یاسر کا نمبر تمہارے موبائل سے دیکھ کر یاد کرلیا تھا کیونکہ یاسر بہت محبت، چاہت اور پیار کا اظہار کررہا تھا تم نے کبھی کوئی پیار کا لفظ نہیں بولا۔ تو اگلے دن اس نے اپنی سہیلی کے موبائل سے یاسر کو کال کرکے سارا چکر بتادیا تھا تو دو دن کے بعد یاسر اس سے ملنے آگیا اور نیا موبائل فون اور سم ڈال کر دے گیا اور پورا مہینہ وہ گھنٹوں فون پر باتیں کرتے۔

دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہوگئے ہیں چنانچہ آج اس نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ تمہاری کوئی چیز لے کر نہیں آئی، جو کپڑے پہنے ہیں وہ تم یاسر کے بھیجے ہوئے پیسوں سے میرے لیے لے کر آئے تھے۔ اب تمہاری بہتری اور عزت اسی میں ہے کہ چپ کرکے شرافت سے مجھے طلاق دے دو میں اپنی مرضی سے تمہارا گھر چھوڑ کر آئی ہوں اور تم سے طلاق مانگتی ہوں۔ اگر طلاق نہیں دوگے تو عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کردوں گی اور تمہیں پورے شہر میں بے عزت اور بدنام کردوں گی۔

صبح دس بجے یاسر تمہارے پاس لاری اڈے میں آئے گا تو اسے طلاق نامہ پکڑا دینا اور ہاں کوئی غل غپاڑہ، بدمعاشی، ہوشیاری اور چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہرحال میں تم ہی نقصان اٹھاؤ گے۔''

یہ سب سن کر قاسو کے پیروں سے زمین نکل گئی اس نے لرزتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے پوچھا۔ ''نازلی یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

نازلی نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے کیونکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کا پیار پالیا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل یاسر کو پکڑا دیا۔

یاسر نے کہا۔ ''مسٹر قاسو مجھے پیار کی تلاش تھی اور مجھے میرا پیار تمہاری وجہ سے مل گیا۔ تمہارا بہت شکریہ میں صبح دس بجے تمہارے پاس آرہا ہوں۔

نازلی کا طلاق نامہ تیار رکھنا تاکہ میں نازلی سے نکاح کرسکوں۔''

یہ کہہ کر اس نے کال کاٹ دی اور موبائل پاور آف کردیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

قارئین کے پسندیدہ نامور قلم کار کا تیسرا شہ پارہ

کالو پھڈے باز

ممتاز احمد

زور زبردستی محبت حاصل کرنے والوں کے لیے اِک عبرت سامانی

کالو ایک گہرے سانولے رنگ کا لڑکا تھا۔ اس کا اصلی نام تو کسی کو معلوم نہ تھا مگر وہ کالو کے نام سے مشہور تھا اور اس کو چوہدری بننے کا بہت شوق تھا۔ ہر کسی کے ذاتی معاملے میں ٹانگ اڑانا، پھڈے بازیاں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ پورے گاؤں میں کالو پھڈے باز کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کالو پرانے وقتوں کا آٹھ جماعت پاس تھا تو اکثر گاؤں کی بوڑھی عورتیں یا بندے اپنے دور دراز رہنے والے رشتہ داروں، عزیز و اقارب کو خط لکھوانے یا پڑھوانے اس کے پاس آجاتے تھے جس پر وہ بہت اتراتا تھا۔ اس کا اکثر شہر آنا جانا لگا رہتا تھا تو وہ کئی سرکاری محکموں سے واقف تھا۔ گاؤں کے لوگوں کے کام لے کر جاتا جن کے عوض وہ ان سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتا، مزید وہ کام کی تکمیل کے لیے کلرکوں اور افسروں سے جلد کام کروانے کے لیے سائلوں سے رشوت لیتا۔ تھوڑی بہت انہیں دے دیتا مگر وہ اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ اگر کوئی افسر یا کلرک اڑی (ضد) کرتا تو اس کے خلاف درخواست بازی شروع کر دیتا۔ لوگوں کو، اہلکاروں، افسران کو بلیک میل کرنا، دھونس، دھاندلی اور بے جا بحث کرنا اس کا وطیرہ تھا تو یہی وجہ تھی کہ لوگ اس سے دور بھاگتے اور کتراتے تھے۔

آج ملک فیروز کی بیٹی ثوبیہ کی شادی تھی۔ سارے انتظامات زبردست تھے۔ وقت مقررہ پر بارات آگئی تھی۔ بارات کے ساتھ ایک لڑکی تابندہ بھی آئی تھی۔ تابندہ کی عمر بیس سال تھی مگر دِکھنے میں وہ زیادہ سے زیادہ پچیس یا چھبیس کی لگتی تھی۔ تابندہ پہلی نظر میں کالو کے دل کو بھا گئی تھی۔ کالو کی اپنی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور ابھی تک اس کی شادی نہ ہوسکی تھی۔ جب تک تابندہ بارات کے ساتھ رہی کالو اسے ہی دیکھتا رہا۔ کالو کے پاس کافی پیسے جمع ہو چکے تھے اس کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا اس نے فوراً کھوج لگایا مگر اس سے پہلے وہ شادی کا پیغام بھیجتا اسے پتا چل گیا کہ تابندہ کی منگنی لالے نذیر کے بیٹے ماکھے کے ساتھ ہوچکی ہے اور دو ماہ کے بعد اس کی شادی ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ ماکھے کے ساتھ اس کی دعا سلام تو تھی مگر کچھ سوچ کر کالو نے ماکھے کے ساتھ دوستی کرنے کا سوچا تھا اور کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوگیا۔

ماکھے کی شادی میں کچھ دن رہ گئے تھے تو پتا چلا کہ گاؤں کی ایک لڑکی اپنے آشنا کے ساتھ ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ایک شہر میں چلی گئی ہے۔ لڑکی کے والدین بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

غریب لوگ تھے۔ تو اب کالو اس لڑکی کو بازیاب کروانے کے لیے خود ہی میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے لڑکی کے والدین سے ملا۔ ان سے پوچھ گچھ کی اور پھر وہ اس شہر پہنچ گیا جہاں لڑکی گئی تھی۔ وہاں دو دن رہنے کے بعد کالو نے لڑکے والوں سے ایک لاکھ روپیہ نقد وصول کیا اور اس لڑکی کا نکاح کروا دیا جبکہ وہ خود گواہ کے طور پر نکاح نامے میں موجود تھا۔ کالو بہت خوش تھا کہ مفت میں اسے ایک لاکھ روپے مل گئے ہیں۔ واپس آ کر اس نے لڑکی کے والدین کو سمجھایا کہ اس کے جانے سے پہلے ہی لڑکی اور لڑکی کا نکاح ہو گیا تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا، وہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔

جیسے ہی کالو واپس اپنے گاؤں میں آیا تو اگلے روز ماکھے کی شادی تابندہ سے ہوئی جس کا کالو کو بہت دکھ تھا۔ ماکھا ویسے تو بہت اچھا انسان تھا مگر وہ بہت جلد غصے میں آ جاتا تھا اور جلد ہی اس کا غصہ اتر بھی جاتا تھا۔ کالو اب روز ماکھے کے گھر جاتا اور روزانہ ہی کوئی نہ کوئی چیز لے کر جاتا اور ایک دو گھنٹے ماکھے کے پاس بیٹھ کر آتا۔ اب تابندہ کی شادی ماکھے سے ہو گئی تھی، دونوں ہنسی خوشی اپنی زندگی گزار رہے تھے تو کالو کو چاہیے تھا کہ وہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا مگر کالو تو ہر قیمت پر تابندہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ والے گاؤں میں ایک سفلی اور کالے علم والا بندہ رہتا تھا جس کا کیا ہوا علم تیر بہ ہدف ہوتا تھا تو کالو نے بڑے خفیہ طریقے سے اس بندے سے رابطہ کیا اور اسے ساری بات بتائی جس پر اس بندے نے منہ مانگی قیمت وصول کر کے ایک ہفتے کے اندر اندر کالو کے کام کا ہو جانے کا کہا اور پھر واقعی کام ہو گیا۔ ماکھے نے تابندہ کو طلاق دے دی تھی۔ جس نے بھی سنا تھا سب انگشت بدنداں رہ گئے کہ ماکھے اور تابندہ کی شادی کو ابھی ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور اتنی جلدی طلاق بھی ہو گئی؟

آج کالو بہت خوش تھا کیونکہ تابندہ کی عدت پوری ہو گئی تھی اور کالو سے شادی کی بات بھی طے ہو گئی تھی۔ پندرہ دن گزرے تو کالو پانچ یا چھ بندے اپنے ساتھ لے کر گیا۔ جب نکاح ہونے لگا تو تابندہ کی طرف سے کچھ شرائط رکھی گئی تھیں جن کے مطابق چھ لاکھ روپے حق مہر اور سارا زیور تابندہ کی ملکیت میں ہو گا۔ اب چونکہ یہ رشتہ کالو کی پسند کے مطابق تھا تو اس نے ہنسی خوشی سب کچھ لکھ دیا تھا۔ تو پچھلے ٹائم کالو تابندہ کو اپنی بیوی بنا کر لے آیا تھا۔ کالو بہت خوش تھا کہ جسے چاہا اسے پا لیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جیسے ہی رات ہوئی تو کالو نے تابندہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا مگر یہ کیا......؟ کالو ساری رات تابندہ کے ساتھ رہا مگر کچھ بھی نہ ہوا، پھر ایک ہفتہ، دو ہفتے، کالو روزانہ تابندہ کے پاس جاتا رہا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ کالو نے فوراً اپنا علاج کروانا شروع کر دیا۔ مہنگے حکیموں، سنیاسیوں اور ڈاکٹروں کے پاس چکر لگاتا رہا مگر جس پوزیشن پر وہ پہلے دن کھڑا تھا آج پورے تین ماہ گزرنے کے بعد بھی وہ پہلے دن والی پوزیشن پر کھڑا تھا۔ اب کالو بہت نڈھال اور پریشان ہر وقت گھر میں پڑا رہتا جبکہ تابندہ ایک ادائے خاص کے ساتھ مٹک مٹک کر چلتی رہتی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانچ مہینے گزر گئے۔ اب کالو نے گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا۔ اس کی ساری کی ساری پھڈے بازیاں اور دم خم ایک دم ختم ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات چارپائی پر پڑا رہتا جبکہ تابندہ ہر روز نہا دھو کر نئے نویلے کپڑے پہن کر گھر میں سارا دن گھومتی رہتی۔ اب پورے چھ مہینے گزر گئے تھے تو ایک دن تابندہ کالو کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس سے گویا ہوئی۔

"کالو جی اب تو پورے چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا تو اب بتاؤ کیا سوچا ہے آپ نے...؟"

تو کالو نے پوچھا کہ "کیا مطلب ہے تمہارا.....؟"

تو اس پر تابندہ نے کہا کہ "مطلب صاف ہے تم خود سمجھ دار ہو۔ تو ایسا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہوں تو کل یا پرسوں مجھے طلاق دے دینا بصورت دیگر اس گاؤں میں اور اپنے میکے کے گاؤں میں تمہاری مردانگی کا پول کھول دوں گی۔ اب یہ دونوں آپشنز تمہارے پاس ہیں۔ اب تم کس پر عمل کرو گے۔ تمہارے پاس کل تک کا ٹائم ہے، اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لینا۔"

اتنا کہہ کر تابندہ کالو کے پاس سے اٹھ گئی اور اپنے میکے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیگ تیار کر چکی تھی۔ اب کالو نے اسے بہت روکا مگر تابندہ نے اس کی ایک بات بھی نہ سنی اور اپنے میکے چلی گئی۔

اگلے تین دن تک تابندہ کو طلاق نامہ تو نہ ملا مگر ایک خبر سننے کو ملی جو کہ یہ تھی کہ کالو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گیا تھا جسے سن کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی کیونکہ وہ اب بھی ماکھے سے بہت پیار کرتی تھی۔

☆☆☆

سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ "پلیٹ فارم"

اسٹیشن پر جنم لینے والی کہانیاں.....جن میں جدائی اور ملن کی وصل بھی شامل ہے۔

ممتاز احمد کے قلم سے خوش اثر، رسیلی زہریلی کہانیاں، نازنیناں، نازپیشگاں کے قصے

فتنہ سامانیاں، جولانیاں لیے پلیٹ فارم نمبر کی سوغاتیں......

جنہیں قارئین سچی کہانیاں نے اپنی پسندیدگی سے نواز کر امر کر دیا۔

"پلیٹ فارم" اب کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

قیمت صرف =/500 روپے۔

زیر اہتمام: طلوع اشک پبلی کیشنز

رابطہ: 0300-4850461/0333-4524137

Email : tulooashk@yahoo.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

تازہ بیاں، فسانہ طراز مصنفہ کی پہلی تخلیق

گھر کا ناگھاٹ کا

ارم ناز

عمر کی نقدی ختم ہونے کو تھی کہ سردار صاحب کو غصہ آ گیا اور پھر.....

''سردار محمد خان اس بستی کے سب سے زیادہ معزز شخصیت سمجھتے جاتے تھے۔ شادی میں جہیز دے دیا۔ کسی بیوہ کے گھر راشن ڈلوا دیا۔ کسی غریب کی بچی کی کسی غریب بچے کو اسکول یونیفارم دلوا دیا تو کسی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

کورس کی کتابیں اور ہر ایک کے مشکل وقت میں کام آتے۔ تینوں بیٹے شادی شدہ تھے۔ بیٹی کو لاہور میں بیاہا تھا۔ سب ہنسی خوشی ایک ہی گھر میں ساتھ رہ رہے تھے۔ سردار محمد کی بیگم صابرہ بی بی بہت نیک و سلیقہ شعار خاتون تھیں۔ سردار محمد اور ان کی بیوی میں بہت محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے چالیس سال ساتھ گزارے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ بہویں ہونے کے باوجود صابرہ بی بی سردار صاحب کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ سردار صاحب گرم گرم توے سے اتری ہوئی روٹی کھاتے شوربے والا سالن انہیں سخت ناپسند تھا۔ کھانے کے فوراً بعد موسم کا کوئی بھی پھل کھاتے۔ صابرہ بی بی سردار صاحب کو کھانا دیتیں تو پھل لے کر بیٹھتیں کھانے کے فوراً بعد پھل کاٹ کر پیش کیے جاتے۔ اگر ان کے کسی کام میں تاخیر ہو جاتی تو وہ ناراض ہو جاتے اور یہ ناراضگی ہفتوں چلتی اور پھر صابرہ خاتون انہیں منانے کی ہر ممکن کوشش کرتیں اور پھر اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتیں۔ یہ مناظر دیکھ کر بہویں آپس میں چہ میگوئیاں کرتیں اور ہنستیں۔

''ابا جان، اماں سے آج بھی جو چونچلے کرواتے ہیں جب کہ یہ عمر تو اللہ اللہ کرنے کی ہے۔ انہیں بہوؤں اور بیٹوں کی شرم بھی نہیں ہے۔ آج بھی ان کا کمرہ الگ ہے۔ ابا، نانا، دادا بن گئے مگر اماں کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاتے۔ الیکٹرونکس کی چلتی ہوئی بڑی دکان تھی۔ تینوں بیٹے اور سردار صاحب دکان پر ہی بیٹھتے تھے۔ گزر بسر بہت عمدہ ہو رہی تھی۔

ایک مرتبہ موٹر سائیکل کی ٹکر سے سردار صاحب کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا۔ سردار صاحب پلستر چڑھا پیر لے کر گھر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے دو ماہ آرام کے لیے کہا۔ لڑکے کہاں تک خدمت گزاری کو گھر رکتے دکان کا بھی حرج ہو رہا تھا اسی لیے ہفتے بعد ہی تینوں دکان جانے لگے۔ صابرہ بی بی نے سردار صاحب کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا۔ چوزے کی یخنی، چقندر کا تازہ جوس، رات میں ہلدی والا گرم دودھ، خشک میوے کا ہریرہ اتنے طاقت کے کھانے کھا کر سردار صاحب کو لگتا تھا جوانی واپس لوٹ آئی ہے۔ صابرہ بی بی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں لگے رہتے۔ صابرہ بھی ان کے جملے سن کر چھوئی موئی بنی رہتیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ شادی کے ابتدائی دن واپس لوٹ آئے ہیں۔ سردار صاحب دن میں دس مرتبہ یہ بات دہراتے۔

''صابرہ تم میری بہت خدمت کرتی ہو۔ تمہارے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ تم نے میری زندگی کو جنت بنا دیا۔''

صابرہ بیگم کا وقت سردار صاحب کی ہمراہی میں کمرے کے اندر ہی گزرتا۔ بہویں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرارتی ہنسی ہنستیں۔ تقدیر کھڑی کہہ رہی تھی۔ دیکھو ذرا اب میں کیسا کھیل کھیلتی ہوں۔

سردار صاحب بھلے چنگے ہو گئے۔ دکان جانے لگے۔ بہوؤں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو طوطا مینا کی کہانی ختم ہوئی۔ دن ہنسی خوشی گزرنے لگے ہوا یوں کہ ایک صاحب سردار صاحب کی دکان سے واشنگ مشین خرید کر لے گئے اور دو دن بعد ہی واپس لے آئے کہ یہ مشین خراب ہے جب کہ سردار صاحب کا کہنا تھا کہ دکان سے مشین صحیح گئی تھی۔ اسی لڑائی جھگڑے میں بات آگے بڑھ گئی۔ کافی رش لگ گیا مجبوراً بات ختم کرنے کے لیے سردار صاحب کے بیٹے نے مشین واپس لے کر رقم واپس کر دی۔ سردار صاحب کا موڈ خراب تھا اور بلڈ پریشر بھی ہائی تھا۔ بیٹے نے کہا۔

''ابا! آپ رکشے میں مشین لے کر گھر چلے جائیں۔ یہ واشنگ مشین گھر میں کام آجائے گی۔''

بڑے بیٹے نے رکشہ روک کر مشین رکھی اور سردار صاحب اس میں بیٹھ گئے۔ گھر پہنچے مشین گھر کے اندر لے کر آرہے تھے سامنے کمرے سے صابرہ بی بی نکل رہی تھیں۔

''ارے گھر میں پہلے ہی تین تین واشنگ مشین موجود ہیں۔ آپ پھر یہ کیوں اٹھا لائے۔'' سردار

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

صاحب خاموش رہے۔ صابرہ نے پھر ذرا بلند آواز میں سوال کیا۔

''ارے یہ مشین کیوں اٹھا لائے۔'' سردار صاحب نے دانت پیستے ہوئے صابرہ کی طرف دیکھا اور تین مرتبہ با آواز بلند طلاق طلاق کہا۔ غصہ حرام ہے اور اس حرام غصے نے ان کے لیے ان کی بیوی کو بھی حرام کر دیا۔ صابرہ بی بی چکرا کر گر پڑیں۔ سردار صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ بہوؤں نے فون کر کے بیٹوں کو گھر بلا لیا۔ صابرہ بی بی تو جیسے پتھر کی ہو گئیں۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ اس بڑھاپے میں سردار صاحب ان کی خدمت کا یوں صلہ دیں گے۔

طلاق کی بازگشت ان کے کانوں میں اب بھی گونج رہی تھی۔ اس عمر میں طلاق، کسی کو پتا لگا تو بڑی جگ ہنسائی ہوگی اگر بیٹی کے سسرال خبر پہنچ گئی تو یہ سوچ کر ہی صابرہ کا دل دہل جاتا۔ سردار صاحب ہاتھ ملتے، سر پکڑتے عجیب کیفیت کا شکار تھے۔ زبان سے نکلے الفاظ واپس نہیں پلٹ سکتے تھے۔ آٹھ دن گزر گئے روز مل بیٹھتے مگر مسئلے کا حل نہیں نکل رہا تھا۔

صابرہ نے اپنا کمرہ الگ کر کے سردار صاحب سے پردہ شروع کر دیا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ سردار صاحب کی بڑی بہن کو راز دار بنایا جائے۔ دین دار خاتون ہیں۔ ایک عمر گزار دی یہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دیں گی۔ سردار صاحب کا بڑا بیٹا بڑی پھوپو جان کو ٹیکسی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھوپو جان تخت پر بیٹھیں تو دربار لگ گیا۔ تمام مسئلہ گوش گزار کیا گیا۔ پھوپو جان نے بے یقینی کی سی کیفیت میں سردار صاحب کی طرف دیکھا۔

''کیوں سردار! بیوی کی خدمتیں سمیٹ کر اس آخری وقت میں اس کے منہ پر مار دیں۔''

''آپا معاف کر دیں۔ بڑی غلطی ہوگئی۔''

''اب حل تو صرف یہ ہی ہے کہ صابرہ کا نکاح کسی سے کروایا جائے پھر وہ اگر اپنی مرضی سے طلاق دے تو تم بعد عدت اس سے نکاح کر لو۔'' صابرہ بی بی چیخ اٹھیں۔

''اس عمر میں ایسی آزمائش..... عورت ہونے کی سزا کہاں کہاں بھگتنی ہوگی۔ چالیس سال گزار کر بھی سردار صاحب کے آگے معتبر نہ ہو سکی۔ انہوں نے اس عمر میں میرے قدموں سے زمین اور سر سے آسمان چھین لیا ہے۔'' پھوپو جان نے صابرہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''صابرہ یہ تمہاری ہی نہیں سردار صاحب کی بھی آزمائش ہے۔ یہ اس کی غیرت کا امتحان ہے۔'' اب حلالہ کے لیے ایک مرد بھی چاہیے تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد طے یہ پایا کہ چھوٹی پھوپو کا بیٹا آصف جو کہ نشے کا عادی ہے اس سے صابرہ کا نکاح پڑھوایا جائے اور جب وہ طلاق دے تو سردار صاحب اور صابرہ کا نکاح ہو جائے۔ چھوٹی پھوپو سے صلاح مشورہ کیا گیا تو وہ کچھ پس و پیش کے بعد مان گئیں۔ آصف نشے کا اتنا عادی تھا کہ نشہ کرنے کے بعد کسی نالے میں کچرے میں جہاں جگہ ملتی مدہوش ہو جاتا۔

سردار صاحب کے دونوں بیٹے آصف کو نالے سے اٹھا لائے۔ نہلایا دھلایا، کھانا وغیرہ کھلا کر اس کو نکاح کے لیے راضی کیا۔ وہ راضی ہو گیا۔ صابرہ بی بی کا نکاح آصف سے پڑھوایا گیا۔ صابرہ بی بی رخصت ہو کر چھوٹی نند کے گھر حیدر آباد چلی گئیں۔ دس بارہ دن گزر گئے اب انتظار تھا کہ آصف صابرہ کو طلاق دے۔ سردار صاحب کا ایک ایک پل کانٹوں پر گزر رہا تھا۔ ادھر حیدر آباد میں آصف کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ نہایا دھویا، صاف ستھرا رہنے لگا اور پانچ دن سے تو کسی فیکٹری میں کام پر بھی جانے لگا۔

سردار صاحب کی چھوٹی بہن بیٹے کو سدھرتا دیکھ کر بہت خوش تھیں انہوں نے تو آصف کی طرف سے امید ہی چھوڑ دی تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کسی روز کسی نالے یا کچرے سے آصف کی لاش ملے گی۔ صابرہ نے اپنی خدمت اور محبت سے آصف کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ آصف کسی طور صابرہ کو طلاق دینے پر راضی نہ تھا اور صابرہ بھی بقیہ زندگی آصف کے ساتھ گزارنا چاہتی تھیں۔ رہ گئے سردار صاحب ان کی قسمت میں اب صرف خسارہ تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیا جلے

ارم ناز

دیارِ غیر بسنے والوں کے لیے اِک ریڈ سگنل، ارم ناز کے قلم سے

افضل رحمٰن ہفتہ بھر پہلے ہی لندن سے وطن واپس لوٹے تھے۔ بیوی بچوں میں واپس لوٹ کر خوش ہونے کے بجائے بڑے افسردہ دکھائی دیتے تھے گو کہ بیوی بچوں نے انہیں بڑے والہانہ انداز میں ویلکم کیا تھا۔ بچے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ چار سال پہلے بچے بہت چھوٹے تھے۔ گھر کے حالات بہت خستہ تھے۔ چھ سال انہوں نے جان توڑ محنت کی وطن سے اور بیوی بچوں سے دوری نے بہت ستایا۔

پل پل دل یہ کرتا کہ دیارِ غیر کو چھوڑ کر وطن واپس آ جائیں مگر پھر خیال آتا کہ نہیں تھوڑا اور کما لو تو گھر بن جائے۔ پھر گھر بن گیا تو گھر میں سامان بھرنے کے لیے کمایا۔ پھر بچوں کو چھوٹے اسکول سے اٹھا کر بڑے نامی گرامی اسکول میں ایڈمشن کرایا۔ پھر بہن کی شادی سر پر آئی تو اس کا خرچہ۔ پھر یہ خرچہ پھر وہ خرچہ اسی کھینچا تانی میں چھ سال بیت گئے۔ کمپنی نے ہر سال چھٹی کی آفر کی مگر یہ سوچ کر ٹکے رہے کہ بلاوجہ آنے جانے پر اتنا خرچہ ہوگا۔ تحفے تحائف الگ بے جا خرچے سے بہتر ہے چند مہینے اور گزار لو۔ یہ ہی کرتے کرتے چھ سال بیت گئے۔ اب جب چھ سال بعد واپس آئے تو گھر بھی بہترین بن چکا تھا۔ سامان بھی ایک سے ایک تھا۔ بہن اپنے گھر خوش تھی۔ بچے بڑے اسکول میں تعلیم پا رہے تھے مگر انہیں اپنی منکوحہ بڑی سرد مزاج دکھائی دیں۔ اس کے مزاج میں وہ گرمجوشی نہ تھی جو وہ چھ سال پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ بظاہر تو وہ افضل کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔ کھانے پینے کا خیال رکھ رہی تھی۔ سجی سنوری تھیں مگر جو تبدیلی شوہر ہونے کے ناتے افضل نے محسوس کی تھی اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جا سکتا تھا۔

افضل بہت ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے چھ سال کا لمبا عرصہ گزار آنے کے بعد بیوی سے اس سرد مہری کی امید نہ تھی۔ اس رویے کی وجہ کیا تھی؟ افضل سمجھ نہیں پا رہے تھے کیا ان کی غیر موجودگی میں ان کی بیوی کسی اور کے ساتھ..... یہ سوچ کر ہی افضل کو جھرجھری آ گئی۔ نہیں نہیں وہ اس طرح مجھ سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ پھر سوچ بے ایمان ہو جاتی۔

جوان ہے خوب صورت ہے شاید میری جدائی سہہ نہ پائی۔ شاید نفس قابو نہ آیا ہوگا اور..... اگر طلاق دیتا ہوں تو بچے برباد ہو جائیں گے۔ رشتے دار کیا کہیں گے۔ ملنے جلنے والے کیا سوچیں گے۔ کسی رشتہ دار سے مشورہ کرتا ہوں تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پھیل جائے گی۔ خاندان میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو جائیں گی۔ اس کا اثر بچوں پر بھی ہوگا۔ بڑی ہوتی بیٹی کو کون بیاہے گا۔ ماں کا ماضی بیٹی پر اثر انداز ہوگا۔

افضل کو اپنے واپس آنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں واپس آیا ہی کیوں۔ نہ ہی واپس آتا نہ یہ سب دیکھتا۔ بعض اوقات دماغ دل کی نفی کرتا تو نئی سوچ ذہن میں ابھرتی کہ شاید ایسا کچھ ہوا ہی نہ۔ میرا شک غلط ہو۔ افضل نے اپنے سب سے قابل دوست بھروسہ دوست سے ذکر کیا دوست ذرا مذہبی واقع ہوا اس نے پہلے تو اچھی طرح سے افضل کا دماغ اس کی بیوی کے خلاف نفرت سے بھر دیا پھر ایک نام نہاد مولوی سے فتویٰ دلوا دیا کے فوراً بیوی کو طلاق دے۔ غلطی سراسر بیوی کی ہے۔ ایسی بدکار عورت کو تو قتل کرنا ثواب ہے۔

مولوی صاحب انہی لوگوں میں سے تھے جو مذہب کو اپنے حساب سے موڑ لیتے ہیں۔ وہ اسلام کو جیسا پیش کرتے ہیں اسلام ایسا ہرگز نہیں۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے عورتوں کے معاملات میں نرمی کا حکم دیا۔ عورت کو ہر مقام پر عزت دی۔ وہ اسلام ہی تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفنانے والی رسم کو ختم کیا مگر منافقین آج بھی لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی دکان سجائے بیٹھے ہیں۔ تعلیم یافتہ افضل جو لندن جیسے آزاد ملک میں رہ کر آئے تھے ایک وقت ان کو یہ سوچ بھی آئی کے ایسی بدکردار عورت کے ناک کان کاٹ کر اسے زمانے کے لیے عبرت کا نمونہ بنا دیں۔ دو ماہ بعد انہیں پھر واپس جانا تھا۔

ان کی غیر موجودگی میں کون تھا جو ان کی بیوی کے ساتھ عیش و عشرت سمیٹ رہا تھا۔ انہیں یہ پتا لگانا ہی ہوگا۔ آیا وہ خاندان کا ہی کوئی مرد ہے یا باہر کا۔ اس راز سے پردہ اٹھ جائے تو وہ جلد ہی بیوی کا فیصلہ کر دیں گے۔ عصر کی آواز پر افضل مسجد کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ نماز ادا کر کے نکل رہے تھے تو اسکول کے ایک پرانے دوست سے ٹکراؤ ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوست بہت اصرار کر کے افضل کو اپنے گھر لے گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد افضل کے دوست شفیق نے افضل سے پوچھا۔

''کیا کچھ پریشان ہو۔'' افضل نے ہمدردی پا کر پریشانی کی وجہ بتا دی۔ شفیق نے افضل کو اگلے دو بجے آنے کو کہا اور تسلی دی کہ تمہاری پریشانی کا حل میرے ایک محترم بزرگ ضرور بتا دیں گے وہ بہت لوگوں کو قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ افضل گھر واپس آ گئے۔ تمام رات پہاڑ جیسی بھاری گزری۔ متعدد بار بیوی نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کیوں کروٹیں بدل رہے ہیں کیا طبیعت خراب ہے مگر انہوں نے کچھ نہیں بس نیند نہیں آ رہی ہے کہہ کر بیوی کو مطمئن کر دیا۔ بیوی جانتی تھی کہ افضل صاحب بہت دنوں سے خاموش ہیں اور یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

☆......☆

رات انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزر گئی۔ دو بجے افضل نے شفیق کے گھر کی راہ لی۔ دروازے سے ہی با آواز بلند شفیق کو آواز دی۔ شفیق باہر آ گیا۔ افضل اور شفیق بائیک پر بیٹھ کر بزرگ کے گھر پہنچے۔ مہمان خانے میں داخل ہوئے۔

بزرگ تخت پر تشریف فرما تھے۔ شفیق اور افضل نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ نورانی چہرے اور روشن آنکھوں والے بزرگ افضل کو بہت اپنے سے لگے۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں شفیق نے بزرگ کو افضل کا مسئلہ بتایا جو انہوں نے خاموشی سے سنا پھر افضل سے گویا ہوئے۔

''برخوردار جوان بیوی کو کس کے ذمہ کر کے گئے تھے۔ اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کے یا پھر بیوی کے ماں باپ اور بھائی بہن کے۔'' افضل نے جواب دیا۔

''کسی کے نہیں وہ گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ تھی۔'' بزرگ بولے۔

''پہلی غلطی تم نے یہی کی کہ اسے تن تنہا چھوڑ کے سات سمندر پار چلے گئے۔ کیا تم نے اس سے اس متعلق باز پرس کی۔'' افضل نے جواب دیا۔

''نہیں۔'' بزرگ بولے۔

''دوسری غلطی تم نے یہ کی کہ اپنا شک مجھ پر یعنی ایک غیر مرد پر ظاہر کیا مگر وہ جو تمہارے نکاح میں ہے تم اس کے اور وہ تمہارا لباس ہے اس سے غیریت برتی۔ اپنی منکوحہ سے سوال جواب کرتے یہ تمہارا حق تھا۔ ممکن ہے کہ یہ محض تمہارا وہم ہو ایسی کوئی بات سرے سے ہی نہ ہو۔ کیا تم سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا ہے۔ ہم جس نبی کی امت ہیں انہوں نے کبھی صحابہ اکرام کو دو ماہ سے زیادہ دینی تبلیغ میں یا غزوات میں نہ روکا بلکہ فرمایا۔

''اپنے گھر اپنے بیوی بچوں میں جاؤ جب کہ تم چھ سال جوان بیوی کو چھوڑ کر دیار غیر میں بیٹھے رہے اسلام نے تو یہاں تک حکم دیا ہے کہ اگر تمہارے گھر میں ایک بیوہ بیٹی ہے اور ایک کنواری تو بیوہ کی شادی پہلے کرو۔ غلطی سراسر تمہاری ہے۔ اب عقلمندی اسی میں ہے کہ وطن میں رہتے ہوئے ہی کوئی کام کرو اور اپنا وقت بیوی بچوں کو دو۔ قناعت پسندی اختیار کرو۔ زندگی آسان ہو جائے گی۔

''افضل کی سمجھ میں بات آ گئی۔ افضل گھر پہنچے تو بڑے مطمئن تھے۔ جیسے دماغ سے بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ بیوی بچوں سے ہنسے بولے اور بیوی کو یہ بھی بتایا کہ وہ اب واپس نہیں جائیں گے بلکہ یہیں رہتے ہوئے کوئی کام کریں گے۔

اگلے ماہ افضل نے اپنے ہی علاقے میں ایک بڑا جنرل اسٹور کھول لیا۔ افضل ایماندار تھے۔ اس لیے اسٹور چل نکلا۔ بیوی کے معاملے میں ان کا شک وہم ثابت ہوا۔ بیوی نے سرد مہری دکھا کر احتجاج کیا تھا کہ وہ کیوں اسے اتنے عرصے کے لیے تنہا چھوڑ گئے تھے۔

اس طرح شفیق کے محترم بزرگ نے افضل کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک گھر ٹوٹنے سے بچا لیا اور اسلام کے نام پر دکان سجانے والے نام نہاد کو مات ہوئی۔ جان سے جاتے جاتے پھر سے دیے کی لو محبت کے ایندھن سے ایستادہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

تازہ بیان، فسانہ طراز مصنفہ کی تیسری تخلیق

حسین گناہ

ارم ناز

مختصر نمبر کے لیے ڈگر سے ہٹ کر ایک تحریر خاص، جو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی

میں انہی گلی محلوں میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔ میں نے زمانے کے بڑے سرد و گرم دیکھے مگر اب دن کے وقت میرا ٹھکانا اچھو قصائی کا پھٹا تھا۔ البتہ رات کے وقت میں گراؤنڈ کے سامنے جمال الدین کی کار کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

نیچے کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ میری ماں نے ایک رات تین پلے جنے تھے۔ میں سب سے بڑا تھا پھر ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ بھائی تو میرے ساتھ ہی گھومتا پھرتا تھا۔ میری بہن دور دراز کے علاقوں میں گھومتی پھرتی۔ ایک روز اسے کسی گاڑی نے ٹکر ماردی۔ میں نے اس کی لاش سڑک پر پڑی دیکھی۔ نافرمان سہی مگر تھی تو میری ماں جائی۔ میں دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اگلے دو دن بھی وہ سڑک پر ہی پڑی رہی۔ اس کی لاش سے تعفن اٹھنے لگا۔ وہ پھول کر غبارہ ہوگئی، جب راہ گیروں کو گزرنے میں پریشانی ہونے لگی تو ایک صبح میونسپلٹی کی کچرا اٹھانے والی گاڑی اسے اٹھالے گئی۔ میں دیر تک جاتی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ مجھے اپنی بہن کا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ بہت شریر تھی۔ ہم بہت کھیلا کرتے، اگر کوئی بچہ اس پر پتھر اٹھاتا تو میں بہت زور سے اس پر بھونکتا۔ بچہ ڈر کر پتھر پھینک دیتا۔

میرا تعلق جانوروں کی اس نسل سے ہے جسے کتا کہتے ہیں۔ میرے بچپن اور جوانی کا نام انسانوں کے لیے گالی ہے۔ تہذیب یافتہ لوگ مجھے ڈوگی پکارتے ہیں۔ ڈوگی کہہ کر بھی پتھر پڑتا ہے اور کتا کہہ کر بھی۔ نسلی تعصب ہم میں بھی ہے۔ اعلیٰ نسل کے کتے امیر شہر پالتے ہیں۔ شیمپو سے نہلاتے ہیں، بہترین کھانا کھلاتے ہیں، ایسا کھانا جو تیسری دنیا کے انسانوں کو دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ میں اعلیٰ نسل نہ تھا۔ میری اوقات تو دھوبی کے کتے جیسی تھی۔ میں صبح سات بجے سے لے کر دوپہر دو بجے تک قصائی کے ٹھیے کے آس پاس گھومتا قصائی بھی انتہائی کنجوس تھا، وہ شاذونادر ہی کوئی چھیچھڑا ہوا میں اچھالتا اور میں لپک کر اسے پکڑ لیتا۔ کبھی کوئی دوسرا ساجھے دار بھی موجود ہوتا تو اس چھیچھڑے کے پیچھے وہ فساد ہوتا کہ خدا کی پناہ مگر پچھلی دو جمعرات سے مسجد کے سامنے رہنے والے صابو کا لڑکا فضل گوشت سے پُر ہڈی میرے سامنے ڈال رہا تھا۔ مگر یہ دعوت صرف جمعرات کے دن تک ہی محدود تھی۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو ایسی دعوت روز روز ہوتی، میں ہڈی کھا کر اس عامل کو دعا دیتا جس نے فضل کو سات جمعرات ہڈی کسی کتے کو ڈالنے کا کہا تھا۔

میں نے فضل کو کسی سے یہ کہتے سنا تھا کہ ایک بہت پہنچے ہوئے عامل نے فضل کو یہ عمل کرنے کو کہا تھا۔ ایسا کرنے سے فضل کی شادی اپنی من پسند لڑکی سے ہو جائے گی۔ فضل جب میرے آگے ہڈی ڈالتا میں اس کے قدموں میں لوٹ جاتا۔ وہ سمجھ جاتا کہ میں اس کا شکریہ ادا کررہا ہوں۔ میں نے جب قصائی کے برابر کریانہ اسٹور کی طرف نظر اٹھائی تو وہی حرامزادہ بڈھا کرسی پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ یہ مردود بڈھا کریانہ اسٹور کے باہر ہر دوسرے تیسرے روز کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا تھا۔ اسٹور کا مالک خوش ہوتا کہ بزرگ بیٹھا تسبیح پڑھ رہا ہے، کاروبار میں برکت ہوگی مگر ملعون بڈھا بڑی گندی نظر اور سوچ والا تھا۔ یہ وقت اسکول کے بچوں کی چھٹی کا تھا۔ چھٹی کے وقت گزرتی ہوئی بچیاں کچھ دیر کے لیے کریانہ اسٹور پر چیز لینے کے لیے رکتیں، تو یہ دعائیں دینے کے بہانے اپنا کام کرجاتا، اس کا ہاتھ بچیوں کے جسم پر عجیب طرح سے رینگ جاتا اور بچی سہم کر رہ جاتی۔ میں اس کی مدد کو زور زور سے بھونکنے لگتا۔ یہ مردود سب بھول بھال پتھر اٹھا کر مجھے مارتے ہوئے ایک گندی گالی بکتا، اس عرصے میں بچی بھاگ جاتی، بڈھا ہاتھ ملتا رہ جاتا۔ میں دل میں سوچتا کہ میں تو ہوں ہی کتا مگر اس بڈھے کو کیا نام دوں۔

کچھ دنوں سے قصائی کنجوسی کے ساتھ ساتھ بے ایمانی بھی کرنے لگا تھا۔ اب وہ کوئی چھیچھڑا نہ اچھالتا بلکہ قیمے کے ساتھ کوٹ کر بیچ دیتا۔ میں خوراک کی تلاش میں کچرے کے ڈھیر تک پہنچ جاتا، یہاں کتوں کے ایک گروپ کی اجارہ داری تھی۔ وہ مجھے کچرے کے قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ تو میری اس گروپ سے بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں میری دم ٹوٹ کر آدھی رہ گئی۔ اب مجھے اس ٹوٹی دم کے ساتھ جینا تھا۔ اسی گروپ میں ایک شیلا بھی تھی، سنہری چکنی جلد، بڑی بڑی آنکھوں والی شیلا اسے دیکھ کر میرا دل عجیب طرح دھڑکتا تھا۔ اب سمجھ آیا کہ فضل عامل کی بات پر آنکھ بند کر کے کیوں عمل کررہا تھا۔ اس کئی دم کے ساتھ میں شیلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ میں بلا مقصد ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ دن تمام ہوا۔ آج کھانے کو کچھ نہ ملا میں جمال الدین کی کار کے نیچے ستانے کو لیٹ گیا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا مگر بھوک کے پیٹ کی وجہ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں گاڑی کے نیچے سے نکلا دیکھا کہ جمال الدین کی دیوار پر چڑھا شلوار قمیص پہنے ایک مرد دوسری طرف کودنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ پھر یاد آیا ایسا تو چور کرتے ہیں۔ یہ یقیناً چور ہے۔ میں جمال الدین کی کار کے نیچے سوتا تھا۔ اس کا حق تو ادا کرنا ہی تھا۔ میں نے خاموشی سے دبے قدموں جا کر اس کا پائنچہ اپنے دانتوں میں دبا لیا اور کھینچنے لگا۔ ایک، دو، تیسری مرتبہ اس کی شلوار کھل کر میرے منہ پر آ گئی اور وہ مارے خوف سے دیوار پر لٹکا رہ گیا۔ اس کا پائنچہ اب تک میرے دانتوں میں تھا۔ میں شلوار منہ میں دبائے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب اس حالت میں چور اندر تو کود نہیں سکتا تھا۔ وہ تو نیچے اتر کر بھی چھپ چھپا کے گیا ہوگا۔ یوں میں نے جمال الدین کا حق ادا کر دیا۔

اگلی صبح مجھے شیلا نظر آئی۔ چڑھتے سورج کی روشنی میں شیلا شہد جیسی سنہری لگ رہی تھی۔ نپے تلے قدم رکھ رہی تھی جیسے کوئی شہزادی اپنے محل کی سیر کر رہی ہو۔ میں دور کھڑا اسے دیکھتا رہا مگر میرے اندر کا عاشق اتنی جرأت نہ کر پایا کہ اس کے قریب ہو جاؤں یا کوئی بات کروں۔ ویسے تو میں بڑا جی دار مشہور تھا مگر شیلا کے آگے چوہا بن جاتا تھا۔ پچھلی گلی سے شور کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ میں دوڑ کر گلی کے کونے پر کھڑا ہو گیا کچھ مرد جمع ہو کر چندا کے گھر کے آگے جمع تھے۔ وہ وقفے وقفے سے چندا کا دروازہ بجاتے مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ سارے محلے والے چندا کے خلاف تھے۔ چندا تیس بتیس سالہ خوب صورت لڑکی تھی۔ بڑے گلے کے چست کپڑے پہنتی تھی۔ چندا تھی بھی چاند جیسی۔ جس نے بھی رکھا تھا بڑا مناسب نام تھا۔ دنیا میں یا تو چندا حسین تھی یا شیلا مجھے نہیں معلوم لوگ چندا کو برا کیوں کہتے تھے۔ میرے لیے تو چندا بہت رحم دل تھی۔ گوشت کا بچا سالن ہڈیاں ٹوٹی پلیٹ میں ڈال کر تھڑے پر رکھ دیتی تھی۔ میرا پیٹ بھرنے والی بری نہیں تھی۔ اس کے گھر غیر مردوں کا آنا جانا تھا۔ ایسا محلے دار کہتے تھے۔ یتیم لڑکی تھی سر پر کوئی مرد نہ تھا۔ پیٹ کی بھوک وہی جانتا ہے جس نے فاقے کاٹے ہوں چندا بھی پیٹ کی بھوک سے مجبور تھی۔ شرافت کا ڈھول پیٹنے والے کسی محلے دار نے کبھی چندا کی بھوک کا خیال نہ کیا۔ چندا کو جو طریقہ بھلا لگا اس نے وہی کیا یعنی بھوک کا سودا بھوک سے۔ محلے دار بری طرح دروازہ بجا رہے تھے۔ چندا نے دروازہ کھولا مجنونوں نے اس پر پتھروں کی بارش کر دی۔ پتھر لگتے ہی سرخ سرخ لہو چندا کے ماتھے سے بہہ نکلا۔ میں نے خون دیکھ کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔ پتھر لگنے کی تکلیف مجھ سے زیادہ کون جانتا تھا۔

دسمبر کی ابتداء تھی لوگ گھروں میں دبک گئے تھے۔ رات آٹھ بجے ہی سڑک سنسان ہو جاتی تھی۔ اکا دکا مونگ پھلی کے ٹھیلے ہی گزرتے تھے۔ باقی تمام وقت کتوں کا راج تھا۔ زیادہ سردی لگتی تو کوئی نہ کوئی کتا منہ اونچا کر کے لمبی آواز نکالتا۔ باقی اس کے پیچھے بھونکنے لگتے۔ شیلا نے دسمبر کے اوائل میں چار بچے دیئے تھے۔ وہ بھی بچوں کو لیے چھپی بیٹھی تھی۔ میں سنسان سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ سامنے کوئی لڑکی پرس ہلاتی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک موٹر سائیکل سوار آ رہا تھا۔ اچانک موٹر سائیکل سوار سامنے آ کر لڑکی کا پرس چھیننے لگا۔ لڑکی نے پرس مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں بھاگ کر تھوڑا اور قریب چلا گیا۔

''ارے یہ تو فضل کی بہن تھی اور یہ لڑکا اس کا پرس زبردستی چھین رہا تھا......'' میں نے لڑکے کی پنڈلی میں اپنے دانت گاڑ دیئے، خون کا نمکین ذائقہ میرے منہ میں گھل گیا۔ وہ پرس بھول بھال اپنی ٹانگ مجھ سے چھڑانے لگا۔ میں نے بھی پوری طاقت دکھاتے ہوئے اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ فضل کی بہن پرس لے کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ جب لڑکے نے دیکھا کہ وہ میری گرفت سے خود کو چھڑا نہیں پا رہا تو اس نے جیب سے پستول نکال کر گولی میری آنکھوں کے درمیان داغ دی۔ ٹھاہ کی آواز آئی اور میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میرا دماغ تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور دور ہوتی گئی۔ میرے سامنے میری بہن کی لاش آ گئی جس سے تعفن اٹھ رہا تھا پھر چھم سے شیلا کا سنہرا سراپا، پھر چندا اور چندا کے ماتھے سے بہتا سرخ لہو، فضل اور اس کی ڈالی ہوئی ہڈی، تمام منظر دھندلا گئے۔ جاڑے کی سیاہ راتوں جیسا سناٹا چھا گیا۔

☆☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سخن پرور مصنفہ کی زنبیل کا پہلا رتن

تیرے میرے بیچ میں

حنا بشریٰ

آج کے بے راہ رو معاشرے کی حقیقی عبرت ساماں تحریر

ارفع اور زنیرا نے خودکشی کر لی..... اخبار میں ان کی تصویر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ معمول کی خبر ہو گی مگر ان دونوں کی موت نے میرا دل دہلا دیا تھا۔ ہم سوچتے ہیں آسمان سے پتھر کیوں برسائے جاتے ہیں۔ سورج پہلے کی نسبت اب کیوں آگ زیادہ برسانے لگا ہے۔ کیوں مسلمان تنزلی کا شکار ہیں۔ قحط سے بھوکے مر رہے ہیں۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں دردناک زلزلے..... آخر ہم کیوں اور کس منہ سے اللہ سے شکوہ کرتے ہیں۔ وہ تو ہمیشہ سے غفور و رحیم ہے۔ ہم خود اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ دن کے اجالوں اور رات کے اندھیروں میں کیے گئے چھوٹے بڑے گناہ ہمیں اس کے عذاب سے دوچار کرتے ہیں جب معاشرہ قوم لوط علیہ السلام جیسے گناہوں کا مرتکب ہو گا تو عذاب بھی اسی نوعیت کے ہوں گے۔

ہم تینوں کالج میں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ زنیرا بے انتہا خوب صورت اور ملنسار تھی۔ ہمارے گروپ میں ارفع کا اضافہ ہوا۔ دونوں کی خوب بنتی تھی۔ طبیعت میں شوخی اور ہلا گلا کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں میں کچھ تبدیلیاں سی آنے لگیں۔ وہ دونوں الگ تھلگ سی رہنے لگی۔ ارفع کی تبدیلی نے تو مجھے حیران و پریشان کر دیا۔ اس نے اپنا حلیہ بدل ڈالا، بال کٹوا کر لڑکوں کی طرح کروا لیے۔ گلے میں چین دونوں کلائیوں میں بلیک بینڈ جولڑکے فیشن کے طور پر پہنتے ہیں۔ دوپٹے کو خیرباد کہہ دیا اور بلیک جوتوں کی جگہ بلیک جوگرز نے لے لی۔ ٹیچرز، پرنسپل کی طرف سے اکثر اسے وارننگ آؤٹ یونیفارم ہونے کا نوٹس دیا جاتا مگر اس نے ڈھیٹ پن بھی لڑکوں جیسا لے لیا تھا۔ ٹیچرز اسے اس حلیے پر سرزنش کرتیں مگر کالج کی لڑکیوں میں اس کا بوائے فرینڈ روپ بہت مقبول ہو رہا تھا۔ کالج میں لڑکوں کے داخلے پر پابندی تھی اس لیے لڑکیاں اسے لڑکے کے روپ میں دیکھ کر خوش ہو جاتیں۔

اس نے اپنے بولنے کا انداز، چال ڈھال سب کچھ لڑکوں جیسا کر لیا۔ بات کرتے ہوئے سائیڈ پر آوارہ لڑکوں کی طرح تھوکتی۔ مجھے اس کا ہر انداز حیران کر رہا تھا۔ ارفع کی اس تبدیلی کے پیچھے کیا وجہ تھی۔ یہ سوانگ اس نے کس لیے بھرا تھا۔ یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا۔ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس کے اردگرد یوں جمع رہتی بلکہ اس سے یوں آٹو گراف لے رہی ہوتی جیسے وہ ''بالی ووڈ'' کا کوئی مشہور ہیرو ہو اور اپنی زیارت کرواتے گرلز کالج آیا ہو۔ خود تو وہ ہر دم لڑکیوں کے ہجوم میں گھری رہتی مگر زنیرا کو کسی کے ساتھ برداشت نہ کرتی۔ لڑکیاں اکثر زنیرا کو چھیڑتی ''کہاں ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہارا بوائے فرینڈ'' تو زنیرا یوں شرما کے سرخ ہو جاتی کہ جیسے ارفع واقعی کوئی لڑکا ہو۔ رفتہ رفتہ ارفع کا نام کالج میں ''ماہی منڈا'' پڑ گیا۔

کالج فرینڈز ایک دوسرے کی دوستی میں شدت پسند ہوتی ہیں مگر ارفع اور زنیرا کی دوستی مجھے کہیں سے بھی نارمل نہیں لگتی تھی۔ ہر وقت دونوں کے درمیان روٹھنا، منانا، رونا دھونا دیتا رہتا۔ ان کی دوستی کو دیکھ کر مجھے شدید ذہنی کوفت ہونے لگتی۔ کافی دنوں سے ان کے درمیان عجیب سی ٹینشن تھی مگر وجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ صبح میں کالج پہنچی تو ارفع کی خودکشی کی کوشش کی خبر میرے کانوں میں پڑی سارے کالج

میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ارفع نے اپنی نبض کاٹ لی ہے'' چھٹی کے بعد سب لڑکیاں اسے دیکھنے ہاسپٹل گئیں۔ ارفع کی جان بچ گئی تھی مگر زنیرا کا رو رو کر برا حال تھا۔

میں نے اسے تسلی دی اور اس سارے معاملے کی وجہ پوچھی تو اس نے جو بات بتائی وہ سن کر میرے اوپر بم سا گر گیا۔

''حنا میری منگنی ہو رہی تھی۔ میں نے یہ خوش خبری ارفع کو بتائی تو اس نے مجھ سے بہت لڑائی کی کہ میں یہ منگنی نہ کروں۔ میرے انکار پر اس نے جان دینے کی دھمکی دی مگر جب میری منگنی ہو گئی تو اس نے اپنی نبض کاٹ لی۔'' یہ کہہ کر وہ شدت سے رونے لگی۔

''کیوں..... تمہاری منگنی پر اسے کیا اعتراض تھا؟'' میں حیرت سے بولی۔

''حنا وہ کہتی ہے کہ تم صرف میری ہو۔ تمہاری شادی کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔ ہم دونوں شادی کریں گے۔'' زنیرا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا انگریز معاشرہ اور..... یہ دوستی کے پردے میں کیا معاملہ چل پڑا تھا۔ ارفع کی شخصیت میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں اس کے پس پردہ یہ کہانی تھی۔ میں نے صدمے سے سر پکڑ لیا۔

☆.....☆

ارفع کے بارے میں جان کر میرا ذہن الجھ رہا تھا جس کو سلجھانے میں اس کے گھر جا پہنچی اس کے گھر کا ماحول خاصا مذہبی تھا۔ میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے ارفع کی امی سے اس موضوع پر بات کر ڈالی وہ اس سارے قصے سے واقف تھیں۔

''بیٹا میں جانتی ہوں سب۔ ارفع روز اپنے ابو اور بھائیوں سے مار کھاتی ہے مگر اپنی روش نہیں بدلتی وہ کہتی ہے کہ میں لڑکا ہوں اور زنیرا سے شادی کروں گا۔ زنیرا کی شادی کہیں نہیں ہونے دوں گا اور اگر ایسا ہوا تو اس کی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنی جان لے لوں گا۔'' ارفع کی امی روتے ہوئے مجھے یہ قصہ سنا رہی تھیں۔

''مگر آنٹی دو لڑکیوں کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تو کوئی نفسیاتی مسئلہ لگتا ہے۔ آپ لوگ ارفع کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔'' میں سٹپٹا کر بولی۔

''حنا بہت کوشش کی ہے علاج کروانے کی مگر یہ دوائیں نہیں کھاتی، پھینک دیتی ہے۔'' ارفع کی والدہ بے حد نڈھال ہو گئیں۔

''لیکن آنٹی اگر یہ مسئلہ بگڑ گیا تو بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔'' میں نے انہیں اس مسئلے کی سنگین نوعیت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی مگر وہ بے حد غم زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں کہ میری سمجھ سے تو یہ مسئلہ باہر ہے۔ اگر تم کچھ کر سکتی ہو تو کر لو۔''

خودکشی کی کوشش کے بعد کالج میں ارفع کا امیج اچھا خاصا خراب ہو گیا تھا۔ پرنسپل اسے کسی صورت کالج میں رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کے والدین کی منت سماجت کے بعد پرنسپل نے اسے کالج سے تو نہ نکالا مگر وارننگ دے دی کہ اگر سال ضائع ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں ایک دن بھی اس نفسیاتی کیس کو کالج میں نہ رکھتی۔ یہ تو کالج کی دوسری لڑکیوں کو بھی خراب کر رہی ہے مگر وہ کہتے ہیں نا کہ جس نے خود برباد ہونے کی قسم کھا رکھی ہو اسے کوئی دوسرا برباد ہونے سے نہیں بچا سکتا۔

کالج آنے کے بعد ارفع کے وہی رنگ ڈھنگ تھے۔ اس کے انداز میں کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ ڈھٹائی سے مسکراتی کہ میری جان جل جاتی۔ میں اسے سمجھاتی تو کان میں انگلی ڈال کر یوں کھجاتی کہ بند کرو اپنا لیکچر میں نے نا سدھرنے کی قسم کھالی ہے۔ میں خود بھی برباد ہوں گی اور زنیرا کو بھی برباد کر کے چھوڑوں گی۔ میں زنیرا اور ارفع کی دوستی کی نوعیت جان چکی تھی۔ اس لیے میں انہیں اکٹھا دیکھتی تو میرا دل سا خراب ہوتا۔ ارفع بھی اس کو چومتی کبھی اسے گلے لگاتی۔ اسے دیکھ کر انڈین بے ہودہ گانے گاتی اور زنیرا یوں شرما رہی ہوتی جیسے سچ مچ کوئی لڑکا اس سے دیوانا وار اظہارِ محبت کر رہا ہو۔

میں زنیرا اور ارفع کی دوستی کی نوعیت جاننے کے باوجود انہیں سمجھاتی رہتی مگر پانی شاید سر سے گزر چکا تھا۔ کبھی زنیرا سے کہتی کہ تم کالج چھوڑ دو۔ یا کراچی اپنے ماموں کے پاس چلی جاؤ مگر وہ میری بات نہ مانتی شاید وہ بھی ارفع کی دیوانگی کی اسیر ہو چکی تھی۔

ارفع کی دیوانگی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ کالج کی دیواروں پر جگہ جگہ دل کی شکلیں بناتی اور اس میں زنیرا کا نام لکھتی۔ اپنی کلائی پر سوئی سے زنیرا کا نام لکھتی۔ بازو خون خون ہو جاتا مگر وہ آگے سے یوں ہنس دیتی کہ ''مرد کو درد نہیں ہوتا''۔

کالج میں فن فیئر یا کوئی فنکشن ہوتا تو وہ یوں تیار ہو کر آتیں جیسے کپل ہو۔ ارفع وائٹ شرٹ اور جینز پہنتی اور زنیرا کبھی ساڑھی اور کبھی لہنگے میں آتی۔ ارفع اسے چومتی تو وہ شرما کر سرخ ہو جاتی۔ کالج میں لگے اسٹالز پر وہ دونوں یوں شاپنگ کر رہی ہوتیں جیسے نو بیاہتا جوڑا شادی کے بعد کہیں شاپنگ پر آیا ہو۔ زنیرا چہکتے ہوئے فرمائش کر رہی ہوتی اور ارفع پینٹ کی جیب سے پرس نکال کر پیمنٹ کر رہی ہوتی۔ زنیرا اگر کسی بات پر روٹھ جاتی تو ارفع خالصتاً فلمی اسٹائل میں کان پکڑ کر معافی مانگتی اور زنیرا شرما کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔

ان دونوں کی حرکات دن بدن تشویش ناک ہوتی جا رہی تھیں۔ میں ان کے لیے دعائیں مانگتی۔ کیونکہ سمجھانے پر وہ دونوں غصے میں آ جاتی تھیں۔ بی اے کے فائنل ایگزام سر پر تھے۔ لڑکیاں زیادہ وقت لائبریری میں گزارتی۔ جہاں باقی لڑکیوں پر انگلش کا پیپر کلیئر کرنے کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ وہاں ارفع اور زنیرا پر اس نفسیاتی محبت کا جنون سوار تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہوتیں۔ میں اکثر زنیرا کو زبردستی لائبریری لے جاتی مگر اس کا دھیان بھٹکا رہتا۔ اس کی نظریں اپنے ہیرو کو ہی تلاش کرتی رہتی۔ ہیرو صاحب بھی بڑے اسٹائل سے اپنی ہیروئن کو ڈھونڈتے پہنچ جاتے۔

''جناب آپ کا گرلز پورشن میں کیا کام ہے۔ آپ تو کالج والوں سے کہہ کر الگ مردانہ وارڈ بنوا لیں۔'' میں اس کی مردانہ حرکتیں دیکھ کر جل کر کہتی۔

ارفع بہت اسٹائل سے ہنس کر اپنے گال کو یوں رگڑتی جیسے مرد اپنی داڑھی کو کھجاتے ہیں۔ زنیرا کے سامنے بیٹھ کر بہت رومینٹک انداز میں کبھی شعر پڑھتی اور کبھی کوئی غزل

یہ جھکی جھکی نگاہیں انہیں میں سلام کر لوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یہیں اپنی صبح کرلوں یہیں اپنی شام کرلوں

بارش میں بھی ان دونوں کے عجیب وغریب فلمی سین دیکھنے کو ملتے کہ میں وقت زدہ ہو جاتی۔ ایگزام کی تیاری کی وجہ سے فورتھ ایئر کو فری کر دیا گیا۔ میں پڑھائی میں اتنی مگن ہوئی کہ زنیرا اور ارفع کی نفسیاتی محبت وقتی طور پر میرے ذہن سے محو ہوگئی۔ پیپر والے دن باقی کلاس فیلوز سے ملاقات ہوئی، تو پتا چلا کہ زنیرا اور ارفع پیپرز نہیں دے رہیں۔

میں نے ان دونوں کے نمبر پر کال کی مگر وہ بند تھے۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ میرا ان دونوں سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ ایک دن ایک انجان نمبر سے کال آئی۔ وہ زنیرا تھی۔

''تم دونوں کہاں غائب ہو؟ پیپرز کیوں نہیں دیے۔'' میں نے ایک ساتھ کئی سوال اکٹھے کر ڈالے۔

زنیرا نے مجھے اپنے گھر کا پتا بتایا۔ میں اگلے دن ہی اس سے ملنے پہنچ گئی۔ دروازہ زنیرا نے کھولا مگر وہ مجھے بہت بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ پہلے کی طرح خوب صورت بھی نہیں رہی تھی اس کا حسن گہنا سا گیا تھا۔

''زنیرا تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے۔'' گھر کے باہر ارفع ہاؤس لکھا دیکھ کر میں نے پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں وہ ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ اسی دوران اندر ایک نوجوان داخل ہوا۔ جسم فربہ تھا۔ اسٹائلش داڑھی، وہ کھانے پینے کی چیزیں ہاتھ میں لیے آیا تھا۔

''زنیرا یہ تمہارے شوہر ہیں؟'' میں نے اسے دیکھ کر زنیرا سے پوچھا۔

اسی دوران وہ نوجوان بہت بے تکلفی کے ساتھ زنیرا کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کیسی ہو ڈیئر حنا؟'' وہ نوجوان مجھ سے مخاطب تھا۔

میرے بتائے بغیر وہ میرا نام جانتا تھا۔ میری حیرت لازمی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی شکل جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

وہ نوجوان میرے سامنے ہی زنیرا کے ساتھ بے باکانہ حرکات کرنے لگا جو میرے خیال میں خاصی قابلِ اعتراض تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ میں بمشکل وہاں کچھ دیر بیٹھی اور وہاں سے چلی آئی۔ سارے راستے میں اس نوجوان کی شرمناک حرکات کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ میاں بیوی یوں مہمانوں کے سامنے ایسی حرکت کرنے لگے ہیں۔ اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔ شاید زنیرا نے بتایا ہو مگر پہلی ملاقات میں ہی یوں بے تکلفی سے پکارنا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔

اس کے بعد میری اکثر زنیرا کے ساتھ بات ہوتی وہ اپنے گھر اور شوہر کے بارے میں آدھا ادھورا جواب دیتی۔

ایک دن اس نے جو بات بتائی اسے سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

حنا تم نے اس دن جس نوجوان کو دیکھا تھا وہ ارفع تھی۔ میرے گھر والے میری شادی زبردستی کرنا چاہ رہے تھے۔ میں اور ارفع اپنے گھروں سے کافی بڑی رقم لے کر یہاں رہنے لگے۔ غیر ضروری ادویات کے استعمال سے ارفع کا جسم پھول گیا بظاہر وہ مرد ہی دکھائی دیتی ہے۔ دنیا والوں کے سامنے ہم میاں بیوی ہیں۔'' یہ سارا قصہ سن کر میرا تو دماغ ماؤف ہونے لگا۔

''لیکن زنیرا یہ تو گناہ کبیرہ ہے۔ تم دنیا والوں کو تو دھوکا دے سکتے ہو مگر اللہ کو کیا جواب دو گے۔'' میں نے اسے جھنجوڑنے کی ناکام کوشش کی۔

''حنا ہم دونوں بہت مجبور ہو گئے ہیں۔ اب کسی مرد سے شادی تو نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری برداشت سے باہر تھا۔ اسی لیے ہم دونوں ایک ہو گئے۔'' وہ قدرے نڈھال لہجے میں بولی۔

میں نے ان دونوں کو ہر طرح سے سمجھایا مگر وہ بدنصیب اللہ کی مقرر کردہ حدود پار کر چکی تھیں۔ ان کے دلوں پر کوئی نصیحت اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ خدا کے نہیں اب شیطان کے بندے بن چکے تھے۔

کافی دنوں بعد میری زنیرا سے بات ہوئی تو وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اس نے بتایا ارفع کے بھائی جو مذہبی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں ہیں۔ ان کے مطابق ہم دونوں ''واجب القتل'' ہیں۔ میں نے آخری بار اسے سمجھایا مگر انہوں نے توبہ کرنے کی بجائے خودکشی کر لی اور اپنا ٹھکانا جہنم بنالیا۔

نوجوان نسل کی اس بھیانک تباہی کا ذمہ دار کسے ٹھہراؤں، کسے الزام دوں۔ معاشرے کو یا پھر بے راہ روی کا شکار کرنے والے میڈیا کو یا پھر ان والدین کو جو تربیت احسن طریقے سے نہ کر سکے یا پھر خود نوجوان نسل کو.....!

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سخن پرور مصنفہ کی زنبیل کا دوسرا رتن

جادو ہے نشہ ہے

حنا بشریٰ

اک نو آموز لکھاری اور ایڈیٹر کی کیمسٹری سے جڑی کتھا

کلائی میں تکلیف تو بہت ہو رہی ہے مگر کیا کروں لکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ لکھوں گا نہیں تو آپ لوگوں تک یہ قصہ کیسے پہنچے گا۔ آپ لوگوں کا تعلق بھی لکھنے لکھانے والوں سے ہے۔ میری طرح آپ بھی کوئی تحریر لکھ کر اس چمن میں پہنچ گئے جہاں مدھر آواز والی کوئل کسی گھنے سرسبز درخت پر بیٹھی کوک رہی ہو اور اس کی آواز کے سحر نے آپ کے قدم روک لیے اور آپ اس کی دلنشین آواز سے لطف اندوز ہونے لگے تو پھر میرا کیا فائدہ ہوا جو رائٹرز برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ لوگوں کو ہوشیار نہ کر سکا اور آپ کا بھی وہی انجام ہوا جو میرا ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کرنے کے بعد میں نے گورنمنٹ کالج میں لیکچرار شپ کے لیے اپلائی کر دیا۔ نتیجہ آنے میں کچھ عرصہ لگ جاتا تھا۔ سوچا کچھ تخلیقی کام ہی کر لوں۔ میں نے بڑی محنت سے ایک افسانہ ''عشقِ نامراد'' لکھ ڈالا۔ اب اگلا مرحلہ تھا کہ بھیجنا کہاں ہے اور کس رسالے میں۔ کیونکہ زیادہ تر رسالوں پر خواتین کا ہی قبضہ ہوتا ہے۔ پھر بھی خواتین ناانصافیوں کا شور مچاتی ہیں۔ گھر میں بہن نے کافی رسالے لگوائے تو ہوئے تھے مگر فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں ''مظلوم و معصوم ابن آدم'' اپنی ایک اکلوتی تحریر کہاں بھیجوں۔ آخرکار بہن نے ہی مشورہ دیا کہ ایک رسالے میں خواتین و مرد دونوں لکھتے ہیں۔ یہ افسانہ وہیں بھیجنا مناسب ہو گا۔ افسانہ بھیج دینے کے بعد اس کے قابلِ اشاعت جاننے کے لیے فون کیا تو خاتونِ ایڈیٹر نے فون اٹھایا۔ میرے ذہن میں جو ایڈیٹر کا حلیہ تھا وہ کسی ریٹائر گورنمنٹ اسکول کی پرنسپل جیسا تھا۔ کرخت آواز ہو گی جس میں بڑھاپے کے آثار نمایاں ہوں گے۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ انتہائی مترنم آواز میری سماعت میں اس گھول گئی اس ساحرہ کی جادو بھری آواز میری دھڑکنوں کو بے ترتیب کر گئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں بھول گیا کہ میں نے اپنے افسانے کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کیا ہے۔

''جی کون صاحب بات کر رہے ہیں؟'' وہ پھر سے بولی۔ ''میں سیف خان ہوں...... ایڈیٹر صاحبہ سے بات کرنی ہے۔'' اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر بولا۔

''جناب آپ ایڈیٹر صاحبہ گل رعنا سے ہی مخاطب ہیں۔'' وہ مدھم سا ہنسی۔

''گل رعنا۔ دل کی سوئی اس ساحرہ کے نام پر اٹک گئی۔ ایک طرف دلکش آواز اور دوسری طرف نام جیسے کھلتا گلاب۔ خود کتنی خوب صورت ہو گی۔ تصور میں مجھے ہیما مالنی کا دلکش سراپا نظر آنے لگا تھا۔

''جی بولیے سیف صاحب کہاں کھو گئے؟'' وہ دوبارہ اسی گھائل کرنے والے انداز میں بولی۔

''جی وہ اصل میں...... میں نے ایک افسانہ ''عشقِ نامراد'' بھیجا تھا۔ اسی کے بارے میں پوچھنا تھا کہ وہ قابل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اشاعت ہے یا نہیں؟'' میں قدرے اعتماد سے بولا۔ ''خوش آمدید'' اوہ تو ہماری محفل میں ایک نئے رائٹر کا اضافہ ہونے والا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولی۔

اس کی بات پر مجھے ایک لمحے کے لیے پاکیزہ فلم کی ''مینا کماری'' کا خیال آیا جو کسی نواب کو اپنے غریب خانے پر خوش آمدید کہہ رہی ہو۔ ''اصل میں ہم آج کل پرچے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ان دنوں ہم تحریر نہیں پڑھتے آپ پندرہ دن کے بعد معلوم کریں کہ آپ کا افسانہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ یا آپ کو ابھی رہنمائی کی ضرورت ہے اور ہوسکتا ہے کہ آپ ابھی لکھنے کی بجائے صرف پڑھنے پر غور کریں۔'' اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے ڈیشین سا قہقہہ لگایا۔ یہی الفاظ اگر کوئی مرد ایڈیٹر کہتا تو دل چاہتا کہ اس کا خون پی جاؤں مگر..... مزید کیا کہوں آپ سمجھ گئے نا..... ٹھیک ہے میں پندرہ دن بعد فون کرلوں گا۔'' میں نے کہتے ہوئے فون بند کردیا مگر اس اجنبی ساحرہ کی آواز میری سماعت میں ابھی تک رس گھول رہی تھی۔ میں اس کی آواز کے سحر میں کھویا تھا۔ عمر بالکل زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔ 30 سے اوپر تو بالکل نہیں تھی۔ پہلی نظر کی محبت تو آپ جانتے ہیں مگر یہ تو آواز کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ چاند جیسی اجلی رنگت ہوگی۔ شانوں پر بکھری ریشمی زلفیں، گلاب کی پتیوں کی مانند نازک ہونٹ، جن پر دلفریب مسکراہٹ مزید حسن کو دوآتشہ کردیتی ہوگی اور آنکھیں تو بالکل نیلی کانچ جیسی بالکل نیلا ساگر..... جس میں کھو جانے کو دل کرے۔ بالکل میرے تصور جیسی ہوگی۔ اکثر لڑکیوں کے نام بچپن میں اسی لیے خوب صورت رکھے جاتے ہیں کہ وہ بالکل چاند کا ٹکڑا ہوتی ہیں۔ گل رعنا۔ میں زیرلب اس کا نام لیتے ہوئے مدھم سا مسکرایا کہ امی کی آواز سنائی دی۔

''سیف کب تک سوتے رہوگے۔ اب اٹھ جاؤ بازار سے کچھ سامان لادو۔'' امی کی بات سن کر میرا موڈ شدید آف ہو گیا نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھا مگر دھیان کے پردے پر اسی پری پیکر کی آواز اور دلکش سراپا لہرا تا رہا۔ دل بے خود ہوا جارہا تھا۔ اس ظالم حسینہ نے پندرہ دن بعد بات کرنے کی سزا سنادی تھی مگر میرا تو ایک دن گزارنا محال ہوگیا تھا۔ اگلے دن اس سے بات کرنے کا بہانہ سوچنے لگا۔ آخر ایک آئیڈیا ذہن میں آ ہی گیا۔ میں نے فوراً فون ملادیا۔ اس کی سحر انگیز آواز سنائی دی۔

''جی سیف صاحب کیسے یاد کیا؟'' وہ میٹھی آواز میں بولی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ صاف کہہ دوں آپ یاد کرنے کی بات کرتی ہیں۔ آپ کو کون کم بخت بھول سکتا ہے۔

''جی وہ..... میرا ایک دوست اپنی ایک تحریر بھیجنا چاہتا ہے اگر اجازت ہو تو بھیج دے۔'' میں بولا۔

''ارے جناب ہم نے کیا پابندی لگا رکھی ہے۔ ضرور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھیجے مگر ایک اعتراض ہے مجھے۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔ ''اعتراض کیا مطلب۔'' میں ناسمجھی سے بولا۔

''بھئی رائٹر بننا چاہتا ہے اور اتنا اعتماد بھی نہیں کہ ایڈیٹر سے خود بات کرے۔ آپ کو ''پیغام رساں کبوتر'' بنایا ہوا ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے قہقہہ لگایا اور فون بند کر دیا ہر اداہی قاتل تھی اس کی۔

☆.....☆

پندرہ دن گزارنا عذاب ہو رہا تھا۔ پندرہ ہزار بار کیلنڈر دیکھتا۔ دل اس کی آواز سننے کے لیے مچلنے لگتا تو فون ملاتا وہ ہیلو ہیلو کہتی مگر میں چپ رہتا۔ وہ فون بند کر دیتی۔ کئی دفعہ تو دن میں نہ جانے کتنے فون کرتا۔

''جناب آپ اگر فارغ ہیں تو ہمارا قیمتی وقت تو نہ ضائع کریں۔ جب بولنا نہیں تو کیوں کریڈٹ برباد کر رہے ہیں۔''

میری مکمل خاموشی پر وہ اکثر ایسے جملے کہہ کر فون بند کر دیتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر فون کرتا رہتا مگر ہر بار بیلنس چیک کرتا تو وہ خطرناک حد تک گر جاتا۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتا تاکہ دل بہلے گا تو بیلنس بھی بچے گا ورنہ..... اللہ اللہ کر کے جیسے تیسے پندرہ دن گزارے اور فوراً فون کر دیا۔

''سیفی صاحب! اتنی سی عمر میں کتنے عشق کر بیٹھے ہیں کہ ''عشقِ نامراد'' جیسا مایوس افسانہ لکھ ڈالا۔ اجی کچھ شوخ ہنستا مسکراتا افسانہ بھیجیے۔'' وہ دلنشین انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔ یقیناً وہ بھی میرے لیے کچھ خاص محسوس کر رہی تھی۔ تبھی مجھ سے یوں مخاطب تھی۔ دل خوش فہم ہوا اس کا بے تکلفی سے سیفی کہنا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ غش کھا کر گر جاؤں اس ادا پر کون نہ مر جائے۔

''تو اس کا مطلب میرا افسانہ ناقابلِ اشاعت ہے؟'' میں مایوسی سے بولا۔ ایک انجمی حسینہ پر رائٹر بننے کا رعب ڈالنے میں ناکام رہا تھا۔ آخر کار یہ حربہ تو ناکام رہا تھا۔ ''ارے سیفی صاحب! بہت بے صبرے ہیں آپ..... ایسا میں نے کب کہا؟'' وہ دلربا انداز میں بولی۔

''بے صبرا'' اس قاتل حسینہ نے اس انداز سے کہا کہ دل چاہ رہا تھا کہ اپنا نام بے صبرا رکھ لوں۔ کبھی بھوک کی شدت سے نڈھال ہو کر زیادہ شور شرابہ کرتا تو امی مجھے اکثر بے صبرا ہونے کا طعنہ دیتی۔ ایک تو بھوک اور دوسری امی کا طنزیہ انداز اور لعن طعن، دل چاہتا کہ مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا لوں اور بھوکا ہی جہانِ فانی سے کوچ کر جاؤں اور امی کو ساری زندگی کے لیے سزا دے جاؤں مگر گلِ رعنا نے اس انداز سے کہا تھا کہ ''میں تے تھاں ہی مر گیا سی''.....

''سیفی صاحب آپ کا افسانہ بہت اچھا ہے۔ آپ میں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے مگر جناب اپنی عمر کے مطابق کوئی شوخ و چنچل، ہنستا مسکراتا افسانہ لکھ کر بھیجیں آپ کا یہ والا افسانہ جلد لگا دیا جائے گا۔'' وہ انتہائی مدھر لہجے میں بولی۔

وقت گزرنے کے ساتھ گلِ رعنا کے ساتھ میری وابستگی بڑھنے لگی۔ بہت دفعہ سوچتا اظہرِ محبت کر دوں کہیں دیر نہ ہو جائے اور میرے مدِ مقابل کوئی اور امیدوار کھڑا نہ ہو جائے۔ بہن جو میری رازدار تھی اکثر مجھے کہتی ''بھائی گلِ رعنا سے کھل کر بات تو کرو۔ اس کے گھر بار کے بارے میں پوچھو اور یہ بھی معلوم کرو کہ وہ منگنی یا شادی شدہ تو نہیں۔ میں گلِ رعنا کے اکثر ذاتی نوعیت کے سوال کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ کبھی کھل کر بات نہ کرتی۔ اس کا زیادہ فوکس افسانے، ناول یا ناولٹ کی باریکیاں سمجھانے پر ہوتا۔ کبھی کبھار تو میں چڑ سا جاتا۔ مجھے لگتا کہ وہ میرے جذبات سمجھ چکی ہے مگر جان بوجھ کر ڈرامے بازیاں کر رہی ہے۔

''گلِ رعنا میں کچھ شاعری بھی بھیجنا چاہتا ہوں مگر پہلے آپ فون پر سن لیں۔'' میں نے ایک نیا بہانہ تراشا۔

میں پرانے رسالوں سے ایسی غزلیں اور نظمیں چراتا جس میں محبوب کے حسن کے قصیدے بہت خوب صورتی سے بیان کیے گئے ہوں۔ عشق و محبت کا بے پناہ اظہار ہوتا اور ساتھ ہی ساتھ کان بھی کھڑے رکھتا کہ اسے پتا تو نہیں چل گیا کہ شاعری میری نہیں ہے مگر وہ شاعری سننے میں اتنی کھو جاتی کہ کسی قسم کی انکوائری نہ کرتی۔ ''جی جناب ضرور بھیجیے شاعری مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آپ رائٹر ہی نہیں شاعر بھی ہیں۔'' وہ دل و جان سے حوصلہ بڑھاتی مگر شاعری سنانے کا مقصد پھر بھی پورا نہ ہوتا۔

میں دن رات محبت کی آگ میں جل رہا تھا وہ ابھی تک بے خبر تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ ''اے کاش بے خبر ہی رہتا میں'' میں نے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور چند قیمتی تحائف لے کر بنا بتائے اس کے آفس میں پہنچ گیا۔ کافی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر ایک ہی جواب ملتا رہا۔ میڈم میٹنگ میں مصروف ہیں اور کسی سے ملاقات نہیں کر سکیں گی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آ گیا محبوب کا دیدار نہ کرنے کا بے حد دکھ تھا۔ یہ فراق میری جان جلا رہا تھا۔ دیوانگی سوا نیزے پر پہنچ چکی تھی۔ کبھی بے چینی سے اپنے ناخن کترنے لگتا کبھی ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل کر لیتا۔ سگریٹ کی نہ جانے کتنی ڈبیاں پھونک ڈالیں مگر دل بے قرار کو قرار کہاں تھا۔ گلِ رعنا کا فون آیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ میرے تحائف کا بے حد شکریہ کر رہی تھی اور افسوس بھی کر رہی تھی کہ ''میں بہت مصروف تھی اسی لیے اپنے عزیز دوست سے ملاقات نہ کر سکی۔ آتشِ محبت مجھے جلا کر بھسم کر رہی تھی اور وہ مجھے صرف دوست مان رہی تھی۔

''میں صرف دوست ہوں آپ کے لیے؟'' میں شکوہ بھرے انداز میں بولا۔ ''تو کیا بننے کی خواہش ہے آپ کی؟'' اس نے شرارت بھرے انداز میں قہقہہ لگایا۔

اس نے اس قدر مدھر انداز میں کہا ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ میں مغلِ اعظم'' کا دلیپ کمار ہوں اور مدھو بالا مجھے قاتل بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ انگور کا ایک ایک دانہ میرے منہ میں ڈال رہی ہے۔ چہرے پر دلربا مسکراہٹ سجی ہے۔

میں جب بھی اظہارِ محبت کرنا چاہتا تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ آجاتی۔ کبھی فون خراب ہو جاتا، کبھی گل رعنا کی طبیعت ناساز ہو جاتی۔ کبھی بے پناہ مصروفیت آڑے آجاتی بس یوں کہہ لیں کہ ظالم سماج درمیان میں حائل رہتا۔ اب سوچتا ہوں کہ قدرت مختلف طریقوں سے مجھے اس بے وقوفی سے روک رہی تھی مگر میں عقل کا اندھا کبھی کبھار بہت غصہ آتا کہ عورتیں تو مردوں کی نگاہوں کو سمجھ جاتی ہیں۔ گل رعنا کیوں میرے جذبات سے لاعلم تھی۔ وہ ابھی تک مجھے صرف رائٹر ہی سمجھ رہی تھی۔ ساری ساری رات پریشان جاگتا رہتا۔ بڑھی شیو، بکھرے بال، پریشان چہرہ دیکھ کر امی فکرمند ہوئیں۔ گل رعنا کا فون بھی خراب تھا۔ میری حالت ابتر تھی۔ میری تباہ حالی کا ذکر بہن نے ابو اور امی سے کر دیا۔ ابو تو سن کر آپے سے باہر ہو گئے۔ ''کیوں میاں صاحبزادے روٹی کمانے کے قابل ہوئے نہیں اور عشق و عاشقی کے چکر میں پڑ گئے اور تو اور لڑکی بھی ایسی ڈھونڈی جو اس ہڈحرام کو پالے گی۔ پہلے میری بوٹیاں توڑتا رہا ہے اب اس کی توڑے گا۔'' ابو میرے عشق کو روزی کے ترازو میں تول رہے تھے میں اس ظلم پر بلبلا اٹھا۔

''میں گل رعنا سے محبت کرتا ہوں اور اسی سے شادی کروں گا۔ ورنہ اپنی جان دے دوں گا۔'' میں نے آخری فیصلہ سنا۔

''جاؤ کر لو ختم خود کو۔ مجھے بھی ایسی ناکارہ اور گندی اولاد نہیں چاہیے۔'' عشق امتحان مانگ رہا تھا۔ سو دے دیا گل رعنا کی خاطر اپنی نبض کاٹ ڈالی۔ جب آنکھ کھلی تو سب میرے لیے رو رو کر بے حال ہو چکے تھے مگر میری بہن نے بتایا۔ ''امی ابو مان گئے ہیں۔ میں نے گل رعنا کو فون کر دیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئی ہے اور کچھ دیر تک اسپتال پہنچ رہی ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ چشمِ تصور میں کبھی انارکلی تو کبھی مینا کماری سوچتا۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا، گل رعنا میری نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ میری آنکھیں اسے دیکھ کر حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ ایسا گل تھا جو 50 سال سے پہلے اپنی تمام تر رعنائیاں کھو چکا تھا۔ سانولی رنگت، موٹی ناک پر موٹے عدسوں کا چشمہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ہرگز جھیل جیسی نہیں تھیں جس میں میرا ڈوب کر مرنے کا ارادہ ختم ہو چکا تھا۔ پستہ قد اور فربہی مائل جسم جو کم از کم مینا کماری جیسا تو بالکل نہیں تھا۔ بال ریشمی زلفیں کہاں تھیں بس چڑیا کا گھونسلہ معلوم ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اب کی بار اس طرح اپنی نبض کاٹوں کہ بالکل نہ بچوں۔ دلیپ کمار کا گانا ''اے میرے دل کہیں اور چل'' والا معاملہ ہو گیا تھا۔

''ارے چندا یہ کیا کر ڈالا؟'' گل رعنا اپنی اسی مدھر آواز میں بولی۔

میں اسے ابھی تک گم صم دیکھے جا رہا تھا کہ اس نے گال پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں میرے لیے بچوں والی شفقت تھی۔ اس کا کھردرا ہاتھ محسوس کر کے میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخ ماروں اور گہری بے ہوشی میں چلا جاؤں۔ اس کا سخت ہاتھ ایسا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے کو جھانویں سے رگڑ دیا ہو۔ امی ابو حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی گل رعنا کو دیکھ رہے تھے۔ بہن کونے میں کھڑی بری طرح سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ ہنس ہنس کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ''ارے مجھے کوئی تو بتائے کہ آخر سیفی نے یہ حرکت کیوں کی؟'' وہ اسی میٹھے سحر کن لہجے میں بولی۔

جس کا میں دیوانہ تھا مگر اب اس آواز کا جادو ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ مجھے ہوش آگیا تھا۔ مجھے شدید کراہیت ہو رہی تھی۔ آوازیں اتنا دھوکہ دے سکتی ہیں اور میں جان لٹانے کو تیار تھا۔ میں نے نفرت سے آنکھیں بند کر لیں۔

''وہ گل رعنا صاحبہ، اصل میں سیفی بھائی نے بہت محنت کر کے ایک ناول لکھا مگر وہ ریجیکٹ ہو گیا میں اسی بات پر دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کی کوشش کر ڈالی۔'' اس نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''لو بھلا اتنی سی بات پر بھی کوئی اتنی سنگین حرکت کرتا ہے مجھے دو اپنا ناول..... تھوڑی کمی بیشی میں خود دور کر کے اسے اپنے رسالے میں لگا دوں گی کیوں جانو اب تو خوش ہو۔'' اس نے پھر اپنا کھردرا ہاتھ میرے چہرے پر پھیرا اور جانو کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سخن پرور مصنفہ کی زنبیل کا تیسرا رتن

اتھری گھوڑی

حنا بشریٰ

مرد اور عورت کے بیچ انا اور ضد آ جائے تو پھر سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے

پنجاب یونیورسٹی (IER) ڈیپارٹمنٹ کا آڈیٹوریم اسٹوڈنٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میری حریف حمائل علی خان "حقوقِ نسواں" کے موضوع پر خوب گرج برس رہی تھی۔ عورتوں کی حمایت میں تو وہ بلا تکان بولتی تھی۔ وہ جی بھر کر مردوں کے خلاف زہر نکال رہی تھی اور مہمانِ خصوصی بھی ایک نمبر کا بے وقوف لگ رہا تھا کہ وہ مردوں کے خلاف بول رہی تھی اور وہ درد بھری نظروں سے حمائل علی خان کو دیکھ رہا تھا۔ "مرد بے حس اور خود غرض ہوتے ہیں۔ عورتوں کو پیر کی جوتی سمجھنے والے مرد تو جانوروں سے بھی بدتر ہیں ان کی تذلیل کر کے اپنی مردانگی پر اتراتے ہیں" اس کے ہر جملے پر ہال میں تالیاں گونج اٹھتیں۔ اس کی تقریر میرے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی۔ میں بے نیازی سے چیونگم چبا رہا تھا۔ کیوں کہ مجھے اس کی تقریر سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

بیٹی کو شر جاننے والو رب سے بیٹا مانگنے والو
اس کا رب رحمٰن نہیں ہے کیا عورت انسان نہیں ہے

اس نے ان الفاظ پر اپنی تقریر کا اختتام کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کامیابی کی خوشی سے اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ ہر رنگ جیسے اسی کے لیے بنا تھا۔ سیاہ چمکدار آنکھیں جن میں کچھ کرنے کا عزم واضح دکھائی دیتا تھا۔ بائیں گال پر تل جو نظرِ بد سے حفاظت کا قدرتی انتظام تھا۔ سر پر ہمہ وقت اسکارف رہتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ ہر لباس کے ساتھ اسکارف شاید اس کا قومی لباس تھا۔ میں کبھی بھی اس کی حسین ریشمی زلفیں نہیں دیکھ سکا۔

اس کی قابلیت اور صلاحیتوں کی وجہ سے میں نے دل ہی دل میں اسے اپنا حریف بنا لیا تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ بے حد ریزرو رہتی۔ اس کی یہ بے نیازی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ مجھے یعنی رمیل احمد کو نظر انداز کر رہی تھی جو یونیورسٹی کا چاکلیٹی ہیرو تھا۔ لڑکیاں جس کی دیوانی تھیں۔ کوئی میرے لیے آنسو بہاتا اور کوئی آہیں بھرتا۔ عورت کا اصل مقام تو صرف داسی بن کر مرد کے قدموں میں بیٹھنا، رونا، تڑپنا، مچلنا یہ ہے عورت کی اوقات......

بے نیازی میں اسے سوا سیر پایا تو "اتھری گھوڑی" کو قابو کرنا میں نے اپنے اوپر فرض کر لیا۔ ویسے بھی وہ مرد ہی کیا جو چیلنج میں نہ آنے۔ مختلف حیلے بہانوں سے اسے مخاطب کرتا مگر وہ بالکل متاثر نہ ہوتی۔ میری برتھ ڈے تھی۔ یونیورسٹی فرینڈز خوب ہلا گلا کر رہے تھے۔ میری نظر حمائل پر پڑی وہ پوری محویت کے ساتھ اپنے نوٹس بنا رہی تھی۔ میرے اندر کا خرانٹ مرد جاگ اٹھا۔ جو عورت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کو تسخیر کرنے کے جذبے سے مجبور ہوتا ہے۔ اسے ساری زندگی اپنے قدموں میں بٹھانے کے لیے مرد کو چند لمحوں کے لیے عورت کے قدموں میں بیٹھنا پڑے تو وہ بیٹھتا ہے۔ میں جو گھر میں پانی کا گلاس پکڑ کر خود سے پینا حرام سمجھتا تھا کیونکہ نوکروں کی فوج جو تھی گھر میں میرے عیش ہی عیش تھے۔ میں نے پلیٹ میں ایک پیس اپنے لیے اور دوسری میں حمائل کے لیے کیک ڈالا۔ حمائل یہ آپ کے لیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے قدرے غصیلی نظر سے میری بے تکلفی دیکھی اور تھوڑی سا دور سرک گئی۔

''نہیں شکریہ!'' وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے دوبارہ نوٹس بنانے لگی۔

''ارے جناب! آج میری برتھ ڈے ہے اور دوستوں کو ایک دوسرے کی خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔'' بظاہر میں نے مسکراتے ہوئے کہا مگر اندر ہی اندر کوئلے کی طرح سلگ اٹھا تھا۔

''دوست۔ آپ اور میں دوست کب سے بن گئے؟'' حمائل کا لہجہ اور مسکراہٹ دونوں طنزیہ تھے۔

''تو جناب پہلے دوست نہیں تھے تو آج بن جاتے ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے دوستانہ انداز میں ہاتھ آگے بڑھایا۔

''مسٹر میل پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا مذہب مرد و عورت کی یوں آزادانہ دوستی کی اجازت نہیں دیتا اور دوسری بات کہ آپ کے پاس تو آگے ہی دوستوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔ میرے خیال میں مجھ سے دوستی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور چل گئی۔

غصے کے مارے میرا دماغ بھٹی کی طرح گرم ہونے لگا۔ میرے دوست دور کھڑے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ سیٹیاں بجا کر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ کیک حمائل کے منہ پر مل دوں۔ میں شکست ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے ہر صورت اسے اپنے قدموں میں بٹھانا تھا۔ کئی دفعہ تو مجھے خود پر غصہ آتا کہ ساری

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یونیورسٹی کی لڑکیاں چھوڑ کر میں کس پتھر سے ٹکرا رہا ہوں مگر انا بھی تو کوئی چیز ہے وہ بھی مرد کی انا اور مرد کو تو مخالف چلنے میں ہی مزہ آتا ہے۔ لائبریری، کینٹین، لان ہر جگہ اس کے تعاقب میں رہتا۔ وہ لائبریری میں بیٹھی تھی میں بھی پہنچ گیا۔

''حمائل آپ مردوں کے بارے میں اس قدر سخت رائے کیوں رکھتی ہیں۔ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔'' میں نے چہرے پر انتہائی متانت طاری کرتے ہوئے سوال کیا جب کہ دل میرا خباثت سے بھرا ہوا تھا۔

''بالکل صحیح کہا آپ نے سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے صرف 19,20 کا فرق ہوتا ہے۔ کچھ مرد اپنے اندر کی خباثت چھپا لینے کے ماہر ہوتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ باقی مردوں سے بہتر ہے مگر جو عورت یہ سوچ کر کسی مرد پر بھروسہ کرتی ہے ہمیشہ نقصان اٹھاتی ہے۔'' وہ اپنے ازلی تلخ مزاج سے بولی۔

''لیکن معاشرے میں ایک اکیلی عورت کا تنہا رہنا بھی تو خطرناک ہے۔ آخر اسے مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مرد عام سا ہو کوئی بھی خامی ہو۔ مرد تو مرد ہی ہوتا ہے۔'' میں قدرے غرور بھرے لہجے میں بولا۔ آنکھوں میں تفاخر نمایاں تھا۔ دل ہی دل میں پورا یقین ہو گیا کہ ''ہن تے پھنسی اے مچھی''۔

''مسٹر رمیل اللہ کا سہارا ہی سب سے مضبوط سہارا ہوتا ہے۔ جن گھروں میں بیٹا، شوہر اور بھائی ہوں وہاں بھی بعض اوقات عورت کو ہی کمانا پڑتا ہے آخر ان ہڈ حراموں کا پیٹ بھی تو پالنا ہوتا ہے۔ جو مرد ہو کر عورت کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ پھر کیا فائدہ ایسے کھوکھلے سہاروں کا۔'' حمائل کا لہجہ تلخ مگر آنکھیں نم تھیں ہڈ حرام کا لفظ ادا کرتو میں تلملا کر رہ گیا۔

رمیل احمد آج تک کبھی نہیں ہارا تھا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ زیر نہیں ہو گی اور میں نے اسے زیر کرنے کی..... جب باتوں، لفظوں سے اسے قائل نہ کر سکا تو ایک نئی چال چلی میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا۔ پینٹ شرٹ چھوڑ کر شلوار قمیض پہننے لگا۔ جب کہ عام حالت میں مجھے اس مولوی ٹائپ حلیے سے نفرت تھی، ہلکی سی داڑھی رکھ لی۔ یونیورسٹی کے لان میں نماز ادا کرتا حالانکہ نماز سے میرا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کوشش کرتا کہ حمائل کے آس پاس ہی نماز ادا کروں۔ حمائل کی طنزیہ نگاہوں سے صاف ظاہر ہوتا کہ ''رمیل احمد مرد اس قدر خبیث ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔'' اس کے چہرے کے تاثرات مجھے بل کھانے پر مجبور کر دیتے۔

ایک گرل فرینڈ کی زبانی سن رکھا تھا کہ حمائل کا تعلق پٹھان فیملی سے ہے۔ اس کے باپ نے 4 شادیاں کی تھیں۔ حمائل کی چار بہنیں تھیں۔ باپ نے بیٹے کی وجہ سے حمائل کی ماں کو طلاق دی تھی کیونکہ اس کا قصور تھا کہ وہ بیٹا پیدا نہ کر سکی تھی۔ اب حمائل ہی اپنے گھر کا سہارا تھی۔ جو پڑھنے کے ساتھ جاب بھی کر رہی تھی۔ اونہہ وہی گھسی پٹی اسٹوری۔ میں اکثر بے رحمی سے سوچتا۔ ایک دن یونیورسٹی پہنچا تو خبر ملی کہ ایک امیر زادے نے حمائل کو پرپوز کیا ہے اور منگنی کی انگوٹھی بھی لے آیا تھا۔ حمائل نے اس کی وہ درگت بنائی کہ وہ دوبارہ بات کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

''بالکل ٹھیک کیا آپ نے حمائل۔ ایسے سر پھرے امیر زادے اسی سلوک کے قابل ہیں۔'' میں نے کہتے ہوئے چپس کا پیکٹ اسی کی جانب بڑھا دیا۔

''جی نہیں شکریہ۔ میں یہ چیزیں نہیں کھاتی۔'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

''کیک آپ نہیں کھاتی..... چپس آپ نہیں کھاتیں..... پھر کیا کھاتی ہیں جو اس قدر حسین ہیں۔'' میں مسکرایا۔

ایک تو وہ پہلے ہی تپی پڑی تھی۔ میری بات پر تو زخمی ناگن بن گئی۔

''تم سب مرد ایک جیسے ہی خبیث ہوتے ہو۔ عورت کو مفت کا مال سمجھ کر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش میں رہتے ہو۔ تم اپنی حد میں رہو۔ ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گی جو اس امیر زادے کا نہیں کر سکی۔'' وہ پھنکاری۔

اس کے یہ الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے چپس کا پیکٹ زمین پر مارا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اور تم اپنے آپ کو آخر سمجھتی کیا ہو۔ پڑھ لکھ کر کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مردوں کی برابری کرلوگی۔ جو مرضی کرلو عورت کی حیثیت جوتی سے زیادہ نہیں ہے۔'' میں آپے سے باہر ہوگیا۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کررہی تھی مگر میں چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کی بے بسی مجھے مزہ دینے لگی تھی۔ س نے ایک پل کے لیے نفرت سے میری آنکھوں میں جھانکا اور ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر نشان چھوڑ گیا۔ میری حالت زخمی ناگ جیسی ہوچکی تھی۔ جو ہر وقت تلاش کرتا کہ حمائل سے تھپڑ کا بدلہ کیسے لینا ہے اور پھر مجھے موقع مل ہی گیا۔ حمائل کی اپنی ایک دوست سے لڑائی ہوگئی وہ لڑکی اپنے گروپ میں آکر حمائل کے خلاف خوب زہر نکال رہی تھی۔

''پتا نہیں کیا خود کو سمجھتی ہے۔ خوب صورت چہرے پر اتراتی پھرتی ہے مگر سر پر ایک بال نہیں ہے۔ پیدائشی گنجی ہے۔'' وہ بھڑاس نکال رہی تھی اور میرا کام بن گیا تھا۔ ہر وقت اسکارف لپیٹے رکھنے کا راز میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ تھپڑ کا بدلہ لے کر حساب برابر کردوں۔

حمائل اپنی فرینڈز میں گھری خوش گپیوں میں مصروف تھی کہ میں اس کے قریب پہنچ گیا اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو نفرت سے منہ پھیر لیا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''حمائل آپ خود تو اتنی حسین ہیں۔ تو یقیناً آپ کے بال بھی بے حد خوب صورت ہوں گے کبھی آپ نے دکھائے نہیں آج دیدار ہی کرادیں۔'' وہ جو ابھی میری بات پر غور ہی کررہی تھی میں نے کہتے ہی تیزی سے اس کا اسکارف کھینچ ڈالا۔

واقعی وہ بالکل گنجی تھی۔ اس کے سر پر بال نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔ ہر طرف سے قہقہے بلند ہورہے تھے۔ لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں اور لڑکے اس مغرور حسینہ کی حالت پر مزہ لے رہے تھے۔ باقاعدہ تالیاں اور سیٹیاں بجائی جارہی تھیں۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ بے عزتی کے احساس نے اسے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

☆.....☆

دن، ہفتے، مہینے گزر گئے۔ حمائل اس دن کے بعد یونیورسٹی نہ آئی، کہاں گئی کچھ خبر نہ تھی۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ میرے دل کو قرار آگیا تھا۔ یونیورسٹی کے دو سال مکمل ہوئے اور اریبہ میری زندگی میں بہار بن کر آگئی تھی۔ میں اپنی شادی شدہ زندگی میں اتنی بری طرح سے مگن ہوا کہ حمائل علی خان میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ میں بھول گیا تھا کہ ایک عورت کو سر عام یوں ذلیل وخوار کرکے میں خوش رہوں گا وہ قادرِ مطلق میرا وہ گھناؤنا عمل ہرگز نہیں بھولا تھا۔ اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا میں خوشی سے دیوانا ہوگیا مگر وہ پیدائشی گنجی تھی۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری بیٹی ہوگئی مگر ان تینوں کے سر پر بال نہ تھے۔ میں ان کی حالت دیکھ کر دن رات جلتا کڑھتا رہتا۔ مہنگی مہنگی ادویات استعمال کراتا جو ہوسکا میں نے کیا مگر نتیجہ صفر ہی رہتا۔ میں حمائل کی بددعاؤں کا شکار ہوگیا ہوں۔ ہر نعمت کے ہوتے ہوئے بھی میں خوش نہیں ہوں۔ میں دن رات اللہ سے معافیاں مانگتا ہوں مگر مجھے چین نہیں ملتا نہ ہی بیٹیوں کی حالت بدلتی ہے۔ میں ہر جمعرات کو داتا دربار پر حاضری دے کر دعائیں مانگتا ہوں کوئی پیر فقیر نظر آئے اس کو دعا کے لیے کہتا ہوں مگر کہتے ہیں کہ جب تک اللہ کی مخلوق نہ معاف کرے وہ خالق معاف نہیں کرتا۔

حمائل کو ڈھونڈ کر اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں مگر وہ تو ایسے غائب ہوگئی ہے جیسے کبھی دنیا میں تھی ہی نہیں۔

آج میری بیٹیاں جوان ہوگئی ہیں کالج یونیورسٹی جانے لگی ہیں مگر مجھے ایک پل بھی قرار نہیں ہے۔ حمائل کے الفاظ آج میرا سکون چھین لیتے ہیں۔

اس کا رب رحمٰن نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے

اس رحمٰن نے مجھ فرعون سے اپنی کمزوری اور مظلوم بندی کا بدلہ لے کر مجھے دنیا کے لیے عبرت بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کوئی ابنِ آدم اپنی مردانگی کے نشے میں میری بیٹیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک نہ کرے جو میں نے حمائل کے ساتھ کیا تھا۔ دل بار بار کہتا ہے رمیل احمد تم حمائل علی خان کی بددعا میں ہو۔ تم کیسے خوش رہ سکتے ہو۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مستقبل بین داستان گو مصنفہ کا پہلا نشتر

دیوانی

ثمینہ طاہر بٹ

اُس دوشیزہ کی کتھا جو اپنے شوہر کی دیوانی تھی مگر......

”انزلہ! پھر کیا سوچا تم نے؟ ابھی بھی تمہارے دل میں اس کی کوئی جگہ ہے، یا پھر اس کی اس ”مہربانی“ کے بعد تمہاری عقل کچھ ٹھکانے آئی؟“ وہ اپنے خیالوں میں گم نڈھال سی لیٹی تھی کہ اس کی پھوپو نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے اسے خیالی دنیا سے باہر نکالا۔

”پتا نہیں پھوپو! میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا۔ میں نے اپنی ساری زندگی زعیم کے نام کر دی تھی۔ اپنی ساری محبتوں کا مرکز صرف اسے ہی بنایا تھا مگر شاید میرے جذبے ہی خالص نہ تھے کہ اس ستمگر پر کوئی اثر ہی نہ ہوا۔“ اس کے دل کا درد آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تو پھوپو کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ سخت غصے میں جو زعیم اور اس کے گھر والوں کو بولنا شروع ہوئیں، تو پھر رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔ انزلہ آنکھیں موندھے، آنسو بہاتی ان کی بڑبڑاہٹیں سنے جارہی تھی کہ شاید اب یہی اس کی قسمت تھی۔

☆......☆

انزلہ نے ابھی سولہویں سن میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسے خاندانی رسم ورواج پر قربان کر دیا گیا۔ اس کے بڑے بھائی حسام کی شادی ان کی پھوپو زاد حمرہ سے ہو چکی تھی۔ حسام اور حمرہ کے دو بچے تھے۔ دادی کی ان بچوں میں جان تھی اور یہ بات حمرہ بھی اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے گھر والے بھی۔

انزلہ کی پھوپو ایک شاطر اور لالچی قسم کی عورت تھیں۔ انہوں نے بہت ہوشیاری سے حسام کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ ویسے بھی سادہ مزاج اور بے ضرر قسم کا انسان تھا اس لیے اسے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ پھوپو اور حمرہ نے اس کے اردگرد کیسا جال بن رکھا ہے۔ حمرہ کا بڑا بھائی زعیم انتہائی لاپرواہ اور نکما انسان تھا۔ باپ دادا کی چھوڑی بے شمار جائیداد تھی جس کے لاکھوں کی صورت میں آنے والے کرائے اس کے اخلاقی بگاڑ کا اور زیادہ سبب بنے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شرعی عیب بھی پیدا ہوتے چلے گئے اور اس پر اس کا مزاج جو ہمیشہ سوا نیزے پر سوار رہتا۔ ان سب عوامل نے مل کر اس کی ماں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں ان کے بیٹے کی یہ خراب شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے اور ایسے میں اسے خاندان میں تو کوئی رشتہ ملنے سے رہا اور اگر وہ یعنی کہ زعیم خود کسی راہ چلتی کو لا کر ان کے سر پر بٹھا دے تو ان کا کیا بنے گا؟ اسی سوچ نے ان کی راتوں کی نیندیں اڑا دیں تھیں۔

☆......☆

”باقر! انزلہ کو چپ چاپ میری بیٹی بنا دو۔ میں اپنی جھولی پھیلا رہی ہوں۔ میری خالی جھولی میں انزلہ کی بھیک ڈال دو بھائی۔ تمہیں خدا کا واسطہ، مجھے خالی ہاتھ مت لوٹانا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پھوپو نے بہت سوچ بچار کے بھائی، بھائی کے سامنے جھولی پھیلا دی۔ بھائی تو جانے کیوں بے حد خوش ہوگئیں مگر بھائی کے تو جیسے پیروں سے لگی اور سر پر جا بجھی۔

''آپا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری انزلہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ صرف سولہ سال کی اور تمہارا بیٹا اس سے دوگنی عمر کا۔ تم خود سوچو آپا انزلہ اور زعیم کا کیا جوڑ بنتا ہے بھلا؟ کہاں میری حافظ قرآن، صوم وصلوٰۃ کی پابند معصوم بیٹی اور کہاں تمہارا نکما اور آوارہ مزاج بیٹا۔ نہیں آپا نہیں۔ مجھے یہ رشتہ بالکل بھی منظور نہیں۔'' باقر صاحب نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بہن کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ مگر یہ جواب ان کے ساتھ ساتھ ان کی پوری فیملی کو بہت مہنگا پڑا۔ حمرہ نے جو ماں اور بھائی کی یہ انسلٹ دیکھی تو ان کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ حسام تو ویسے ہی نوکری کے سلسلے میں بیرون ملک جا چکا تھا، سو اسے خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا اور وہ ساس سسر سے لڑ جھگڑ کر اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔

''دیکھو باقر! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیوں بیٹی کی خاطر بیٹے کا گھر برباد کرنے پر تلے ہو اور پھر ہمارے خاندان میں یہ کون سا پہلی بار ہونے جا رہا ہے۔ یہ وٹہ سٹہ تو ہماری خاندانی ریت ہے۔ تم اس کے خلاف جانے کی ضد کیوں کر رہے ہو باقر؟ مان جاؤ اور خوشی خوشی انزلہ اور زعیم کی بات پکی کر دو۔''

باقر صاحب نے تو اپنی طرف سے بات سنبھال لی تھی مگر یہ بات اب اتنی جلدی سنبھلنے والی نہ تھی۔ سو بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھی کہ خاندانی پنچایت بٹھانی پڑی اور پھر ہمیشہ کی طرح خاندانی روایات جیت گئیں اور بیٹی کا نصیب ہار گیا۔

☆.....☆

انزلہ نے اپنی پوری زندگی بہت سادگی اور پاکیزگی سے گزاری تھی۔ سوائے باپ اور بھائی کے اس نے کبھی کسی تیسرے مرد کو قریب سے دیکھا ہی نہ تھا۔ اب جو اس کی زندگی میں زعیم آیا اور وہ بھی شوہر کی صورت تو وہ، اس کی دیوانی ہی ہو گئی۔ زعیم نے بہت جلد اسے قابو کر لیا۔ اب انزلہ اس کی نگاہوں سے دیکھتی اور اس کی ہی زبان بولتی تھی۔ وہ زعیم کے عشق میں اتنی اندھی ہوتی چلی گئی کہ اس نے اپنے سارے حقوق بھی فراموش کر دیے جو اسے اسلام نے عطا کیے تھے۔

ان کی شادی کو دس سال بیت چکے تھے اور ان گزرے دس سالوں میں تقدیر نے ان کی جھولی میں پانچ پھول جیسے بچے ڈال دیے تھے۔ چار بیٹیاں اور ایک بیٹا۔

کہتے ہیں کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی بڑے سے بڑے طرم خان کے بھی شانے جھک جاتے ہیں مگر زعیم شاید سب سے ہی نرالا باپ تھا کہ بیٹیوں کی کھیپ ہونے کے باوجود بھی خود کو ذرا برابر بھی تبدیل نہ کر پایا تھا اور اس کی یہی حرکتیں باقر صاحب کو ہولائی رہتی تھیں۔ ایک باپ ہونے کے ناطے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انہوں نے جب بھی اپنی بیٹی کے حق میں آواز اٹھانی چاہی، انہیں ہر طرف سے شدید مخالفت اٹھانی پڑی اور اس میں نا صرف ان کی بہن اور بھانجا بھانجی شامل ہوتے، خود ان کی بیگم بھی پیش پیش ہوتی تھی۔ باقر صاحب ان مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے بھی شاید حوصلہ نہ ہارتے اگر انزلہ ایک فیصد بھی ان کا ساتھ دے پاتی تو۔ ان کی ہزار کوششوں کے باوجود بھی زعیم کا ساتھ چھوڑنا تو دور کی بات، اس کے خلاف کچھ سننے کو بھی تیار نہ ہوتی تھی اور یہی بات باقر صاحب کو سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی۔

حسینہ ان کی چھوٹی بہن تھی اور وہ شروع دن سے ہی ان کی ہمنوا تھی مگر جہاں باقر صاحب کی ایک نہ چل سکی تو حسینہ بے چاری کو کوئی کیا سنتا۔

''انزلہ بیٹی کیوں اپنی زندگی برباد کررہی ہو؟ کیا تم جانتی نہیں کہ وہ زعیم کا بچہ کیا کیا کرتا پھر رہا ہے اور تم ہو کہ.....''

''بس پھوپو! میں نے کہہ دیا ناں۔ میں ان کے خلاف کوئی بات نہیں سنوں گی۔ مجھے اپنے رب پر اور اپنی محبت پر پورا پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زعیم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میری طرف واپس آجائیں گے اور پھر کبھی نہیں جائیں گے۔ دیکھ لیجیے گا آپ۔ ایک دن ایسا ضرور ہوگا انشاءاللہ۔'' اس نے حسینہ پھوپو کی بات کاٹتے ہوئے کچھ اس طرح سے کہا کہ وہ سوائے اسے دیکھنے کے اور کچھ بھی نہ کرسکیں۔ ''ٹھیک ہے بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تمہارے من کی مراد پوری کرے۔'' حسینہ نے دل کی گہرائیوں سے اسے دعا دیتے ہوئے کہا لیکن کچھ دعائیں شاید قبول ہونے کے لیے ہوتی ہی نہیں۔ اسی لیے نہ تو حسینہ کی دعا پوری ہوئی اور نہ ہی انزلہ کا یقین پایا تکمیل کو پہنچا اور وہ زعیم کے ہاتھوں بری طرح پٹ کر جان کنی کے عالم میں اسپتال جا پہنچی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ساس کی فرمائش پر دوسرا بیٹا پیدا کرنا چاہا مگر الٹرا ساؤنڈ رپورٹ میں پانچویں بیٹی کی آمد کی نوید مل گئی۔ زعیم کو تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا کہ اسے پہلے چار بیٹیوں سے کون سی انسیت یا نفرت تھی کہ پانچویں کے آنے پر خوشی یا دکھ کا احساس ہوتا مگر بھلا ہو پھوپو اور حمرہ کا جنہوں نے یہ پانچواں ''پتھر'' زعیم کی طرف آنے سے پہلے ہی واپس انزلہ کی طرف لڑھکا دیا۔

زعیم نے اسے ابارشن کا حکم دیا اور یہ واحد بات ایسی تھی کہ وہ مر کے بھی نہیں مان سکتی تھی۔ بس، پھر اس کی پاداش میں اسے جیتے جی مرنا پڑا تھا۔ پھوپو نے اسے جانے کیا کھلایا کہ اس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ بے ہوش ہونے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ اسے کسی اچھے اسپتال پہنچایا جاتا مگر پھوپو نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے محلے کی دائی کو گھر ہی بلا لیا اور پھر یہ دائی کا کرشمہ تھا یا پھوپو کہ کارستانی کے انزلہ کی حالت ایسی بگڑی کہ انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ماں کو مطلع کرنا پڑا۔ سوئے اتفاق حسینہ پھوپو بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہیں جب صورت حال کا پتا چلا تو وہ ازلی ہوئی وہاں پہنچی اور پھر بھتیجی کی حالت نے انہیں آگ بگولہ کردیا۔ ''انزلہ! یہ تمہارے پاس آخری موقع ہے اگر تم نے اسے بھی گنوا دیا تو، یاد رکھنا ساری زندگی اس کی جوتیوں میں ہی پڑی رہو گی۔ نہ تمہاری کوئی عزت ہوگی اور نہ ہی تمہاری اولاد کی۔ اس لیے جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کے کرنا۔'' حسینہ نے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔

''پھوپو! میں نے زعیم سے عشق کیا ہے۔ شدید قسم کا عشق۔ وہ مجھے جس حالت میں رکھے میں رہ لوں گی۔ لیکن اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو شاید میں دوسرا سانس بھی نہ لے پاؤں۔ اب ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، مجھے خود سمجھ نہیں آرہا تو میں آپ کو کیا بتاؤں۔'' اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گر رہے تھے اور حسینہ دم سادھے اس دیوانی کو دیکھ رہی تھیں جس کے عشق کی آتش نے اس کا تن من جلا کر بھسم کر ڈالا تھا مگر وہ ابھی بھی اپنے محبوب شوہر کے نام کی ہی مالا جپے جارہی تھی۔

''رانجھا رانجھا آکھدی میں آپے رانجھا ہوئی
سدو مینوں رانجھن ماہی، ہیر نہ آکھو کوئی''

انزلہ نے روتے ہوئے آنکھیں موندھ لیں اور حسینہ بمشکل خود کو سنبھالتی وہاں سے ہٹ گئیں کہ اب اس کی پھوپو اور زعیم کی خالہ ہونے کے ناطے جو بھی کرنا تھا انہوں نے ہی کرنا تھا اور وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ اب ایک پنچایت بٹھانے کا فیصلہ انہوں نے کیا تھا جو انہیں اور ان کے بھائی کو پوری طرح یقین دلاتی کہ ان کی بھتیجی کو بھی ویسا ہی تحفظ عطا کیا جائے گا جیسا کہ حسام کے گھر میں حمرہ کو حاصل تھا اور اس بات کا تو انہیں بھی پورا یقین ہو چکا تھا کہ پنچایت اب جو چاہے فیصلہ کرے مگر انزلہ کا دیوانہ عشق کم ہونے والا نہیں تھا۔ جلد یا بدیر زعیم نے اسے پھر اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا لینا تھا اور ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جانی تھی لیکن ان کے دل کے کسی گوشے میں ایک ننھا سا امید کا دیا بھی جل رہا تھا کہ شاید زعیم کو انزلہ کی محبت راس آہی جائے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ٹھیکیدار

ثمینہ طاہر بٹ

اُس شخص کا قصہ جسے صرف یہ یاد تھا کہ دین نے اُسے چار شادیوں کی اجازت دی ہے

ٹھیکیدار نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا، وہ دونوں تیزی سے اس کے استقبال کو آگے بڑھیں لیکن جیسے ہی نظر اس کے پہلو سے لگی ''سرخ گھڑی'' پر پڑی، وہ دونوں وہیں ساکت ہو گئیں۔ چھوٹی نے بڑی کی طرف حیران خوف سے پھیلی نگاہوں کے ساتھ دیکھا۔ بڑی کے ساکت وجود میں دکھ کی دراڑیں مزید گہری ہوتی چلی گئیں۔

''تم دونوں رک کیوں گئیں؟ آگے آؤ۔ استقبال کرو ہمارا؟'' غرور اور تکبر سے پر تاثرات چہرے پر سجائے اس نے کہا تو وہ ایک دوسری کو دیکھ کر رہ گئیں۔

☆.....☆

ٹھیکیدار رمضان نے اپنی چچازاد کلثوم سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ کلثوم سارے خاندان کی لڑکیوں سے ہر لحاظ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

ممتاز تھی۔ لمبا قد، گورا سرخیاں جھلکاتا رنگ۔ کالی سیاہ ناگن جیسی بل کھاتی لمبی چوٹی اور ان سب پر بھاری پڑتی اچھی خاصی صاحب جائیداد۔ کم تو کسی سے رمضان بھی نہ تھا۔ والدین کا اکلوتا لاڈلا بیٹا۔ گاؤں میں بے شمار جائیداد کے علاوہ شہر کی بی اے تک حاصل کی گئی تعلیم اور پھر دوستوں کے ساتھ مل کر شوقیہ شروع کی گئی ٹھیکیداری جو دیکھتے ہی دیکھتے کنسٹرکشن کمپنی میں تبدیل ہوتی چلی گئی مگر وہ سب میں ٹھیکیدار کے نام سے ہی مشہور ہوگیا۔ وہ جب بھی گاؤں جاتا کلثوم کو چھپ چھپ کے دیکھتا۔ اس کا دل چاہتا کہ کلثوم بھی شہری لڑکیوں کی طرح اس سے باتیں کرے، ناز نخرے دکھائے اور فرمائشیں کرے مگر کلثوم اس کی طرف دیکھتی ہی نہ تھی۔ بس اپنے آپ میں مگن ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر دیکھ لیتی اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے سر جھکا لیتی۔ رمضان کو اس کا یہ گریز بہت کھلتا مگر وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

''رمضان پتر! میں نے تیرا رشتہ کلثوم سے طے کر دیا ہے۔ اگلے مہینے کی دس کو ہمیں جج لے کے شہر جانا ہے۔ تو جیسے بلانا چاہتا ہے، نیوتا دے دے۔'' اس کے ابا جی نے اسے خوشخبری سنائی تو وہ ایک لمحے کو سن ہو کے رہ گیا تھا۔

''بھلا کبھی من کی مراد بھی یوں پوری ہوتی ہے؟ یہ تو جیسے معجزہ ہی ہوگیا۔ اب مزہ آئے گا۔ کلثوم بی بی اب میں تم سے پوچھوں گا کہ کیا کمی تھی مجھ میں جو تو نے کبھی پیار سے دیکھنا تک گوارہ نہ کیا مجھے۔'' وہ من ہی من میں منصوبے بناتا کلثوم کو بیاہ لایا اور پھر اس پر اپنا رعب رکھنے کے لیے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ ان دونوں کی شادی کو دس برس بیت گئے۔ اس دوران ابا جی پوتا پوتی کھلانے کی آرزو دل میں لیے راہی ملک عدم ہوئے۔ ماں جی تو پہلے ہی ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اب اس حویلی نما بڑے سے گھر میں کلثوم اکیلی بولائی بولائی پھرا کرتی۔ دو بندوں کے کام ہی کتنے تھے۔ جھٹ پٹ وہ کر کے فارغ ہو جاتی اور پھر بیٹھ کے دیواریں دیکھا کرتی۔

☆.....☆

''کلثوم! کہاں ہو تم؟ دیکھو تو کون آیا ہے؟'' ٹھیکیدار اپنے وقت سے بہت پہلے گھر آ گیا تھا اور خلافِ معمول آتے ہی اسے آوازیں بھی دینے لگا تو وہ بھی حیران پریشان اپنے کمرے سے باہر آ گئی مگر اس کے سامنے جو سرپرائز اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے بارے میں تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

''کلثوم رانی! اس سے ملو یہ ہے پروین۔ میری دوسری بیوی اور تمہاری پہلی سوکن۔ کہو، کیسی لگی تمہیں؟'' ٹھیکیدار نے اپنے پیچھے سرخ جوڑے میں ملبوس سر جھکائے انگلیاں مروڑتی کھڑی پروین کو ہاتھ سے پکڑ کر اس کے سامنے کیا تو کلثوم ایک دم لڑکھڑا سی گئی۔ ''ارے! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟ آگے آؤ اور میری دلہن کو کمرے میں لے جاؤ۔ پورے اعزاز کے ساتھ۔'' اب کی بار نہ صرف اس کا لہجہ بدلا تھا بلکہ اسے چہرے سے بھی کچھ ایسا ظاہر ہوا تھا کہ کلثوم ایک ٹرانس کی کیفیت میں آگے بڑھی اور دلہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

ٹھیکیدار نے گھنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے یہ نظارہ بڑے اطمینان سے دیکھا اور پھر کلثوم اور پروین کے کمرے میں غائب ہوتے ہی ایڑیاں اٹھا کر غرور سے سر اونچا کیا اور پھر دل کھول کر قہقہے لگانے لگا۔

پروین کی حیثیت کا تعین اسی وقت ہوگیا تھا۔ کلثوم نے اسے اپنا کمرہ نہیں دیا تھا۔ بلکہ گھر کا دوسرا بڑا کمرہ اس کے حوالے کیا تھا کیونکہ وہ اپنے شوہر کا ہٹوارہ تو سہہ سکتی تھی مگر اپنے کمرے کا ہرگز نہیں اور یہ بات ٹھیکیدار بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ ''آپا! تم مجھے اپنے قدموں میں تھوڑی سے جگہ دے دو۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اب تم اور ٹھیکیدار صاحب ہی میرا سب کچھ ہو۔ تم مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دو، میں ساری عمر تمہاری غلامی کروں گی۔'' پروین نے پہلے پہل تو کلثوم کی بے رخی اور بے اعتنائی کو سہہ لیا، مگر جب اس کا رویہ تبدیل نہ ہوا تو وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ کلثوم نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر روتی، اس سے پناہ مانگتی یہ عورت تو خود بڑی مجبور، بڑی مسکین سی تھی اس سے ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی اسے، سو اس دن سے کلثوم نامحسوس انداز سے ایک بار پھر اپنے راج سنگھاسن پر براجمان ہوئی اور پروین نے ایک داسی کی جگہ سنبھال لی۔ ایسی داسی جو بنا گلہ شکوہ کیے اس کی اور ٹھیکیدار کی چوبیسوں گھنٹے خدمت پر معمور تھی۔

''ٹھیکیدار! تم اسے بیاہ کر تو لے آئے مگر گھر تو تمہارا ابھی تک سونا ہی ہے۔ ڈیڑھ سال ہو گیا تم دونوں کی شادی کو مگر ابھی تک یہ بھی میری طرح بے مراد ہی ہے۔ مان لو ٹھیکیدار کمی ہم میں نہیں تم میں ہے۔ یہ گھر اگر ابھی تک بچوں کی قلقاریوں سے خالی ہے تو اس کی وجہ ہم ''دو عورتیں'' نہیں، تم ''ایک اکیلے مرد'' ہو۔'' کلثوم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

ہوئے گہرے طنزیہ انداز سے کہا تو ٹھیکیدار کے ماتھے کی رگ پھڑکنے لگی۔ اس کی انا اور مردانگی کو یہ طعنہ تازیانے کی طرح لگا۔ وہ غصے سے کھولتا، چیزوں کو ٹھوکریں مارتا گھر سے باہر چلا گیا۔ پروین دم سادھے آنکھیں پھاڑے کلثوم کو دیکھے جارہی تھی جو آگ لگا کر اب مزے سے مسکرائے جارہی تھی۔

☆.....☆

پروین کے ہاں جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ ٹھیکیدار نے اپنے تئیں کلثوم کے طعنے کا بھرپور جواب دے دیا تھا، اس لیے وہ ایک بار پھر شیر بنا پھر رہا تھا۔ سلمان اور کامران کو کلثوم نے اپنی چھتر چھایا میں لے لیا۔ پروین کا اسٹیٹس اب بھی وہی تھا۔ ٹھیکیدار اور کلثوم کے ساتھ ساتھ اب اسے بچوں کی خدمت بھی کرنی پڑتی تھی مگر وہ اس میں بھی خوش تھی کیونکہ اسے ایک گھر کے تحفظ کے ساتھ ساتھ در پردہ کلثوم کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی۔

وقت اسی طرح گزرتا چلا گیا اور بچے پانچ سال کے ہو گئے۔ وقت بدل گیا، حالات بدل گئے نہیں بدلا تو ٹھیکیدار کا مزاج نہ بدل سکا اور اس کی یہی عادتیں کلثوم کی خوب جان جلاتیں۔

☆.....☆

رات کافی بیت چکی تھی مگر ٹھیکیدار کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ وہ دونوں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ ہلکے سے کھٹکے سے گیٹ کھلا اور وہ اپنی مست چال چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ وہ دونوں اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھیں مگر اس کے پہلو سے لگی ایک ''نئی'' سرخ گٹھڑی دیکھ کر وہیں ساکت ہو گئیں۔

''کیا ہوا، رک کیوں گئیں؟ آگے آؤ اور میری نئی دلہن کو اندر لے جاؤ۔ پورے اعزاز اور شکتی کے ساتھ۔'' ٹھیکیدار نے گھنی مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

''سنا نہیں۔ کیا کہا ہے میں نے؟ آگے آؤ اور استقبال کرو ہمارا۔'' اس نے انہیں بت بن کر کھڑے دیکھا تو زور سے دہاڑا۔ بڑی تو اپنی جگہ چٹان کی طرح جم کر کھڑی رہی مگر چھوٹی کے قدم ایک ہی دہاڑ میں اکھڑ گئے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بے بسی کے عالم میں بڑی کی طرف دیکھا۔ بڑی پر اس کے آنسوؤں کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس کھینچا اور اثبات میں سر ہلاتی آگے بڑھی اور دلہن کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔ ٹھیکیدار نے غرور سے سر اونچا کیا، ایڑیاں اٹھا کر اپنا قد اونچا کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اپنی اس کوشش کو خود ہی سراہتے ہوئے ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر سرمستی کے عالم میں جھومتے ہوئے قریب پڑی چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک گہری طنزیہ تمسخر میں ڈوبی نگاہ قریب ہی سر جھکا کر کھڑی کانپتی پروین پر ڈالی اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

کالے سیاہ آسمان پر ہیروں کی طرح ٹنگے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں نے حیرت سے اس ابن آدم کا پرغرور انداز دیکھا، پھر پلکیں جھپک جھپک کر مجرم بنی کھڑی بنتِ حوا کو دیکھا اور پھر تاسف کے گہرے احساس میں ڈوبتے ہوئے تیزی سے پھیلتے بادلوں کی ردا اوڑھ کر غائب ہو گئے جیسے اب ان میں مزید یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی ہو۔

☆.....☆

''آپا! ٹھیکیدار جی نے یہ کیا کیا؟ ہم دونوں سے ایسی کون سی خطا ہو گئی کہ وہ تیسری بھی بیاہ لائے؟ تم کچھ بولتی کیوں نہیں آپا؟ کچھ تو بولو۔'' پروین کا دکھ بڑا تھا۔ اس کے سینے پر غم کی یہ ''سل'' پہلی پہلی بار گری تھی مگر بڑی کا غم تو اس سے بھی سوا تھا۔ اسے اس سل کا بار دوسری بار سہنا پڑ رہا تھا۔

''پروین چپ ہو جا۔ تو بھی میری طرح اپنے لب سی لے۔ تو نہیں جانتی کہ ٹھیکیدار کا شمار ان مردوں میں ہوتا ہے، جنہیں اسلام کا اور کوئی حکم یاد رہے یا نہ رہے انہیں یہ ضرور یاد رہتا کہ اسلام نے انہیں چار شادیوں کا حق دے رکھا ہے تو بھی سمجھ لے ہمارا ٹھیکیدار اپنا یہ حق استعمال کر رہا ہے اور اسے یہ حق استعمال کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ نہ تم، نہ میں اور نہ ہی یہ نئی آنے والی۔ اسی لیے میں تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ خاموش ہو جا اور جو ہو رہا ہے اسے ہونے دے۔ اسی میں ہماری بھلائی بھی ہے اور یہی ہمارا بھرم بھی۔'' کلثوم نے اپنی آنکھ سے ٹپکتے آنسو کو انگلی کی پور پر چنتے ہوئے ہنس کر کہا تو اس کی ہنسی میں ٹوٹے کانچ کی چبھن نے پروین کی روح کو بھی زخمی کر دیا۔ اس نے روتے ہوئے کلثوم کے ہاتھوں پر ماتھا ٹیک دیا۔ کلثوم کے بہتے خاموش آنسو، اس کے بالوں میں جذب ہونے لگے اور اس کے گرم گرم آنسو کلثوم کا دامن بھگوتے جارہے تھے۔

وہ دو عورتیں اپنا بھرم رکھنے کو اپنے دل کا درد آنسوؤں میں بہاتی بڑی بے بس اور مجبور دکھائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مستقبل بین داستان گو مصنفہ کا تیسرا نشتر

مکڑا اور مکھی

ثمینہ طاہر بٹ

اک ایسے شاطر نوجوان کی داستان، جس نے کمال ہوشیاری سے اپنا مستقبل محفوظ کر لیا تھا

خلیل احمد کو رخشی سے محبت ہوگئی۔ ایسی محبت جس نے اس کی راتوں کی نیند ہی اڑا دی۔ رخشی کا تعلق ڈھاکہ سے تھا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی۔ خلیل احمد گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ دو بڑی بہنیں جو شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں ان کے بعد دنیا میں وارد ہوا تھا اور اب وہ دونوں بہنیں اسے اپنے بچوں کی طرح ہی چاہتی تھیں۔ وہ تھا بھی چاہے جانے کے قابل۔ اونچا لمبا، گورا چٹا پٹھان بچہ۔ بہنوں کو اس پر بڑا مان تھا۔ بہنوئی صاحبان بھی محبت سے پیش آتے تھے۔ بڑی آپا کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی نند کی بیٹی کو بھابی بنائیں۔ چھوٹی آپا کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا، اور نیم رضامند تو خلیل احمد بھی ہو چکا تھا کہ اچانک ان کے پڑوس میں رخشی کا خاندان آن بسا۔ اور بس، پھر کیا تھا۔ سب کے خواب ادھورے ہی رہ گئے اور رخشی کا بنگالی حسن خلیل احمد کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔

”آپا! آپ بڑی آپا سے بات کریں ناں۔ مجھے رخشی سے شادی کرنی ہے، بانو سے نہیں۔ بانو بہت اچھی لڑکی ہے۔ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ اس کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ وہ جہاں بھی جائے گی راج کرے گی۔ لیکن میں اب رخشی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں شادی کروں گا تو صرف اور صرف رخشی سے۔ ورنہ ساری عمر ایسے ہی گزار دوں گا۔ آپ بڑی آپا سے کہہ دیں کہ رخشی کے گھر والوں سے خود بات کر لیں، ورنہ میں!“

”خلیل! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ دماغ درست ہے تمہارا؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کہاں ہماری بانو اور کہاں وہ کالی کلوٹی رخشی؟“ آپا کا پوری بات سنے بغیر ہی دماغ الٹ گیا تھا، وہ الٹا اس پر ہی چڑھ دوڑیں۔ مگر ان کے میاں صاحب بہت معاملہ فہم انسان تھے۔ انہوں نے خلیل کے بدلتے تیور دیکھے تو بیوی کے ساتھ ساتھ بڑی آپا کو بھی اس طرح قائل کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اس رشتے کو قبول کر لیا۔

☆......☆

”خلیل! ہم نے تمہاری بات مان لی۔ اب تمہیں بھی ہماری ماننی ہوگی۔ اماں، ابا اس دنیا سے جاتے وقت جو وعدہ ہم سے لے کر گئے تھے، الحمدللہ، ہم نے وہ پورا کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ تم کل ہی اپنی بیوی کو لے کر اپنے گھر شفٹ ہو جاؤ۔ اب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں لگتا۔“ شادی کے ہفتہ بھر بعد ہی بڑی آپا نے اسے مژدہ سنایا تو وہ حیران ہی رہ گیا۔

”لیکن آپا۔ ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا گھر تو کرائے پر!“

”نہیں۔ میں نے کرائے داروں کو نکال دیا ہے۔ اور گھر کی ضروری مرمت بھی کروا دی ہے۔ کچھ ضرورت کا سامان بھی ہم نے گھر میں ڈلوا دیا ہے جو تم دونوں کے لیے کافی ہوگا۔ اس لیے اب بہانے مت بناؤ اور اپنی گھر داری سنبھالو جا کر۔“ آپا نے اسکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بات کاٹتے ہوئے رسان سے کہا تو خلیل سر جھکا کر رہ گیا۔ رخشی بھی سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہی تھی۔ خلیل کے گھر والوں کا بجھا بجھا رویہ اسے دلی تکلیف دے رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی ساری زندگی ان الجھے الجھے رویوں کے ساتھ کیسے گذار اکر پائے گی۔ مگر یہاں تو سب کچھ خود بخود ہی بدلتا چلا گیا۔ اسے کچھ خاص کوشش ہی نہیں کرنی پڑی اور اگلے ہی روز وہ دونوں ایک نئی آبادی میں بنے اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر میں شفٹ ہو گئے۔

☆.....☆

قمرین ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ دونوں اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔ مالی طور پر آسودہ نہیں تھے، مگر باہمی محبت سے گزارا بہت اچھا ہو رہا تھا۔ قمرین شادی کے سات سال بعد ان کی جھولی میں ڈالی گئی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے بہت منتیں مانی تھیں۔ اور اسی لیے وہ اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ وہ بالکل رخشی کی کاپی تھی۔ اسی کی طرح بنگالی حسن کا شاہکار۔ جس وقت وہ سولہ سال کی ہوئی رخشی کو کینسر جیسے موذی مرض نے جکڑ لیا۔ وہ بستر پر گیا پڑی گھر کا گھر ہی الٹ کر رہ گیا۔ خلیل احمد کا دل اپنی محبوب بیوی کو تکلیف میں دیکھ کر دھڑکنا ہی بھول گیا۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ قمرین پر گویا ساتوں آسمان ایک ساتھ ٹوٹ پڑے تھے۔ بہنوں نے بھی بھائی کی یہ حالت دیکھی تو سب اختلافات بھلا کر اس کی مدد کو دوڑی آئیں۔ ادھر رخشی کے بھائی بھاوجیں بھی مقدور بھر ان کا خیال رکھ رہے تھے۔ قمرین اس ساری صورتِ حال میں سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ اس کے دسویں کے امتحان سر پر تھے کہ یہ افتاد آن پڑی۔ وہ خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کرتی، مگر ماں باپ کی بیماری نے اسے بہت زیادہ دہلا دیا تھا۔ اس کی زرد رنگت اور پریشانی دیکھ کر خلیل احمد اور زیادہ پریشان رہنے لگے ادھر رخشی کی بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے میں خلیل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کریں کیا؟

''خلیل بھائی! میری مانیں تو آپ کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر بچی کی شادی کر دیں۔ بھابی کی جو حالت ہے، اس سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری مانیں تو وقت ضائع مت کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بچی کو اپنے گھر میں خوش باش دیکھ کر ہی بھابی ٹھیک ہو جائیں۔!!''

ان کے دوست نے ہمدردی بھرے انداز میں انہیں مفت مشورہ دیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔

☆.....☆

رمیض، خلیل احمد کے آفس میں ہی کام کرتا تھا۔ اس کے شانوں پر بہت بھاری ذمہ داریاں تھیں۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا جب اس کا باپ وفات پا گیا۔ وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹے دو بھائی اور ایک بہن تھے جو ابھی پڑھ رہے تھے۔ ماں بھی عامی سی گھریلو خاتون تھیں سو وہ سب اس کی طرف ہی دیکھنے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مجبور تھے۔ رمیض نے بھی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ باپ کا چھوڑا ہوا کام بہ طور ذمہ داریوں کے سنبھال لیا۔ اس کا باپ ایک مانا ہوا مشہور لاک ماسٹر تھا۔ تالے اس کے ہاتھوں میں آکر موم ہو جاتے تھے۔ مگر آدمی ایماندار تھا۔ ساری عمر ایمانداری کے ساتھ گذاری تھی اسی لیے بیوی بچوں کو اپنی چھت بھی نہ دے سکا تھا اور یہ بات اس کی بیوی کے دل میں الی کی طرح گڑی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اپنا ذاتی گھر بن چکی تھی، چاہے چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو اور اب اس نے یہ خواہش، جاگتی آنکھوں کا خواب بنا کر رمیض کو سونپ دیا تھا اور رمیض پکا ارادہ کر چکا تھا کہ وہ اپنی ماں کو ان کا گھر دے کر رہے گا چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کا دماغ بہت تیز چلتا تھا۔ چھوٹی عمر سے ہی زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کے وہ وقت سے پہلے ہی بڑا ہو گیا تھا اور اسی حساب سے اس کا شاطر پن بڑھ چکا تھا۔ خلیل احمد کی بیماری کے دوران اس کا ان کے گھر آنا جانا ہوتا رہا تھا۔ خلیل کو ہارٹ اٹیک دفتر میں ہی ہوا تھا اور انہیں بروقت اسپتال پہنچانے اور پھر ان کا خیال رکھنے والوں میں وہ سب سے آگے آگے تھا، اور اس کی وجہ اس کا تیز چلتا دماغ ہی تھا۔ وہ پہلی بار جب ان کے گھر آیا تو اسے یہ چھوٹا سا خوبصورت گھر بہت پسند آیا تھا۔ اس کے دل میں پلنے والی حسرت شدید قسم کی خواہش بن کر ابھری تھی۔ وہ شاید اپنے دل کو منا بھی لیتا، اپنی حسرت کو دبا بھی لیتا مگر اچانک ہی قمرین اس کے سامنے آگئی۔ لمحوں میں اس کے شاطر دماغ نے پلان تیار کیا اور پھر پوری تندہی سے اس پر عمل کرنے جت گیا۔ بلا کا ذہین تو تھا ہی، خلیل احمد کے حالات اور ان کے اپنی بہنوں سے اختلافات کو فوری طور پر بھانپ گیا اور اسے اپنے سارے ارمان اسے پورے ہوتے دکھائی دینے لگے تھے۔

☆.....☆

خلیل احمد نے رمیض کا رشتہ قمرین کے لیے قبول کر لیا۔ رخشی کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی اور خلیل کو بھی لگنے لگا تھا کہ اب شاید وہ بھی زیادہ جی نہ پائیں، بس اسی سوچ نے انہیں انتہائی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور جونہی قمرین ایف اے کا آخری پرچہ دے کر آئی اسے مایوں بٹھا دیا گیا۔ اس کی آنکھوں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے، وہ کچھ بننا چاہتی تھی، اپنے والدین کا مضبوط سہارا، آنکا باز و، مگر اس کے سب خواب دھرے کے دھرے رہ گئے اور اس کے ہاتھوں میں رمیض کے نام کی مہندی لگا دی گئی۔

☆.....☆

''رمیض۔!! تم نے تو کہا تھا کہ بہت جلد ہماری کمیٹی کھلنے والی ہے، مگر مجھے تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ آٹھ ماہ ہونے کو آئے تمہاری شادی کو، مگر ہم تو ابھی تک وہیں کے وہیں بیٹھے ہیں۔ وہی کرائے کا گھر اور وہی تمہاری دن رات کی لچھے دار باتیں۔!!'' اس نے اپنی ماں کو جانے کیا پٹیاں پڑھائی تھیں کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی قمرین کو بہو بنا لائیں تھیں، ورنہ رخشی اور خلیل کی بیماری نے تو انہیں ڈرا رکھا تھا کہ کہیں کینسر جیسی موذی بیماری کے جراثیم قمرین جہیز میں ساتھ نہ لے آئے۔ یہی وجہ تھی کہ سب گھر والے اس سے دور دور ہی رہتے۔ کام تو اس سے سب کروا لیتے، مگر اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھانے پینے سے احتراز ہی کرتے تھے۔ وہ کم عمر ضرور تھی، مگر کم عقل نہیں تھی، سب سمجھتی تھی اور جب گھر والوں کے اس رویے کی شکایت رمیض سے کرتی تو وہ باتوں کا دھنی لمحوں میں اسے بہلا لیتا۔

''امی پلیز! میری خاطر، تھوڑا وقت اور برداشت کر لیں۔ رخشی آنٹی کو تو ڈاکٹر ایک قسم کا جواب ہی دے چکے ہیں۔ وہ تو اب بستر مرگ پر ہیں، آج نہیں تو کل انہیں تو مرنا ہی ہے اور رہ گئے خلیل انکل تو وہ بھی دل کے مریض ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آنٹی کے مرتے ہی انکل بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی روانہ ہو جائیں گے تو ایسے میں بچے گا کون۔؟ ان کی اکلوتی وارث آپکی بہو قمرین اور قمرین کا شوہر ہونے کی حیثیت سے اس گھر جائیداد کا مالک کون ہوگا؟ آپکا بیٹا رمیض۔ اور میں آپ سے پھر وعدہ کر رہا ہوں امی کہ بہت جلد خلیل احمد کے گھر کی مالک و مختار آپ ہوں گی۔ میں قمرین کو مجبور کر دوں گا کہ وہ اپنا گھر اپنی مرضی سے آپ کے نام کر دے گی۔ بس، آپ تھوڑا انتظار اور کر لیں۔ میں نے اپنی محبت اور اطاعت کو جو جال قمرین اور اس کے ماں باپ کے گرد بن رکھا ہے، وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ یقین کریں آپ۔'' رمیض اپنی ماں کو بانہوں کے حلقے میں لیے ان کے کانوں میں امرت انڈیل رہا تھا، یہ جانے بغیر کے اس کی ساری پلاننگ دروازے کے باہر کھڑی قمرین کی سماعتوں میں زہر بن کر اتر چکی تھی۔ وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ رمیض نے بڑی ہوشیاری سے اسے اور اس کے باپ کو اپنے دام میں پھنسایا تھا، کسی مکھی کی طرح وہ بھی اس دام محبت کے جال میں بری طرح پھنس چکے تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تازہ کار قلم کار کے قلم کی پہلی فسوں خیزی

در گورِ محبت

وقاص حسین

دین و دنیا کو در گور کرتی محبت کی اِک داستانِ عبرت

''لالہ تم کس کیس میں اندر آئے ہو؟'' بشیرے کے ساتھ بند قیدی نے بشیرے سے پوچھا تھا۔ بشیرے نے ایک لمبے سانس بھرا تھا اور جھکی گردن کو اٹھا کر ساتھی قیدی کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھ کر مسکرایا تھا۔ پھر دیوار کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''یار تجھے کیا بتاؤں۔ مجھے تو ابھی خود سمجھ نہیں آ رہی کہ میرے ساتھ ہوا کیا۔ بس قصہ مختصر یہ ہے کہ عورت کبھی بھی اپنی پہلی محبت کو نہیں بھولتی اس کے لیے اُسے چاہے اپنا ہنستا بستا گھر ہی کیوں نہ برباد کرنا پڑے وہ کر گزرتی ہے۔ اُس کو چاہے جتنی بھی خوشیاں دے دو ہر آسائش

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اُس کے قدموں میں لا کر رکھ دو جیسے ہی پہلا محبوب سامنے آیا ہر چیز کو ٹھوکر مار کر اس کے ساتھ ہو لے گی۔ اب کیا بتاؤں تمہیں شاید میری کہانی سن کر تمہیں یقین نہ آئے لیکن میں جو کہوں گا اس کا ایک ایک لفظ سچا ہے۔'' بشیرے نے کمر کے ساتھ سر بھی پچھلی دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

''مجھے طلاق چاہیے بس میں اب اور تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' بشیرا اپنی بیوی کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا کہ اُس نے یہ کیا بات کردی ہے۔ کچھ دنوں سے اُکھڑے مزاج کا یہ نتیجہ نکلے گا بشیرے کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ بشیرے کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اُکھڑی اُکھڑی کس وجہ سے پھر رہی ہے۔ اس نے تو کبھی اس کو برا بھلا نہیں کہا تھا اس کو لگا تھا کہ بچے زیادہ تنگ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان دنوں چڑچڑی رہنے لگی ہے۔ بشیرے کی تو ہنستی بستی زندگی میں ایک دم سے طوفان آ گیا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے آخر ہو کیا گیا۔ پہلے تو تھوڑی دیر بشیرا کچھ بول ہی نہیں سکا تھا اُس کو اس قدر شاک لگا تھا اپنی بیوی کی بات سن کر۔ تھوڑی دیر بعد جب بشیرا کچھ بولنے کے قابل ہوا تو حیرانگی اور بے یقینی سے پوچھنے لگا۔

''آخر کیوں؟''

کیونکہ بشیرے کی دس سالہ زندگی کافی خوشحالی سے گزاری تھی اور اس کی ایک بیٹی اور ایک بھی بیٹا تھا۔ جن کی عمر آٹھ اور چھ سال تھی۔

''بس میں وجہ نہیں بتا سکتی اور نہ ہی میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا، مجھے بس طلاق چاہیے اور وہ بھی جلد سے جلد۔'' بشیرے کی بیوی بولی۔

''اچھا میں سوچ کر بتاؤں گا۔'' بشیرے نے اپنی بیوی کی بات کو ہوا میں اُڑاتے ہوئے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

بشیرے کی بے یقینی ابھی بھی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سوچوں میں گم سیدھی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔

شرک تو رب کو بھی پسند نہیں اپنی محبت میں۔ تو میں کیسے برداشت کرلوں میں تو پھر اس کا بندہ ہوں۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں تم کیسے طلاق لیتی ہو میں نے تمہیں سونے کا لقمہ کھلایا۔ تمہیں پھولوں کی سیج کا بستر دیا۔ تمہیں کبھی اُف تک نہیں کیا۔ تمہیں اپنی ہتھیلی کے چھالے کی طرح رکھا اور تم نے دس سالہ رفاقت کا یہ صلہ دیا۔ تم نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔

بشیرے نے اپنی بیوی کے بدلتے تیور اور چڑچڑاہٹ دیکھ کر چند دنوں میں ہی ساری معلومات حاصل کرلی تھیں۔

بشیرے کی بیوی شادی سے پہلے اپنے ایک دور کی کزن سے محبت کرتی تھی اور اسی سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے گھر والوں کو وہ لڑکا پسند نہیں آیا تھا اور انہوں نے اُس کی شادی بشیرے سے کردی تھی۔ وہ لڑکا ملک سے باہر چلا گیا تھا اور سال بھر پہلے واپس لوٹا تھا اور آتے ہی اس کی اور بشیرے کی بیوی کی ملاقاتیں شروع ہوگئی تھیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے بشیرے سے طلاق لے کر اُس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

بھولا بھالا بشیرا ایک دم سے شیر ہو گیا تھا۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ اپنی بیوی کو جان سے ہی مار دے جس نے اس کی دس سال کی محبت کو چند مہینوں میں بے صلہ کر دیا تھا اور پھر اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اپنی بیوی کو سبق سکھانے اور ذلیل کرنے کا سوچ لیا۔

''بشیرے مجھے طلاق دے دو ورنہ ساری زندگی پچھتاؤ گے۔'' بشیرے کی بیوی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو کرنا ہے کرلو میں نہ تو آج تمہیں طلاق دوں گا نہ ہی کل۔ جو ہو سکتا ہے تم سے کرگزرو میری طرف سے کھلی اجازت ہے۔'' بشیرے نے اسی کی لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

دروازے پر دستک نے سوئے ہوئے بشیرے کو اُٹھا دیا اور وہ جلدی سے جوتی پہننے لگا لیکن دروازے کی دستک پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ بشیرے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے دروازہ ابھی ٹوٹ کر گر جائے گا۔ بشیرا بھاگنے کے انداز میں دروازے کی طرف لپکا تھا۔ بشیرا ابھی دو چار قدم دور ہی تھا جب کھڑک کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے دروازے کی کنڈی ٹوٹ گئی اور پانچ سات پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ بشیرا حیران پریشان کھڑا تھا۔ ایک پولیس والے نے بڑی کرخت آواز میں پوچھا۔ ''تم بشیرے ہو؟'' بشیرے کا اقرار ابھی پوری طرح سے مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک پولیس والے نے آگے بڑھ کر اس زور سے بشیرے کی گردن پر تھپڑ جڑا کہ وہ منہ کے بل گرا اور ابھی اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک پولیس والے نے بشیرے کے پیٹ میں ٹھوکر ماری اور پھر دو پولیس والوں نے بشیرے کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اُٹھایا اور پولیس وین میں پھینک دیا اور وین چل پڑی۔

☆.....☆

بشیرے کو جب ہوش آیا تو اُس نے خود کو سلاخوں کے پیچھے پایا تھا۔ بشیرے کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آخر اس سے کیا خطا ہوئی تھی آخر اس نے کیا جرم کیا ہے۔ ابھی بشیرے کو سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزاری تھی کہ ایک پولیس والا آیا اور دو تین موٹی موٹی گالیاں نکالتے ہوئے کالر سے پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے تفتیشی کمرے میں لے آیا اور پہلے تو اُسے اچھی طرح دھویا گیا اور جب اس نے اپنا قصور پوچھا تو اُسے ایک بار پھر دھویا گیا اور موٹی موٹی گالیوں سے نوازا گیا اور پھر ایک پولیس والا گندی گالی کے ساتھ بولا۔ ''قرآن پاک کی بے حرمتی کرتے ہو قرآن پاک کو جلاتے ہو، مسلمان سے کافر ہو گئے ہو اور بیوی کو بھی کافر ہونے پر مجبور کرتے ہو اور اس کے نہ ماننے پر تشدد کرتے ہو۔ تم تو سیدھے سیدھے واجب القتل ہو لیکن تمہارا فیصلہ عدالت کرے گی۔''

بشیرا خود پر لگے اس الزام سے چکرا کر رہ گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پامالِ حقوقِ نسواں اور قرآن پاک کی بے حرمتی کا پرچہ اُس کی بیوی نے کروایا تھا۔ بشیرے کو بولنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس پر ہوئے تشدد نے اسے نیم بے ہوش کر دیا وہ بتانا چاہتا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا حقیقت تو اس کے بالکل اُلٹ ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ بشیرے کی بیوی قرآن پاک اُس کے سامنے لے آئی تھی اور اس کے واسطے دینے لگے تھی کہ مجھے طلاق دے دو اور جب بشیرا نہیں مانا تو وہ دھمکی دینے لگی کہ قرآن پاک اُٹھا کر آگ میں جھونک دے گی اگر اُس نے طلاق نہ دی تو۔ بشیرا نے اس کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرے گی وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی مسلمان ایسا بھی کر سکتا ہے۔ بشیرے کی طرف سے جب کوئی لچک نظر نہ آئی تو بشیرے کی بیوی نے اگلے ہی لمحے قرآن پاک کے چند اوراق شہید کر کے جلتے چولہے پر رکھ دیے۔ بشیرے کو اس کی ہرگز امید نہیں تھی بشیرے نے جلدی سے اُٹھ کر آگ پر جلتے قرآن پاک کے اوراق اُٹھا لیے اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنی بیوی سے قرآن پاک بھی چھین لیا۔ بشیرے کی تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی تھی۔ بشیرے کی حالت دیکھنے قابل تھی وہ کبھی قرآن پاک کو چومتا کبھی سینے سے لگاتا کبھی اس کو بوسے دے کر ماتھے پر لگاتا۔ بشیرا تو ایک لمحے میں ہی پاؤں جلی بلی کی طرح ہو گیا تھا اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

بشیرا بڑی دیر قرآن پاک کو سینے سے لگا کر روتا رہا اور پھر جلدی سے اندر گیا اور قرآن پاک الماری کے اوپر رکھ کر باہر آ گیا۔ اس کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ بشیرے نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور اپنی بیوی کو تب تک پیٹتا تھا جب تک وہ ادھ موئی ہو کر گر نہ گئی۔

بشیرا اپنی بیوی کو پیٹ کر باہر نکل گیا اور جب وہ واپس آیا تو اس کی بیوی گھر پر نہیں تھی اور نہ ہی بچے تھے۔ بشیرے نے دروازہ بند کیا تھا اور آ کر چارپائی پر لیٹ گیا اور پھر پتا نہیں کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور دروازہ پیٹنے کی آواز پر اُس کی آنکھ کھلی تھی اور آگے جو کچھ ہوا اس کی اسے ہرگز اُمید نہ تھی۔ کوئی عورت ایسا بھی کر سکتی ہے اپنی محبت کو پانے کے لیے۔ جب بشیرا سوچتا تو اُس کی روح کانپ جاتی اور غصے سے اس کا برا حال ہو جاتا اور ایسا ہی اب اپنی کہانی مکمل کرنے کے بعد اُس کے ساتھ ہوا تھا اور اُس کا ساتھی قیدی اس کی کہانی سن کر ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تازہ کارقلم کار کے قلم کی دوسری فسوں خیزی

انصاف

وقاص حسین

جب ظالم ظلم کی انتہا کر دیں، انصاف کا لہو ہو جائے تو انجام کسی بھی روزن سے اپنا کام کر جاتا ہے

''انصاف'' ہمارے ملک میں نایاب ہو چکا ہے۔ اس کا اندازہ تو مجھے بہت پہلے ہو گیا تھا لیکن میں یہ بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ کیونکہ میرے باپ نے زبردستی میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ ''انصاف کے لیے لڑو گے تو انصاف ملے گا۔ کوئی تمہاری جھولی میں خود نہیں ڈال دے گا۔''

میں ہمیشہ سے جنونی طبعیت کا تھا اور میرا باپ انصاف پسند ٹھنڈے مزاج کا۔ میں ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار رہتا تھا اور غلط مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور آئے دن کوئی نہ کوئی لڑائی کر کے گھر آتا تھا۔ میں اپنے اس سسٹم سے اتنا دلبرداشتہ ہو چکا تھا کہ سوچتا کسی جنگل میں جا کر بس جاؤں کیونکہ وہاں کہ جانور بھی انسانوں سے کم جانور ہیں۔

آئے روز کے ہنگاموں سے تنگ آ کر میرے باپ نے مجھے ملک سے باہر بھیج دیا اور میں نے بھی وہاں جا کر ہی سکون کا سانس لیا تھا۔

مدر لینڈ تو سب کو ہی پیاری ہوتی ہے اور اس کے لیے لوگ جان دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ پر کچھ میرے جیسے بھی ہوتے ہیں جن کو صرف اور صرف نفرت ہوتی ہے اور میں نفرت کیوں نہ کروں میری کہانی سن کر کوئی مجھے مضبوط دلیل دے کہ میں اس سے نفرت کرنا چھوڑ دوں۔

جس معاشرے میں انصاف ختم ہو جائے وہاں جرائم بڑھ جاتے ہیں۔ میرے باپ کا قانون پر سے ایسا بھروسہ اٹھا کہ وہ گلہ کرنے کے لیے بچے ہی نہیں۔

''سر سیٹ بیلٹ باندھ لیں جہاز لینڈ کرنے والا ہے۔'' ایئر ہوسٹس نے میرے خیالوں کو منتشر کیا اور میں حال میں واپس آ گیا تھا اور ایئر ہوسٹس کے کہے پر عمل کرنے لگا تھا۔

☆.....☆

ہاں تو میں آپ لوگوں کو ایک کہانی سنانے والا تھا۔ کہانی شروع ہوتی ہے ایک پلاٹ خریدنے سے۔ اور میری بدقسمتی یہ تھی کہ جب کہانی شروع ہوئی تب میں ایک پروجیکٹ پر ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں فون اور انٹرنیٹ جیسی سہولت موجود نہیں تھی صرف سیٹلائٹ فون تھا جو بہت ارجنٹ کی صورت میں استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ چھ ماہ بعد جب اس پروجیکٹ سے میں واپس لوٹا تو سب ختم ہو چکا تھا اور میرے لیے کچھ ای میلز اور ویڈیوز باقی بچے تھے جنہیں پڑھ کر اور دیکھ کر میں جیتے جی مر گیا تھا۔

''بیٹا تم نے بتایا کہ تم کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں شہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے بہت دور جارہے ہو رابطہ نہیں ہو پائے گا اور تین چار ماہ وہاں پر لگ جائیں گے۔ اللہ تمہار حامی و ناصر ہو۔ تم خیریت سے واپس آجاؤ۔''

''بیٹا میں تمہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ ہم نے جو پلاٹ دو سال پہلے MNA اور اس کے بھائیوں سے قسطوں پر لیا تھا۔ جس کی آخری قسط اس ماہ ادا کر کے رجسٹری اپنے نام کروانی تھی اور قبضہ لینا تھا۔ باون لاکھ ادا کر چکے ہیں اور آٹھ لاکھ روپے ادا کرنے ہیں وہ میں آج لے کر گیا تھا پر وہ اس نے دینے سے انکار کر دیا ہے اور اب وہ کہہ رہے ہیں اپنے پیسے واپس لے لو ہم نے نہیں دینا پلاٹ۔ دراصل اس پلاٹ کی قیمت تین گنا ہو چکی ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ سول عدالت میں دعویٰ تعمیل معاہدہ مختص دائر کر دوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ فیصلہ اپنے حق میں ہو جائے گا۔

☆.....☆

''بیٹا میں نے ان کے خلاف کیس دائر کر دیا تھا اور اب وہ لوگ فون کر کے دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کچھ دن پہلے ان کے غنڈوں نے مجھ پر اسلحہ تانا اور کہنے لگے کہ کیس واپس لے لو ورنہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ پولیس والے میرے کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہیں اور مجھے تھانے سے بے عزت کر کے نکال دیا ہے۔ اب مجھے سمجھ نہیں آرہی میں کیا کروں۔''

☆.....☆

''بیٹا مجھے سمجھ نہیں آرہی میں کیا کروں میں بہت پریشان ہوں کوئی بھی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو وکیل میں نے کیا تھا اس کو بھی MNA نے خرید لیا ہے اور وہ کل امریکہ چلا گیا ہے اور کہتا ہے تم اپنا کوئی اور بندوبست کر لو مجھ پر بہت پریشر ہے میں تمہارا کیس نہیں لڑ سکتا۔ اب کوئی بھی وکیل کیس لڑنے کو تیار نہیں ہوتا جس کے پاس بھی جاتا ہوں وہ کہتا ہے میری مجبوری ہے میں تمہارا کیس نہیں لڑ سکتا۔''

☆.....☆

''بیٹا پرسوں رات تقریباً ایک بجے پولیس نے ہمارے گھر ریڈ کیا۔ SHO، ASI اور پندرہ بیس اہلکاروں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی، گھر کا سارا سامان اِدھر اُدھر پھینک دیا میں گھر پر نہیں تھا تمہارے دادا ابو اور چاچو کو پکڑ کر لے گئے اور تمہاری امی اور بہن کے ساتھ بہت بدتمیزی سے پیش آئے۔ تمہارے دادا اور چاچو کو تھانہ کے لاک اپ میں بند کر دیا۔ پھر اگلے دن شہر کے کاروباری شخصیات کو لے کر گیا اور کافی بحث کے بعد تمہارے دادا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور چاچو کو چھڑوا کر لایا۔ پولیس والے کہتے ہیں مجھے ان کے حوالے کردو کیونکہ مجھ پر کافی مقدمات درج ہیں جب ان کی کاپی کا کہا گیا تو دینے سے انکار کردیا اور کہتے ہیں مجھ پر کیے گئے مقدمات سیکرٹ ہیں۔''

''بیٹا تم ٹھیک کہتے تھے یہاں پر جنگل کے قانون سے بھی بدتر قانون ہے۔ نہ پولیس میری بات سنتی ہے نہ عدالت اور نہ ہی کوئی میری مدد کرنے کو تیار ہے۔ میں بے بس ہوگیا ہوں مجھے کوئی بھی راہ نظر نہیں آتی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیا کروں کس طرف جاؤں کس کا در کھٹکھٹاؤں جو میری مدد کرے۔ پولیس کے بندے اب ہر وقت ہمارے گھر کے باہر کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے گھر کے اندر اور باہر ہیڈن کیمرا زلگا دیے ہیں جو آٹو ریکارڈر ہیں اور ہر دس منٹ بعد اپنی ویڈیو اپ لوڈ کردے گا جس کا لنک اور پاس ورڈ میں نے تمہیں بھیج دیا ہے۔ بیٹا مجھے بہت ڈرلگ رہا ہے بس تم جلدی سے واپس آجاؤ پتا نہیں کیا ہوجائے گا۔

☆.....☆

''بیٹا ایک ہفتے پہلے پولیس نے پھر گھر پر ریڈ کیا گھر کی گرل اور دروازے توڑ دیے اور مجھے پکڑ کر تھانہ A ڈویژن لے گئے اور مجھے روزے کی حالت میں مارتے رہے اور پھر افطاری کے بعد دوسرے تھانے لے جا کر بند کردیا اور پھر وہاں پر بھی جا کر تشدد کیا اور پھر رات تقریباً دس بجے ASI مجھے کار میں بٹھا کر تیسرے تھانے لے گیا اور پھر وہاں بھی ساری رات تشدد کرتے رہے، گرمی میں بھوکا پیاسا رکھا اور میری کنپٹی پر پسٹل رکھ کر جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے رہے۔

پھر اگلے دن MNA کا بھائی اور ASI آئے اور مجھے لاک اپ میں لاتوں اور تھپڑوں سے مارتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم پر کیے گئے کیس واپس لے لو ورنہ تمہیں جان سے ماردیں گے اور جب میں نے ان کی بات نہ مانی تو مجھے ہتھکڑی لگا کر MNA کے گھر لے گئے اور پھر گھر سے تمہارے دادا اور چاچو کو بھی اٹھا کر لے آئے اور پھر ہمارے سروں پر اسلحہ لہراتے ہوئے کہنے لگے کہ ہماری بات مانتے ہو یا ہم تم سب کو ماردیں تو مجبوراً میں نے کہا۔ ''جیسے آپ کہتے ہیں مجھے منظور ہے۔'' تو MNA کہنے لگا کہ ''ہم پر کیے گئے سارے کیس واپس لو اور FIA میں دی گئی درخواست بھی واپس لو اور ہمیں اپنی جانیں بخشنے کا پندرہ لاکھ بطور نذرانہ دو تو میں مجبوراً مان گیا۔'' پھر انہوں نے گن پوائنٹ پر ہم سے ایگریمنٹ پر انگوٹھے لگوائے اور دستخط کروائے اور ساتھ ہی دس خالی پیپرز پر بھی انگوٹھے لگوائے اور دستخط کروائے اور اٹھا کر اپنے گھر سے باہر پھینک دیا۔

☆.....☆

''بیٹا چار دن پہلے MNA کے بھائی کا فون آیا کہ پلاٹ کی اصل رسیدیں ساتھ لے کر آؤ اور وعدہ ایگریمنٹ کے مطابق 37 لاکھ لے کر آجاؤ۔''

جب میں MNA کے بھائی کے آفس میں گیا تو تھوڑی دیر بعد ASI سمیت پولیس آگئی اور آتے ہی ہتھکڑی لگا دی اور پھر MNA کے بھائی نے میرے ہاتھ سے پلاٹ کی رسیدوں والا لفافہ جس میں اصلی رسیدوں کی فوٹو کاپیاں تھیں چھین لیا۔ اس نے لفافہ کھولا تو فوٹو کاپیاں دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا اور پھر میری ہتھکڑی کھولتے ہوئے بولا۔ ''اصل رسیدیں ساتھ لے آؤ ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ تمہارے سارے خاندان کا نام ونشان مٹادیں گے۔''

''میں پریشانی کی حالت میں گھر گیا سب کو ساتھ لیا اور شہر ہی چھوڑ دیا اور اب دوسرے شہر میں آکر ایک ہوٹل میں رہ رہا ہوں۔ کرائے کا مکان بھی تلاش کررہا ہوں۔''

☆.....☆

یہ کہانی یہاں پر ختم نہیں ہوئی۔ اس سے آگے بھی چلی تھی پر سنانے کے لیے میرا باپ نہیں بچا تھا میرے باپ نے اس کی ای میلز نہیں کی تھیں۔ میں نے اس کی ویڈیوز دیکھیں جو کیمروں کی آنکھوں نے ریکارڈ کیا تھا جو پچھلے واقعات سے بھی زیادہ ہیبت ناک تھیں۔

میرے باپ نے کرائے کے مکان میں شفٹ ہوتے ہی Hidden کیمرے دوبارہ لگا دیے تھے۔ کیونکہ شاید انہیں اب بھی خطرہ تھا اور پھر وہی ہوا جس کا ان کو ڈر تھا۔

رات 10:47 کا ٹائم تھا جب بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک دینے والی کوئی عورت تھی اور پھر جیسے ہی دروازہ کھلا عورت آگے بڑھی اور پیچھے سے دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور اندر داخل ہوگئے اور پھر عورت باہر چلی گئی اور ان آدمیوں نے اسلحہ باہر نکال لیا پھر تھوڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیر بعد پانچ آدمی اور داخل ہوئے جن میں SHO,ASI اور MNA کا بھائی دیگر اور تھے۔ سارے گھر والوں کو اسلحہ کے زور پر باہر صحن میں لے آئے تھے اور پھر سب کے منہ پر ٹیپ لگا دی تھی۔ پھر میرے باپ، دادا اور چاچو کو تھپڑوں اور لاتوں سے مارنا شروع کردیا جب وہ نڈھال ہو کر گر پڑے تو SHO اور MNA کے بھائی نے میری بہن کو بے آبرو کردیا اور میری ماں کے کپڑے پھاڑ دیے۔ ایک غیرت مند بھائی اور بیٹے کے لیے اس سے زیادہ ہیبت ناک اور کیا ہوگا۔ پھر اسی پر بس نہیں کی۔ ان کو ان کے کمروں میں بند کر کے گیس کے چولہے کھول دیے اور جگہ جگہ پیٹرول چھڑک دیا وہ خود ایک ایک کر کے باہر نکل گئے اور پھر MNA کے بھائی نے سگریٹ جلا کر پھینک دی۔ تھوڑی دیر میں ہی آگ نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اور پھر اس واقعے کو گیس لیچ اور شارٹ سرکٹ کے گلے ڈال کر کیس بند کردیا گیا۔

یہاں پر ایک کہانی تو ختم ہوگئی تھی لیکن یہاں سے ایک اور کہانی نے جنم لیا تھا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا لیکن ویسا ہوا نہیں جیسا میں نے سوچا تھا۔

☆.....☆

مجھے انصاف چاہیے تھا جس کی امید بالکل بھی نہیں تھی پاکستان کے کسی بھی ادارے سے کیونکہ جہاں کی پولیس بکتی ہو، وکیل بکتے ہوں، جج بکتے ہوں۔ جہاں کا FIA کا ادارہ میں سنا ٹا ہو جہاں کا اینٹی کرپشن کا ادارہ خاموش ہو، وہاں انصاف کی امید رکھنا سب سے بڑی بیوقوفی ہے اور میرے باپ نے یہی بیوقوفی کی تھی اور اپنے انجام کو پہنچا پر میں ہرگز ایسا نہیں کرنے والا تھا۔

میں دو سال تک چپ رہا نہ پاکستان میں کسی سے رابطہ کیا نہ کسی کو اپنے ہونے کا احساس دلایا۔ میں گم ہوگیا تھا۔ میں انتظار کررہا تھا کہ ہر کوئی سب کچھ بھول جائے اور پھر میں نے وہ کیا جس کے لیے میں نے انتظار کیا تھا۔

میں پاکستان واپس گیا اور پیسہ پھینک تماشا دیکھ والا فارمولا اپنایا۔ کیونکہ جو میں سوچ رہا تھا وہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے مجھے مین پاور کی ضرورت تھی۔ میں وہی کچھ سوچ رہا تھا جو انہوں نے میرے گھر والوں کے ساتھ کیا وہی ان کے ساتھ بھی ہو۔

میں نے ہر کام بہت آرام سے کیا کیونکہ جلدی میں غلطی کا امکان زیادہ تھا جو میں بالکل افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے چھ ماہ ایسے لوگوں کو ڈھونڈنے میں لگائے جن کا پیسہ خدا ہوتا ہے۔ ان کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی کس کا سر کاٹنا ہے کس کو مارنا ہے پرواہ ہوتی ہے تو بس اچھی قیمت کی جوان کے دل کو لگے پھر چاہو تو ان سے ان کے باپ کا گلا کٹوا لو۔ ایسے درندے بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ میں نے ایسے درندے ایک نہیں بیس ڈھونڈے تھے اور اپنی عمر بھر کی کمائی اور اپنی مرضی کا پلان ان کے سپرد کردیا اور خود اگلی صبح کا انتظار کرنے لگا تھا۔ وہ رات مجھ پر بہت بھاری گزری تھی۔ بہت سی سوچوں نے مجھے آن گھیرا تھا۔ کبھی سوچتا تھا کہ سب چھوڑ دوں اور واپس چلا جاؤں۔ کبھی سوچتا تھا کہ بدلہ لے کر تمہیں کیا ملے گا بستمہاری انا کو سکون ملے گا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ کبھی سوچ ابھرتی کہ ظالم کے ظلم کو نہ روکنا بھی ظلم ہے جو کچھ ان کے ساتھ ہونے والا ہے وہ اس کے حق دار ہیں۔ تم کچھ بھی غلط نہیں کررہے ہو۔ میری سوچیں بہک رہی تھیں اور ان بہکتی ہوئی سوچوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا جو میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ آخر تنگ آکر میں نے سوچوں کو جھٹکا تھا اور بریف کیس اُٹھایا اور اسی وقت شہر چھوڑ دیا تھا۔ گاڑی پکڑ کر کراچی پہنچا جہاں سے اگلے دن کی فلائٹ سے واپس باہر چلا گیا اور اپنی مدر لینڈ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

میرے واپس آنے کے کچھ دن بعد ماموں کی ای میل موصول ہوئی تھی۔

بیٹا جنہوں نے ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے وہ اپنے انجام کو خود ہی پہنچ گئے ہیں اللہ نے ہمارے ساتھ انصاف کردیا۔ MNA کے بھائی کے ڈیرے میں آگ لگ گئی۔ MNA اور ASI وہاں موجود تھے دونوں نے شراب پی رکھی تھی ان کو آگ لگنے کی خبر بھی نہ ہوئی اور دونوں جل کر کوئلہ ہوگئے اور اسی رات گشت کرتے ہوئے SHO کو کسی نے گولیاں ماردیں۔

میں ماموں کی میل پڑھ کر ہنسا کہ بھولے ماموں کو کیا پتا ''انصاف ہوا نہیں تھا انصاف کیا گیا تھا۔''

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تازہ کار قلم کار کے قلم کی تیسری فسوں خیزی

دیر لگی آنے میں...

وقاص حسین

اُس طوائف کی داستان، جسے اصل محبت تو مل گئی مگر اُس نے اُسے پانے میں بہت دیر کر دی تھی

''شمی وہ ناصر کو لے جا رہے ہیں۔ ایک بار آ کر اس کا چہرہ دیکھ لو۔'' دروازے پر یہ کوئی چوتھی دستک تھی۔ دستک دینے والے کی آواز آنسو بھری تھی لیکن اندر موجود وجود دستک اور آوازوں سے لاتعلق نظر آ رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے کانوں تک کوئی آواز اور دستک پہنچ ہی نہیں رہی۔

ایک بار پھر دستک ہوئی جو پہلے سے زیادہ زور کی تھی۔ ایک بار دیکھ لو وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ اندر گھٹنوں پر سر رکھے وجود کو جھٹکا لگا اور اس نے تھوڑی سی حرکت کی۔

''یہ امی کو کیا ہوا ہے؟ آج رو کیوں رہی ہیں؟ وہ شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ میں کون ہوں۔ وہ بڑبڑائی تھی۔ ہاں..... ہاں..... میں..... میں..... طوائف ہوں۔'' وہ ہنسی تھی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ ''اور طوائف کا کبھی گھر نہیں بستا۔'' وہ بولی تھی۔

☆.....☆

شمی کو کمرے سے نہیں نکلنا تھا سو وہ نہیں نکلی۔ باہر بہت تھی اور اوپر سے بارش نے ہر ایک کو مفلوج کر دیا تھا۔ صحن میں چار بندوں نے چارپائی کندھوں پر اٹھائی اور باہر کی جانب بڑھنے لگے۔ اس چارپائی کے پیچھے دو اور آدمی تھے اب ان کا رخ علاقے کے قبرستان کی طرف تھا۔ اتنے خراب موسم میں جنازہ پڑھنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ سو ایسے ہی دفن کرنا ان کی مجبوری بن گیا تھا۔

بادل بھی آج ایسے برسے تھے کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا تھا اور ابھی تک برس رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی کے غم میں رو رہے ہوں یا کسی کی بے بسی پر رو رہے ہوں۔

☆.....☆

''تم وہاں پر فنکشن نہیں کرو گی آئی سمجھ تم کو۔'' بولنے والا بڑے غصے سے بولا تھا۔

''اپنی آواز کو نیچی رکھ کر بات کرو، یہ مت بھولو تم کھڑے کہاں پر ہو۔ تم کو ایسا ذلیل کروں گی کہ تم آخری سانس تک یاد کرو گے۔'' دوسری طرف لہجہ اس سے بھی زیادہ ترش اور غصے بھرا تھا۔

''ذکیہ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میری برادری میں ٹکے کی عزت نہیں رہے گی، میری ناک کٹ جائے گی۔ میری عزت کا سوال ہے۔'' سامنے والے کا لہجہ دیکھ کر اس کا لہجہ اور تیور نرم پڑ گئے تھے۔

ذکیہ بیگم ہنسی تھی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

''عزت.....!'' اس لفظ کو اس نے کھینچا تھا اور پھر بولی۔ ''تم جیسے کو عزت کا نام لیتے ہوئے ڈوب مرجانا چاہیے۔''

''جس کی اپنی بیٹی کوٹھے پر بیٹھی ہے وہ عزت کی بات

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کر رہا ہے۔''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ اپنی شکل مت دکھانا ورنہ اچھا نہیں ہوگا تمہارے لیے اور یہ مت بھولنا کہ میں وہ ذکیہ نہیں رہی۔'' سامنے والے کی التجا پر بھی ذکیہ بیگم کو ذرا رحم نہیں آیا تھا اور آخر وہ شخص چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ملامت اور بے بسی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

☆.....☆

''مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''تو میں کیا کروں۔ میں نے تمہاری محبت کو چاٹنا ہے۔ ہوگئی ہے تو کرتے رہو میری بلا سے۔'' دوسری طرف سے بڑی بے رحمی دکھائی گئی تھی۔ اور کہنے والا منمنا کر رہ گیا۔

''اوئے نومی اس مجنوں کو کہاں سے لا کر میرے پلے ڈال دیا ہے۔ یہ تو پٹڑی سے ہی اتر گیا ہے۔ آ کے سنبھال اس کو۔''

''بے بی پریشان نہ ہو یہ اس بستی کا لونڈا نہیں ہے بھولے سے اس طرف نکل آیا ہے اس لیے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' نومی نے بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا اور ناصر کا بازو پکڑ کر وہاں سے کھینچتے ہوئے باہر نکل آیا۔

''یار تمہیں پتا بھی ہے تم کیا بکواس کر رہے تھے اور کہاں کر رہے تھے۔'' نومی نے باہر آتے ہی ناصر کو جھاڑ دیا۔

''یار میں بکواس نہیں کر رہا۔ مجھے سچ میں اس سے محبت ہوگئی ہے اور میں اسے پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔'' نومی کو سچ میں جھٹکا لگا تھا ناصر کی بات سن کر۔

ناصر کے تیور دیکھ کر نومی آنے والے وقت سے ڈر گیا تھا۔ کیوں کہ نومی کوٹھے والی سے عشق کا انجام جانتا تھا کہ کیا ہوتا ہے اور اس سے زیادہ وہ اپنے انجام سے ڈر گیا تھا کیونکہ ناصر کو یہ راہ دکھانے والا وہ خود ہی تھا۔ ناصر اس کا کزن تھا اور کوٹھے کی راہ دکھانے میں سارے کا سارا ہاتھ اس کا تھا۔ نومی کو ناصر سے زیادہ اپنے آنے والے کل کی فکر تھی۔ اس لیے ناصر کے تیور دیکھ کر ایک دم سے ٹھنڈا پڑ گیا۔

اور پھر نرم لہجے میں بولا۔ ''یار تو پاگلوں والی بات نہ کر۔ تجھے پتا ہے وہاں جسم کی قیمت لگتی ہے محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ وہاں جذبے کسی کام نہیں آتے۔''

نومی کی بات سن کر ناصر خاموش رہا اور یہ بات نومی کو بہت کھٹک رہی تھی۔

☆.....☆

''چل بیٹی چلیں۔'' ذکیہ بیگم نے ڈانس کرتی بیٹی کو بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا اور نمی اپنی ماں کی اس بات پر حیران رہ گئی تھی کہ یہ اچانک ماں کو کیا ہوگیا ہے۔ اتنی مال دار پارٹی چھوڑ کر جانے کا کہہ رہی ہیں مگر نمی نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی اور چپ چاپ ذکیہ بیگم کے ساتھ چل پڑی۔

وہاں موجود لوگوں کو سمجھ نہیں آئی تھی کہ اچانک ہوا کیا ہے۔ ذکیہ بیگم نے دوسری لڑکیاں وہاں چھوڑ دیں اور خود نمی کو لے کر وہاں سے آ گئی تھی۔ وہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن پھر بھی جیسے تیسے کر کے وہاں سے نکل آئی اور بڑبڑائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہ جسم بیچتی ہوں ابھی ضمیر نہیں بیچا۔

☆……☆

”دیکھ بیٹی یہ جو عزت دار لوگ ہوتے ہیں نا یہ زیادہ دیر عزت دے نہیں پاتے۔ بہت جلد ان کو غیرت کا دورہ پڑ جاتا ہے۔“ ذکیہ بیگم بیٹی کو سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

ناصر کے پے در پے چکروں نے ذکیہ بیگم کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ ابھی تک تو شمی اسے گھاس نہیں ڈال رہی تھی لیکن آخر کب تک۔ وہ جانتی تھی جوانی منہ زور ہوتی ہے کب کس طرف کا رخ کرے اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے وقت سے پہلے بند باندھنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ آج شمی عرف شمع کو سمجھانے بیٹھی تھی۔

”یہ عزت دار معاشرہ مردوں کا ہے اس پر ان کا راج چلتا ہے۔ ان کو اپنی ہزار غلطیاں بھی غلطیاں نہیں لگتیں اور عورت سے ایک غلطی بھی اگر غلطی سے ہو جائے تو یہ معاف نہیں کرتے۔ دیکھ میں کہیں دور نہیں جاؤں گی میری زندگی تیرے سامنے ہے۔ میں نے پہلی بار مرد پر اعتبار کیا گھر سے بھاگی۔ اس نے اپنی راتیں رنگین کیں اور پچیس ہزار میں مجھے اس دوزخ میں جھونک گیا۔ دوسری بار مرد پر اعتبار کیا تو وہ مجھے ہزاروں خواب دکھا کر یہاں سے لے گیا پر عزت دے کر دو مہینے سے زیادہ نہ رکھ سکا۔ جب اس کا جی بھر گیا تو مجھے اپنی زندگی سے ایسے نکال پھینکا جیسے دودھ سے مکھی کو نکال کر پھینکتے ہیں۔ یہ مرد زیادہ تر حسن پرست ہوتے ہیں۔ جب ان کا جی بھر جاتا ہے تو یہ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے کچھ ہفتے پہلے ایک شخص یہاں بھڑک رہا تھا کہ تم فنکشن کرنے نہیں جاؤ گی اور میں نے اس کو بے عزت کر کے نکالا تھا۔“ ذکیہ بیگم نے کچھ ہفتے پہلے والا واقعہ شمی کو یاد دلایا تھا۔ شمی نے ہاں میں گردن ہلا دی تھی۔ ”وہ تھا تمہارا عزت دار باپ اور جس فنکشن سے میں تمہیں کھینچ کر لائی ہوں وہ اسی کے لیے منع کر رہا تھا اور اس فنکشن میں جو سب سے زیادہ تجھے نوچنے کی کوشش کر رہا تھا وہ بھائی تھا تیرا۔“

ذکیہ بیگم نے بہت کم لفظوں میں شمی کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا اور پھر وہ شمی کے پاس سے اٹھ آئی تھی۔

☆……☆

”تم لوگوں کو اگر خود سے اتنی ہی نفرت ہے تو تم لوگ یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔“ ناصر شمی کی باتیں سن کر تھوڑا تلخ ہوا تھا۔

”ہم تو چاہتے ہیں یہ سب چھوڑنا لیکن تمہارا یہ عزت دار معاشرہ ہمیں چھوڑنے نہیں دیتا۔“ ناصر کی بات سن کر شمی کی آواز ایک دم سے بلند ہوگئی تھی۔

”یہ کوٹھے ہم نے تو آباد نہیں کیے یہ تم مردوں کی ہی مہربانیاں ہیں۔ اٹھا لو تاریخ اور مجھے ڈھونڈ کر دکھاؤ وہ عورت جس نے خوشی خوشی یہ کام شروع کیا ہو۔“

”اور تمہیں کیا لگتا ہے یہ کوٹھے ہمارے دم سے آباد ہیں۔ جناب ایسا ہرگز نہیں ہے یہ تم شریف زادوں کی بہنوں اور بیٹیوں کے دم سے آباد ہیں اور دور نہیں جانا میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں میرا باپ اس شہر کا بہت عزت دار انسان ہے اور کوئی غریب نہیں بلکہ کروڑ پتی ہے۔ اگر آج یہ سب شریف زادے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو کوٹھوں سے اٹھا لیں تو سارے کوٹھے ویران ہو جائیں۔ تم مردوں کو تو بس ایک غسل کی ضرورت پڑتی ہے پاک ہونے کے لیے پر ہم عورتیں خود کو کبھی پاک نہیں کر سکتی ہیں چاہے جتنا بھی غسل کر لیں جتنے بھی حج کر لیں۔ تم نے کبھی سنا ہے کوئی عورت خوشی سے کوٹھے پر آئی ہو۔ عورت جب بھی کوٹھے پر آئی تم مردوں کی مہربانی شامل رہی لیکن تم لوگ پھر بھی شریف ٹھہرے اور ہم قصوروار۔ اور تم نے کبھی سنا یا دیکھا ہو کہ کوئی مرد رسوا ہوا ہو اور اس کو زمانے نے ٹھکرا دیا ہو اور وہ کوڑیوں کے دام بک گیا ہو اور وہ دنیا کی نفرت کا نشانہ بنا ہو۔ گناہ میں مرد بھی تو برابر کا شریک ہوتا ہے پھر یہ ذلت اور رسوائیاں ہمیشہ عورت کے حصے میں ہی کیوں آتی ہیں، یہ مرد ہمیشہ کیوں بچ جاتے ہیں۔ مردوں کے پاس موقعے ہی موقعے ہوتے ہیں پر عورت کو کوئی دوسرا موقع نہیں دیا جاتا؟ حالانکہ وہ شکار بھی تم مردوں کا ہی ہوتی ہے۔ ہر گناہ کے بعد تم مرد پارسا بن جاتے ہو یہ پارسائی ہم عورتوں کے حصے میں کیوں نہیں آتی؟ خود گناہوں میں اٹے ہوتے ہیں پر عورت ان کو بالکل پارسا چاہیے۔ تم مردوں کو اپنے گناہ نظر کیوں نہیں آتے۔ یہ اصول ہم عورتوں کے سر ہی کیوں تھوپا گیا ہے تم مردوں پر کیوں لاگو نہیں ہوتا؟“ شمع عرف شمی بول نہیں رہی تھی بلکہ چیخ رہی تھی اور ناصر بت بنا چپ چاپ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جہاں مردوں کے لیے نفرت ہی نفرت بھری ہوئی تھی۔

”اچھا مجھے بتاؤ تم میں کیا انوکھا ہے کہ میں تم پر اعتبار

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کروں۔ تم بھی تو دوسروں کی طرح ہو۔ حسن دیکھ کر مجھ پر فدا ہوئے ہو۔'' شمع کا لہجہ اب بھی تیر برسا رہا تھا۔

ناصر کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر دھیمے سے بولا تھا۔ ''ہاں یہ سچ ہے مجھے محبت تمہارا حسن دیکھ کر ہی ہوئی تھی لیکن اب تو محبت تمہاری روح سے ہوگئی ہے۔ اب مجھے تمہارے حسن و جسم سے کوئی مطلب نہیں رہا۔''

''تمہیں غیرت نہیں آتی ایک کنجری سے عشق لڑاتے ہوئے۔'' شمی نے طنز کا ایک اور وار کیا۔

شمی کی بات سن کر ناصر ہنسا جیسے شمی نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ ''غیرت.....!'' ناصر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''غیرت کس کو کہتے ہیں اور ویسے بھی محبت میں غیرت کا کیا کام۔ اگر محبت میں غیرت آجائے تو محبت کہاں رہتی ہے۔ جن میں غیرت ہوتی ہے وہ محبت نہیں کرتے اگر کرتے بھی ہیں تو ان کی محبت زیادہ عرصہ چل نہیں پاتی۔'' ناصر کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔

ناصر کی بات سن کر شمی مسکرائی۔ ''اچھا.....!'' شمی نے اچھا کو حیرانگی والے انداز میں کھینچا تھا جیسے وہ ناصر کی بات سن کر واقعی بہت حیران ہوئی ہو۔

''اچھا تو مجھے کیا پتا تمہاری غیرت کب جاگ جائے۔ تو تم پھر ایسا کرو اپنی غیرت کا امتحان دے دو اور جب مجھے یقین آجائے گا تو میں تمہاری محبت پر یقین کرلوں گی اور تم کو اپنی محبت کا تحفہ دے دوں گی۔'' شمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟'' ناصر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''بس زیادہ کچھ نہیں نہ ہی کوئی کڑا امتحان لوں گی۔ جاؤ اور میرے گھر کے دروازے پر باہر بیٹھ جاؤ۔ جس دن مجھے تمہاری محبت پر یقین آگیا تم کو اندر بلالوں گی۔'' شمی نے اپنے لہجے کو ہر جذبات سے عاری کرتے ہوئے کہا۔

''بس!'' ناصر نے شمی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بس۔'' شمی نے جواب دیا۔

ناصر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شمی جاتے ہوئے ناصر کو دیکھ رہی تھی جس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ شمی جانتی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، شمی کو یقین تھا وہ کچھ ہی دن میں وہاں سے بھاگ جائے گا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ جڑے رشتے زیادہ دیر اس کو یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ شمی نے کچھ ہی لمحوں میں سارے خیالات کو جھٹک دیا اور اپنے بناؤ سنگھار میں لگ گئی۔

☆.....☆

وقت تھوڑا سا ہی سرکا تھا اور شمی کی بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ ناصر کو اس کے گھر والے لینے آگئے تھے لیکن ناصر تھا کہ جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ بہت سے لوگ آئے کچھ زبردستی اپنے ساتھ لے کر گئے کچھ دن قید میں بھی رکھا لیکن ناصر جیسے ہی آزاد ہوتا شمی کے دروازے پر آن بیٹھتا۔ ایک دو مہینے یہ سلسلہ چلتا رہا لوگ ناصر کو لے جاتے وہ پھر واپس آجاتا۔ آخر تنگ آکر سب نے پیچھے آنا چھوڑ دیا۔ اب ناصر تھا اور شمی کا دروازہ۔

دن، ماہ اور سال گزرنے لگے لیکن ناصر کا انتظار ختم نہ ہوا۔ شمی کی کوئی پکار اس تک نہ پہنچی۔ حالانکہ اب تو شمی کا حسن بھی ڈھلنے لگا تھا۔

شمی ناصر کی ثابت قدمی پر چڑ گئی تھی۔ شمی کو یقین تھا وہ ٹوٹ جائے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ ناصر کی ثابت قدمی کو دیکھ کر اسے اپنا لیتی لیکن ہوا اس کے الٹ۔ سات سال کا عرصہ گزر گیا تھا لیکن ناصر کا حوصلہ اور شمی کی انا نہیں ٹوٹی تھی۔ ایک کو انتظار تھا تو دوسرے کو ضد۔

اور پھر دونوں ہری ہوگئے۔

☆.....☆

دروازہ بڑی زور سے پیٹا گیا تھا۔ ادھ موئی پڑی شمی میں تھوڑی سی حرکت ہوئی تھی اور وہ ماضی کے خیالوں سے ایک دم سے نکلی تھی لیکن اس میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ شمی کچھ بڑبڑائی تھی جس کو کان لگا کر سنا جاسکتا تھا۔

''ناصر تم تو بہت بزدل نکلے بڑی جلدی ہار مان گئے۔ اب تو میں پگھلنے لگی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر غرور آنے لگا تھا۔ تمہاری محبت تمہاری سچائی کا یقین کرنے لگی تھی۔ مجھے فخر ہونے لگا تھا خود پر کہ کوئی مجھے اس قدر چاہتا ہے۔ محبت ایسے بھی ہوتی ہے یقین آنے لگا تھا۔ ناصر تھوڑا انتظار اور..... بس تھوڑا اور..... دروازہ ٹوٹ کر گرا تھا اور چند لوگ بھاگ کر اندر داخل ہوئے تھے اور شمی کا ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا تھا اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئی اور لفظ ''انتظار'' اس کے حلق میں ہی دم توڑ گیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

راکھ کی کہانی

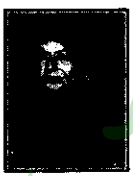

ریحانہ آفتاب

اُن والدین کے لیے تازیانہ، جو کبھی اپنی اولاد کو نہیں سمجھ پاتے

زندگی بہت حسین تھی۔ ہر گھڑی، ہر پل سے اس نے صرف خوشیاں کشید کی تھیں۔ راہوں میں کانٹے بھی جا بجا تھے مگر اس کا حوصلہ غضب کا تھا۔ اس نے کبھی کسی تکلیف کی پروانہ کی تھی۔ اس کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ صد افسوس کہ اس کی پیدائش جاہلوں کے گھر میں ہوگئی تھی۔

ڈگری ہولڈر ہی صرف پڑھا لکھا نہیں ہوتا اور جاہل صرف ان پڑھ نہیں ہوتا۔ افسوس تو اسی کا تھا کہ اس کے والدین جاہل تھے دونوں اعتبار سے۔

بیٹے کی چاہ میں ہر سال بیٹی کی پیدائش میں اس کی ماں کو وہ سب پہلے ہی زہر لگتی تھیں۔ جوان کے شوہر کو ان سے بدظن کر رہی تھیں۔ مار کٹائی، گالم گلوچ روز کا معمول تھا۔ ایسے میں وہ آٹھ بہنیں کونوں میں دبک جاتیں جب گھن گرج کا بادل تھمتا تو سیلاب کے بعد جیسی تباہی کا سامنا ان ننھی جانوں کو کرنا پڑتا۔ ان کے اسکول کی معمولی سی فیس ہر ماہ اس کے باپ کو کھلتی اور وہ کل سے کوئی اسکول نہیں جائے گا۔ کا اعلان کر کے فرعون کی طرح باہر نکل جاتا۔

زمانے بھر کی مظلومیت چہرے پر سجائے اس کی ماں ہانڈی بنانے لگتی اور اس میں اتنی دیر ہو جاتی کہ وہ سب بھوک سے بلبلا کر سو جاتیں۔ آدھی رات کو بھوک کے مارے کسی کی بھی آنکھ کھلتی تو خالی پتیلی اور چنگیری ان کا منہ چڑاتی۔ اس کی ماں اپنے شوہر کو رام کر کے خود بھی کھا کر سو جاتی۔ اسے بھی بیٹیوں سے محبت نہیں تھی اگر ہوتی تو بیٹے کی چاہ میں انہیں پیدا کر کے تماشا نہ بناتی۔

اس کی ساری بہنیں تھوڑی بے حس تھیں۔ سب ماں، باپ پر گئی تھیں۔ سب تھیں بھی چٹی دودھ سے بنی ہوئی۔ علاوہ اس کے جسے کم عمری سے سوچیں دان میں ملی تھیں۔ جو ہر گھڑی اپنی ماں کو دنیا کی عظیم عورت گردانتی تھی۔ جو اس کے فرعون باپ کے ساتھ نبھا رہی تھی۔ ماں کے جسم پر نیل دیکھ کر اسے اپنا باپ دنیا کا گھٹیا انسان لگتا۔

اس کی ایک ہی لگن تھی پڑھنے کی۔ ہر ماہ فیس دیتے جب باپ کی عدالت میں حاضر ہوتی اور وہ اسے سخت نظروں سے گھورتے تو اس کا دل چاہتا زمین میں گڑھ جائے۔ سگنل پر کھڑی ہو کر بھیک مانگنے مگر اس لمحے یہاں سے غائب ہو جائے۔

''مت ہٹائیں اسے اسکول سے۔ سب میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس کا ذہن اچھا ہے پڑھائی میں اور پھر آپ کو بھی اپنے کاروبار اور پراپرٹی کے کام کے لیے کسی پڑھے لکھے کی ضرورت پڑتی ہے نا۔ گھر کی بچی ہے۔ آپ کی ناک اونچی ہوگی۔'' اس کی ماں خوشامدی انداز میں بولتی اور اس کا باپ احسان جتانے والے انداز میں۔

''اچھا پڑھنا ہے تو پڑھ لے، کرلے شوق پورا۔ میرے کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تیر مارے گی۔'' نیزے اس کے ننھے وجود میں چبھو کر سالن میں انگلیاں لتھڑ کر اس کا باپ نخوت سے کہتا اور وہ جو سانس روکے کھڑی ہوئی تھی۔ ماں کا اشارہ پاتے ہی سامنے سے ہٹ جاتی۔

ماں اس کی نظر میں اور اچھی ہو جاتی اور وہ انہیں خوش کرنے کو ان کا بھرپور ہاتھ بٹاتی۔ اسکول جانے سے پہلے ان کے کئی کام کر دیتی۔ ٹھٹھرتی سردیوں میں یخ پانی سے کپڑے دھونے بیٹھ جاتی کہ اس کی ماں کو آرام ملے گا۔ بارہ سال کی عمر میں خستہ پراٹھے بنا بنا کر بہنوں کو ناشتا کراتی۔ اس گھر داری کے کئی نشان اس کے ہاتھوں پر اپنے نشان ثبت کر چکے تھے اور ماں جب ہانڈی روٹی کرتی تھی تو پتا نہیں کیا بات ہوتی تھی کہ برکت نہیں رہی تھی کہ برکت نہیں رہتی تھی۔ سب کو آدھا پیٹ کھانا ملتا تھا۔ اس کی ماں شوہر کے لیے الگ ہانڈی بنا کر رکھتی تھی اور رات کے لیے دال سبزی کم مقدار میں چھوڑتی تھی جو پورا نہیں پڑتا تھا۔ تب اسے ان باتوں کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے ماں ایسی ہستی تھی جو شک تو دور جس پر آنکھ نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔

وقت گزرتا رہا وہ گریجویشن میں آگئی تب ہی بہت تعویذوں مزاروں کے چکر لگا کر اس کے گھر بھائی ہوا۔ باپ کو وارث مل گیا اور ماں کی توجہ اور کم ہوگئی۔ وہ بھی میاں کے گھٹنوں سے جڑی رہنے لگیں۔ بڑی بہنیں خائف تھیں کہ انہیں بوڑھی کر رہی ہیں اور خود بچے پیدا کر رہی ہیں۔

اس کی بہنیں حسین تھیں مگر نک چڑھی بدتمیز اور سلیقہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طریقہ سے واسطہ نہ تھا۔ اس لیے جب گلی محلوں سے ہر رشتہ اس کے لیے آتا تو بہنیں جل جل جاتیں۔

''ہاں ہم حسین و جمیل بیٹھی ہیں اور کوئلے سے بنی کا آتا ہے۔ چلایا ہوگا چکر۔ کالج کے بہانے گھر سے نکلتی ہے جانے کیا کیا کرتی ہے باہر جا کے۔''

بڑی بہن دل کے پھپھولے پھوڑتی اور وہ سر جھٹک کر اپنی پڑھائی میں لگ جاتی۔ اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے بہت بڑی قربانی دے رہی تھی وہ۔ معمولی سے اسکول میں تعلیم دلا کر اور ایک واجبی سے کالج میں داخلہ دلا کر اس کا باپ اس سے بدگمان ہو رہا تھا کہ وہ فر فر انگریزی میں اس کے ہر مسئلے کا حل نکال لے گی۔

پراپرٹی کے گورنمنٹ پیپرز آئے دن اس کا باپ اٹھا کر لے آتا اور کند ذہنی کا مظاہرہ کر کے کہتا کہ اسے وہ اردو میں ترجمہ کر کے سنائے۔

وہ جس نے آنکھ کھلتے ہی باپ کے ڈر کو محسوس کیا ہو اس کے آگے بیٹھ کر سارا پڑھا لکھا بھول جاتی اور اس پر وہ۔

''حرام کی فیس بھر رہا ہوں۔ کیا پڑھنے جاتی ہے۔ دفع ہو جا۔'' وہ جو ہمتیں اکٹھے کر رہی ہوتی تھی اس پھٹکار پر آنسو بہاتی اٹھ جاتی۔ اوپر سے بہنوں کی کھی کھی پر ڈوب مرنے کو دل چاہتا۔

خاندان میں اس کی بہنوں سے چھوٹی لڑکیاں ماں بننے لگیں اور بڑے بوڑھوں نے احساس دلایا تو اس کے باپ کو بھی ہوش آیا۔ اپنی ہی طرح کے جاہل ڈھونڈ کر بیٹیوں کو وداع کرنے لگا۔ اس پر بھی شادی کے خرچے کو لے کر کہرام برپا ہوتا۔ دنیا دکھاوے کو جہیز دے کر واہ واہ کرنے والا اس کا باپ سارا غصہ ان پر نکالتا۔ اللہ بہت دے رہا تھا مگر اس کے باپ کو روپوں کی ہوس کھا رہی تھی۔

اپنی عیاشیوں پر لاکھوں اڑاتا۔ اس کی ماں بھی ہر وقت سونا خریدتی رہتی۔ نئے جوڑے پہن کر اٹھلا کر شوہر کو رام کرتی رہتی مگر نجانے کیوں اس کے باپ کے دل میں گھر نہ کر سکی تھی۔ آئے دن گالیاں کھاتی اور پٹتی رہتی۔ ایک دن ماں کو بچانے پر جب اس کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی تو اس کی روح میں زہر اتر گیا۔

''آپ میرے ساتھ چلیں، ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔ آئے دن آپ کو مار پڑتی ہے۔ میں کماؤں گی کل کو سفیر بھی بڑا ہو جائے گا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس ذلت بھری زندگی سے موت اچھی ہے۔ صبح آپ بس تیار رہیے گا۔''

مکا اس کی آنکھ پر پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی آنکھ بند ہوگئی تھی۔ وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ گھر کے حالات پر کئی بار اس کا خودکشی کا ارادہ ہوا مگر وہ مثبت سوچ کی حامل تھی۔ خود کو بہلا کر برائی میں اچھائی دیکھتی تھی۔ اس کی ماں نے بھی جی بھر کر شوہر کو گالیاں دیں اور صبح گھر چھوڑنے کی حامی بھر لی۔ رات کے کسی پہر تکلیف سے اس کی آنکھ کھلی تو ماں کو اپنے پہلو میں ناپا کر اس کا دل حلق میں آ گیا۔

''ابا نے اماں کو مار تو نہیں دیا۔'' وہ ہڑبڑا کے اٹھی۔ زوردار دھماکہ ہوا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے بھائی کو لے کر اس کے باپ کے ساتھ مزے سے سو رہی تھی۔ اندر بہت زور سے کچھ ٹوٹا تھا۔ کیا ہے؟ کیا تھا یہ؟ وہ سمجھ نہ سکی لیکن اس کے اندر ایک جنگ چھڑ گئی تھی۔

اس کی دوست کے کزن نے اسے دیکھا تھا اور اس کے لیے رشتہ بھیجا تھا۔ اچھے لوگ تھے۔ جانے کیوں اسے لگا اس کی ماں اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔

مہینوں جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ دوبارہ آئے اب کے انہوں نے اس کے والد کے عزیز دوست سے رابطہ کیا تھا۔ جن کے سمجھانے پر اس کا رشتہ طے ہوگیا۔

''گھنی ہے کلموہی، دوست کے گھر جاتی تھی۔ پڑھائی کے بہانے چلایا ہوگا چکر۔ میں نے تو تمہارے ابا کو ہوا نہیں لگنے دی کہ اس کی دوست کا کزن ہے ورنہ کاٹ کے پھینک دے گا تمہارا باپ اسے۔ کرے خود کل کو کچھ ہوا تو منہ تھوڑا ہوگا بولنے کا کہ خود اپنی پسند سے کر رہی ہے۔'' اس کی ماں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

الفاظ تھے وہ اپنی شادی شدہ بیٹی سے یہ سب کہہ رہی تھیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ یہ اس کی سہیلی نے چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔ یہ اس کی ماں کے الفاظ تھے۔ وہ شاکڈ تھی۔ وہ حلف اٹھا کر کہہ رہی تھی کہ اسے اس معاملے کی خبر نہیں تھی۔

ایک بار اس کی سہیلی نے چھیڑتے ہوئے کہا تھا اس کا کہ اس کا کزن اسے پسند کرتا ہے۔

''میرے ابا کو یہ بات پتا چلی تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔ آئندہ یہ ذکر نہ کرنا مجھ سے۔''

سختی سے تنبیہہ کر کے اس نے سہیلی کے گھر بھی جانا بند کر دیا کہ وہ کسی اسکینڈل کو افورڈ نہیں کر سکتی تھی اور اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی ماں سے بات کرتی۔

گریجویشن میں اس کی فرسٹ پوزیشن آئی تھی۔ اس کے باپ نے خاندان اور دوست احباب میں مٹھائی بانٹی کہ اس کی بیٹی نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔''

''دو نمبر سے فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔ بہت زیادہ نمبر لے کر تیر نہیں مارا تو نے!'' باپ نے اس کے منہ پر اخبار پھینک کر کہا تھا لیکن وہ ان کی نفسیات جاننے لگی تھی۔ نیچا دکھانا اور اپنے آگے ہر کسی کو دو کوڑی کا سمجھنا ان کی فطرت تھی۔

شاذل کے گھر سے اس کے لیے بہت سارے سوٹ مٹھائی اور کیک آیا تھا۔ جنہیں کھاتے ہوئے اس کی ماں دنیا زمانے کے نقص نکال رہی تھی۔ وہ دن بھی آیا جب اس کی ڈولی اٹھی تھی۔

دو ماہ پہلے ہی اس کی ماں نے اس سے بات چیت بند کر دی تھی اور تمام بہنوں اور بھائی کو بھی اس کے پاس جانے سے منع کر دیا تھا۔

''اماں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ ان کے رویے سے حقیقتاً دکھی تھی۔ تب ہی مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی صفائی دے رہی تھی۔

''مجھے زیادہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں۔ میری ہی غلطی تھی جو تمہیں پڑھایا لکھایا۔ تمہارا باپ صحیح کہتا تھا جاہل رکھ اسے بھی۔ ہر ہنر سکھا کر غلطی کی۔ میری حسین بیٹیاں غریب گھرانوں میں جل رہی ہیں اور تو نہ شکل نہ روپ پھر تجھے کیسے مل گیا اتنا خوب صورت گھرانا اور امیر لڑکا۔ چلایا ہوگا چکر، اڑائے ہوں گے چھرے دوست کے گھر پڑھنے جانے کے بہانے۔''

ماں پگھلا ہوا سیسہ اس کے وجود پر انڈیل رہی تھی۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنی ماں کے منہ سے نکلنے والے بدصورت لفظوں سے اپنی خالی جھولی بھر رہی تھی۔

زبان شدت کرب سے گنگ ہوگئی تھی۔ ٹھاٹھیں مارتا درد کا سمندر تھا۔ جس کی بے رحم لہروں کے پروں پر اس کا وجود ڈوب رہا تھا۔ اسے عشق تھا۔ اسے کسی سے شدید محبت تھی تو اس کی ماں سے..... وہ ماں جس کے لیے اس اپنے باپ کو کتنی بددعائیں دی تھیں۔

جس کے لیے اس نے ننھے ہاتھوں سے سردی، گرمی کی پروا کیے بغیر ہزاروں کام کیے تھے۔

وہ جس نے بچپن میں بڑھاپے کا سفر کر لیا تھا۔ جس نے جوانی کی دستک سنی ہی نہیں تھی۔ اس پر اتنے گھناؤنے الزامات۔

غیر برا کرتا ہے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جب خونی رشتے درد دیں تو کوئی کیا کرے؟

ماں جس کے پیروں تلے جنت ہے، جسے اف تک نہیں کرنے کی اجازت۔ جب وہ اپنی ہی اولاد کی دھجیاں اڑائے تو کوئی کیا کرے؟ آئے دن باپ نے بچوں کو مار دیا۔ دریا میں بہا دیا۔ ایسی نیوز سن کر اسے لگتا تھا سب جھوٹ ہے۔ ماں باپ ایسا تھوڑا کرتے ہیں لیکن اب وہ بت بن گئی تھی۔

ساری عمر جن اپنوں پر جان مارتی رہی، چھوٹی بہنوں کو شعور سکھاتی رہی، وہ بدتمیزی کر جاتیں۔ بڑی بہنیں نیچا دکھاتیں۔ باپ نے ہر طرح انا، وقار کو کچل دیا اور اب ماں.....! کیا کمایا تھا اس نے زیست کے کشکول سے؟

فقط راکھ کی کمائی اس کے ہاتھ آئی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شہرِ عروس البلاد سے دوسرا توشہ

بند کواڑوں کے پیچھے

ریحانہ آفتاب

معاشرے کے اعلیٰ طبقے اکثر اسی قسم کی پریشانی کا شکار رہتے ہیں

''انوشا میم بس کریں۔'' اسے گلاس پہ گلاس وائن کا اپنے اندر انڈیلتے دیکھ کر برسوں سے ساتھ رہتی نینی نے گھبرا کر اسے روکا۔

''Go to hell۔'' انوشا نے ناگواری سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

نینی نے مہمانوں سے بھرے ہوٹل کو دیکھا اور چپکے سے کھسک گئی۔ وہ انوشا کی مزاج آشنا تھی اگر وہ مزید روکتی تو کچھ بعید نہ تھا انوشا اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیتی۔

انوشا کی نگاہ کا مرکز بلیک سوٹنگ میں ملبوس گریس فل سے سفیان زید اور ان کے بازو میں بازو ڈالے شیفون کی ریڈ ساڑی میں ملبوس ماہ نور کپڑے کے ٹکڑے کو اسٹائل سے پیٹھ پر لا کر ڈائمنڈ کا بروچ لگا کر بلاؤز کی کمی پوری کی گئی تھی۔ فیشن میں ماہ نور نے بھارتی فلموں کی ہیروئنز کو بھی مات دے رکھی تھی۔

حسین و جمیل ماہ نور، سفیان زید کے ساتھ لگی ہر مہمان سے مل کر مترنم ہنسی سے فضا کو منور کر رہی تھی۔ سفیان زید کے چہرے پر بھی بشاشت تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ پورے پاکستان میں پھیلے ان کے فائیو اسٹار ہوٹلز میں ایک اور ہوٹل کا اضافہ ہوا تھا۔ اس نئے ہوٹل کی افتتاح کچھ دیر پہلے ماہ نور نے ربن کاٹ کر کی تھی۔

ماہ نور اور سفیان نے بہت دھواں دھار عشق کر کے شادی کی تھی اور اس میں کوئی شک نہ تھا ان کی محبت آج بھی جوان تھی۔ شادی کی سالگرہ دھوم دھام سے مناتے تھے۔ وہ ماہ نور کو اپنا لکی چارم مانتے تھے۔ بیس سالہ رفاقت کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے روز اول کی طرح محبت کرتے تھے۔

جہاں سفیان زید کے ہر شہر میں دو دو فائیو اسٹار ہوٹلز چل رہے تھے اور دن بہ دن ان کے بینک بیلنس میں اضافہ ہو رہا تھا وہیں ماہ نور بھی ان سے پیچھے نہ تھیں۔ لاسٹ ایئر ہی وہ بیسٹ فیشن ڈیزائنر کا ایوارڈ جیت چکی تھیں۔ ان کے ہر شہر میں آؤٹ لیٹ تھے۔ کئی بیوٹی سلون چل رہے تھے۔ وہ اسکن اسپیشلسٹ بھی تھیں۔ آج کل وہ اپنا کاسمیٹکس برانڈ کو متعارف کروانے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

پیسا جیسے ان دونوں کے گھر کی دھول تھا۔

''انوشا یہ تم کیا کر رہی ہو؟'' دونوں مہمانوں سے ملتے جلتے بار کاؤنٹر تک آ چکے تھے۔ جہاں جینز پہ شرٹ کے اوپر جیکٹ پہنے انوشا وائن سے پیاس بجھا رہی تھی۔ بہت ادا سے مسکرا کر ادھر اُدھر نظر دوڑا کر ماہ نور دھیمی آواز سے غرائی تھیں۔

''Wine پی رہی ہوں!'' کمال بے نیازی سے گلاس لہرا کر اس نے جواب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''وہ تو ہمیں بھی نظر آرہا ہے مگر اتنا کیوں پی رہی ہو؟''

''ماہ نور کا لہجہ اور انداز دونوں برقرار تھا۔

''باپ کا مال جو ہے۔'' استہزائیہ جواب پر ماہ نور کے ماتھے پر بل پڑ گئے مگر انہوں نے پلک جھپکتے خود کو کمپوز کیا۔

''سفیان! آپ اس سر پھری کو سمجھائیں میں مسز وہاب سے مل کر آتی ہوں۔''

''اچھی طرح ڈیل کر لینا میں اسلام آباد میں ایک اور ہوٹل کھولنا چاہ رہا ہوں۔'' سفیان زید نے کہا تو انوشا کو گھورتی ماہ نور مسکرا کر ساڑی کا آنچل سنبھالتی گنجے سے شخص کی طرف بڑھ گئیں۔ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں اپنا ہوم ورک اچھی طرح سے آتا تھا۔

''یہ کیا بچپنا ہے انوشا، تمہیں میری اور اپنی ممی کی عزت کا ذرا بھی احساس ہے؟ چھوڑو گلاس۔'' سفیان زید نے غرا کے گلاس اس کے منہ سے لے کر رکھا۔

''او کے!'' انوشا نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

''نینی!'' سفیان نے قدرے دور کھڑی نینی کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نینی بھاگ کر آئی۔

''خیال رکھیں، اس اسٹوپڈ لڑکی کا۔ اب اسے بالکل پینے نہیں دیجیے گا۔'' سفیان زید نینی کو ہدایت کر رہے تھے۔

''جی سر!'' نینی نے سر ہلایا۔

''اگر اسے اکیلا چھوڑا تو سالوں کا حساب میں آج ہی کر کے آپ کو نکال باہر کروں گا۔'' سفیان زید اسے گھورتے ہوئے مہمانوں کے پاس چلے گئے۔

''اسی لیے منع کر رہی تھی نا۔ بلاوجہ مجھے بھی باتیں سنوا دیں۔'' نینی نے ناگواری سے کہا۔

''ذلت سہنا تو تمہاری عادت بن گئی ہے اگر تم میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو تم یہ نوکری کب کا چھوڑ کر جا چکی ہوتیں۔ پے بہت اچھی ہے نا تمہاری اس لیے ننگی ہوئی ہو اور عیش بھی کرتی ہو۔ کھانے، پینے سونے کسی چیز کی روک ٹوک جو نہیں ہے تم پہ۔ تم کھانے، پینے اور سونے ہی تو آئی تھیں ہمارے گھر۔''

اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے انوشا نے لفظ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چبا چبا کر۔ اس کے تیور سے ڈر کر نینی دو قدم پیچھے ہٹی۔ انوشا نفرت سے جھٹک کر آرکسٹرا کی طرف بڑھ گئی۔

''انوشا بے بی!'' نینی بے بسی سے آوازیں دیتی رہ گئی۔

''Good Evening Every One!''

ڈی جے کو اشارہ کرتی وہ مائیک تھام کر سب کو مخاطب کر چکی تھی۔ ماہ نور نے خوفزدہ نگاہوں سے سفیان زید کی طرف دیکھا۔ ان کے ماتھے پر بھی پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ انہوں نے نینی پر غضب ناک نظر ڈالی۔

it is very boring party, I want to change this mood, come and join me! music!

ہال میں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر اس نے آخر میں ڈی جے کو اشارہ کیا تھا۔ اگلے لمحے فلک شگاف میوزک کا شور گونجنے لگا۔ انوشا ماہر رقاصہ کی طرح بدمست ہو کر رقص کرنے لگی تھی۔ کچھ من چلے جن میں زیادہ تر ادھیڑ عمر کے ٹھرکی سفیان زید کے دوست تھے وہ بھی شریک ہونے لگے۔

انوشا نے جیکٹ اتار کر ہوا میں لہرا کے نیچے پھینکا تو سفیان زید مٹھیاں بھینچ کے رہ گئے۔

''ایزی! یہاں کوئی تماشا نہ کرنا۔'' ماہ نور نے ان کا ہاتھ دبا کر کہا۔

☆.....☆

تقریب کا سارا مزا کرکرا ہو چکا تھا۔ ماہ نور اور سفیان کی برسوں کی پریکٹس کام آئی تھی جو وہ ضبط کیے رہے۔ ماہ نور نے جلدی کھانا لگوا دیا تھا۔ مہمان جانے لگے تو سب کو بائے کر کے وہ چاروں بھی گھر کی طرف سفر کرنے لگے۔

ماہ نور اور سفیان کی خاموشی سے نینی کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔ البتہ جو فساد کی جڑ تھی وہ کھڑکی سے باہر کا منظر اتنی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جیسے اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہ ہو۔

عالیشان بنگلے کے پارکنگ ایریا میں ڈرائیور نے گاڑی روکی تو سفیان نے سختی سے انوشا کا ہاتھ پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر نکالا۔

''سفیان آرام سے!'' سفیان اسے کھینچ کر لاؤنج میں لے آئے تھے۔ بائی ہیل میں تیز تیز چلتی ماہ نور پیچھے رہ گئی تھیں۔

''جاؤ دیکھو، صاحب بہت غصے میں ہیں۔'' ماہ نور نے نینی کو دوڑایا۔ سفیان نے کھینچ کر جیسے اسے لاؤنج میں پھینک سا دیا تھا۔ دھان پان سی انوشا لہرا کر گرنے لگی تھی۔ صوفہ پکڑ کر اس نے اپنا توازن برقرار رکھا۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔'' سفیان چیخ رہے تھے۔

نینی کونے میں خاموش کھڑی تھی۔ ماہ نور بھی آ چکی تھیں اور اب اپنی تیز چلتی سانس پر قابو پا رہی تھیں۔

''ہم نے دوسری اولاد نہیں کی کہ تمہاری حق تلفی نہ ہو اور تم ہمیں یہ صلہ دے رہی ہو۔ اتنے ناز نخرے اٹھائے جاتے ہیں تمہارے۔ جس چیز پر انگلی رکھتی ہو وہ تمہاری ہو جاتی ہے۔ سرحد، ملک کسی چیز کی قید نہیں ہے پھر کس بات کی سزا دے رہی ہو ہمیں۔'' سفیان آگ بگولا ہو رہے تھے۔

''بہت اچھا ہے جو میں آپ لوگوں کی اکلوتی اولاد ہوں اگر آپ کی دوسری تیسری اولاد ہوتی تو میں خود اسے جان سے مار دیتی۔'' انوشا کے سفاک لہجے پر سب اپنی جگہ ٹھٹک گئے تھے۔

''تم حواسوں میں تو ہو؟ سفیان اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائیں۔ مجھے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' ماہ نور نے فکرمندی سے سفیان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اوشٹ اپ!'' انوشا اتنے زور سے دھاڑی کہ ماہ نور سہم کر سفیان سے چپک گئیں۔

''زیادہ بکواس کی تو چمڑی ادھیڑ دوں گا۔'' سفیان آگے بڑھے۔ ماہ نور نے انہیں تھام کر مزید بڑھنے سے روکا۔

''چھوڑیں آپ انہیں۔'' انوشا تن کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ماہ نور کو نفرت سے دیکھنے لگی۔ اب اس کا رخ سفیان کی طرف تھا۔

''ادھیڑیں چمڑی، اسی طرح ادھیڑیں گے نا جیسے بچپن میں ادھیڑتے تھے۔ جلتی سگریٹ میری کمر پر بجھائیں گے نا، بجھائیں۔ اب میں آٹھ نو سالہ بچہ نہیں ہوں جو آپ لوگوں کی ہر زیادتی سہوں گی۔ اٹھارہ سالہ بالغ لڑکی ہوں۔ ارسٹ کروا کر میڈیا کو بلا کر آپ دونوں کا تماشا لگاؤں گی۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو! ہم سگے ماں باپ ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہارے۔'' ماہ نور نے جیسے یاد دلایا۔ انوشا ہنسی۔ ''سگے ماں باپ!'' پھر اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ پتا ہی نہ چلا کب ہنسی کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بہنے لگی تھیں۔

''ایسے ہوتے ہیں سگے ماں باپ!'' اس نے دونوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ دونوں اس کی حالت پر ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے۔

''آپ دونوں کو پیسہ کمانے، کئی پارٹی، ہوٹلز، سلون، آؤٹ لیٹ کی اوپننگ کرتے یہ خیال کبھی کیوں نہ آیا کہ پیچھے آپ کے بنائے سونے کے محل میں آپ دونوں کی اکلوتی اولاد نینی کے رحم وکرم پر ہے۔ اسے ماں باپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے پیار احساس کی ضرورت ہے۔''

''کیا ہم اپنی مصروفیات چھوڑ کر مڈل کلاس والدین بن جاتے۔'' ماہ نور کو اختلاف ہوا۔

''اپر کلاس میں یہی سسٹم ہے۔''

''بھاڑ میں جائے ایسی کلاس، جس میں محبت، احساس، کیئر نہ ہو۔ آگ لگے ایسے پیسے کو جس کی کھنک سے کسی معصوم کی چیخیں دب جائیں۔ آپ لوگوں نے بہت کمایا..... لوگ آپ دونوں پر رشک کرتے ہیں آئیڈیل مانتے ہیں مگر میری نظر میں آپ دونوں لوزر ہیں دنیا کے سب سے بڑے لوزرز۔

''کیا کمی رہنے دی ہم نے جو تم یوں ہمارا تماشا لگا رہی ہو۔'' سفیان نے غصہ کنٹرول کیا۔

''کمی..... کمی پوچھتے ہیں آپ؟ جب آپ اور آپ کی حسین مسزان رنگین پارٹیز کا حصہ ہوتے تھے تو یہ آپ کی سوکالڈ نینی حلق تک ٹھونس کر گھوڑے گدھے بیچ کر سو جاتی تھی۔

گرم دوپہروں اور تاریک راتوں میں آپ کی چھ سات سالہ بچی ڈرائیور اور نوکروں کے رحم وکرم پر ہوتی تھی۔ آپ لوگ وہاں گلاس سے گلاس ٹکراتے تھے اور یہاں میری معصومیت بند دروازے کے پیچھے تار تار ہوتی تھی۔ اک بار نہیں بار بار۔''

سفیان لڑکھڑا کر صوفے سے گر سے گئے تھے۔ ماہ نور پھٹی پھٹی آنکھوں سے انوشا کو دیکھ رہی تھیں۔ نینی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

''کمی پوچھتے ہیں آپ لوگ۔ ایک بچے سے اس کی معصومیت چھین لی جائے۔ وقت سے پہلے آگاہی مل جائے یہ کسی عذاب سے کم ہے؟ میرا یہ نقصان کبھی بھر پائیں گے آپ لوگ۔''

انوشا دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

''تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں۔'' ماہ نور نے ڈوبی آواز سے کہا۔

''کیا بتاتی۔ چھ سات سالہ بچی جو اپنے والدین کی عدم توجہی کا شکار ہو اس میں ہوتی ہے اتنی ہمت؟ ذرا اور بڑی ہوئی تو مزاحمت پر مجھے تیز دھار کی چھری سے ڈرایا جاتا۔ سگریٹ کے ٹوٹے میری کمر پر بجھنے لگے مگر آپ دونوں کو کبھی وہ نشان میری کمر پر نظر نہیں آئے۔ آتے بھی تو شاید آپ میں اپنے اور دوسرے کے نشان میں تمیز کرنے کی استطاعت نہ ہوتی۔''

ماہ نور اور سفیان کی نظر جھک گئی تھی۔ پارٹی میں جوان کپل لگنے والے یکدم بوڑھے لگنے لگے تھے۔

''میں آپ دونوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں کل آسٹریلیا جا رہی ہوں۔ میں نے اپنی ساری تیاری کر لی ہے۔'' انوشا نے جیسے دھماکا کیا۔

''اتنی دور..... اکیلی کیسے رہو گی۔ آسٹریلیا میں تو ہمارا کوئی عزیز بھی نہیں رہتا۔ تم نانو کے پاس امریکا چلی جاؤ۔'' ماہ نور نے بمشکل کہا۔

''یہاں بھی اٹھارہ سال سے اکیلی ہی رہ رہی ہوں۔'' انوشا تلخی سے ہنسی۔ ماہ نور نے نظریں چرا لیں۔

''بے فکر رہیں مجھے اپنی حفاظت کرنا آ گیا ہے اور اب میرے پاس ہے ہی کیا جس کی فکر مجھے ستائے گی۔'' انوشا کا گلا رندھ گیا تھا۔ لہجے میں کانچ کی کرچیاں تھیں۔ دونوں اپنی جگہ ساکت تھے۔ نینی کب کی چلی گئی تھی۔ انوشا نے دونوں کے ہارے ہوئے چہرے کو دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ''کیا بچے مارنے، پیٹنے، گالیاں دینے، گھر کا سودا سلف لانے یا نینی کے ہاتھوں پلوانے کے لیے دنیا میں لائے جاتے ہیں؟ بچوں کے حقوق، توجہ، محبت، تحفظ اس کا احساس کوئی کرے گا؟ جو بچے مر جاتے ہیں کھو جاتے ہیں ان پر شاید صبر آ جائے مگر جو بچہ اپنی چار دیواری میں بند کواڑ کے پیچھے لٹ جائے وہ کیا کرے؟''

آنکھیں رگڑتے انوشا اپنی باتی کی پیکنگ کر رہی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور میں ہار گیا

ریحانہ آفتاب

اُس شخص کی داستان، جو پیسے کے بل بوتے پر ہر رشتے کو قربان کرتا چلا گیا اور.....

''جگر آفندی کی ڈکشنری میں پیار اور ہار نہیں ہیں میم میرا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ میری جان چھوڑیں اور جا کے کوئی اور در کھٹکھٹائیں۔'' اس کا انداز کیسا تھا جیسے اس کے سامنے ویل ایجوکیٹڈ اور بے حد حسین لڑکی نہیں سگنل پر کھڑی کوئی بھکارن ہو۔

''چند دن ساتھ گھومنے پھرنے پر آپ نے اتنی توقعات مجھ سے پال لیں کہ میں آپ سے شادی کروں گا۔ کس سیارے کی مخلوق ہیں آپ؟'' حد درجہ استہزائیہ انداز تھا۔ پھر نیہا وقاص ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ شاکڈ بیٹھی تھی۔ وہ جس نے ہمیشہ ہر کسی کو اپنے لیے آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ آج اسی کو ایک ابن آدم حقیر شے گردان رہا تھا۔

''تم میری طرف خود بڑھے تھے جگر آفندی۔'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

تو میں نے کب آپ سے کوئی قسمیں، وعدے کیے تھے۔ کیا جونک کی طرح چپک گئی ہیں۔ چند دن آپ کے بھی خوشگوار ہو گئے اور میرے بھی۔ جائیں اب جان چھوڑیں۔'' سوفٹ ڈرنک سے بھرا گلاس میز پر گھماتے زمانے بھر کی بے زاری اس کے لہجے میں آ گئی تھی۔

''آج مجھے میرے کیے سزا مل رہی ہے۔ میں نے اسی طرح ہزاروں لڑکوں کو ذلیل کیا ہے جگر صاحب اور آج مجھے ان میں سے کسی کی بد دعا لگ گئی۔'' وہ بہت بوجھل دل و لہجے گویا تھی۔

''مکافات عمل..... اسٹاپ اٹ پلیز! جسٹ گو ٹو ہیل!'' گرے والٹ سے ہزار کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ نیہا وقاص ہزار کے نوٹ کو ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے یہ ڈرنک کے پیسے نہیں۔ وہ اس کی قیمت ادا کر کے گیا ہے۔

☆.....☆

''تم نے نیہا کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔'' وہ لائبریری میں تھا۔ جب شیراز نے ساتھ والی کرسی سنبھالتے اس سے استفسار کیا۔ اس کے منہ کا زاویہ پل میں بگڑ گیا۔

''وہاٹ دا ہیل از دس یار، ایسی کیا توپ چیز تھی وہ جو ہر کوئی مجھ سے اس طرح استفسار کر رہا ہے۔'' وہ چڑ کر کہتے اسے گھورنے لگا۔ صبح سے ان کے گروپ کا ہر ممبر اس ایشو پر بات کر چکا تھا۔

''ہم سب کو لگا تھا کہ نیہا کے بعد تمہاری لائف میں اور کوئی نہیں آئے گا سو.....''

''کیوں ایسی کون سی حور شمائل ہے وہ.....'' وہ جیسے توے پر جا بیٹھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

''اب تم زیادتی کر رہے ہو بے چاری کے ساتھ۔ پوری یونیورسٹی میں اس سے حسین لڑکی نہیں ہے، کم از کم میں نے اپنی اب تک کی لائف میں نہیں دیکھی۔'' شیراز سو فیصد سچ کہہ رہا تھا۔

''تم نے دنیا میں ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔'' اس کا انداز استہزائیہ سے بھرپور تھا۔ وہ اسے گھورنے لگا۔

''Now leave this topic!'' چلو کینٹین چلتے ہیں۔'' شیراز اس کے نارمل انداز پر تاسف سے اسے دیکھ کے رہ گیا۔ ایک لڑکی اس کے پیچھے لیلیٰ بنی بیٹھی تھی اور اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

جگر آفندی والدین کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ اس کا شمار منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والوں میں ہوتا تھا۔ کانونٹ کی تعلیم سے فارغ ہو کر والدین نے اسے ہائر اسٹڈی کے لیے لندن بھیج دیا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ والد بیوروکریٹ تھے۔ منہ سے فرمائش نکالنے سے پہلے پوری ہو جاتی تھی۔ پھر اللہ نے شکل و صورت اور وجاہت بھی کوٹ کوٹ کر دی تھی۔ لڑکیاں مکھی کی طرح منڈلاتی تھیں اور وہ چند دن خوب صورت بنا کر انہیں بھول جاتا تھا۔

نیہاں وقاص بلا کی حسین و جمیل، ہر کوئی اس پر نثار تھا مگر وہ خود کسی کی اسیر ہوئی تو وہ جگر آفندی تھا۔ جس نے اس کی دوستی قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور نیہاں کو خود پر فخر بھی تھا کہ وہ جس سے دوستی کرتی ہے وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔ ابھی وہ ہواؤں میں اڑ ہی رہی تھی کہ جگر آفندی نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی۔

☆.....☆

زندگی نہ کبھی رکی ہے اور نہ قیامت سے پہلے رکے گی۔ وہ بھی نیہاں اور اس جیسی کتنی ہی لڑکیوں کا دل اپنے جوتوں تلے کچل کر اپنے انداز میں زندگی کا سفر طے کر رہا تھا۔ پاکستان آ کر اس نے بزنس اسٹارٹ کیا تھا۔ شیراز اس کا واحد دوست تھا جو اسٹوڈنٹ لائف سے پریکٹیکل لائف میں اس کے ساتھ تھا۔ لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ شیراز اس کے روم میں تھا۔ اس نے کارڈ اس کے سامنے رکھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ کارڈ اٹھاتے ہوئے استفسار

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرنے لگا۔ شیراز نے گھور کے اسے دیکھا۔

''غالباً اسے شادی کا کارڈ کہتے ہیں۔'' اس نے دانت پیس کے کہا۔

''واقعی! تُو شادی کررہا ہے؟'' کارڈ کھولتے وہ متحیر لہجے میں استفسار کررہا تھا۔

''شادی ہی کررہا ہوں۔ خودکش بمبار نہیں بن رہا جو اتنی حیرت ہورہی ہے۔'' وہ چڑ ہی تو گیا۔

''تقریباً تمام ہی دوستوں نے شادی کرلی ایک تُو ہی بچا تھا۔'' وہ تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ واقعی خودکشی کررہا ہو۔

''جی جناب! سب کی ہوگئی۔ اب میں ہی کررہا ہوں۔ کیوں کہ ہم نارمل انسان ہیں۔'' شیراز نے سینڈوچ کا بائٹ لیتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

''یو مین..... میں ابنارمل ہوں۔'' وہ چڑ گیا۔

''اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔'' شیراز کا انداز ہنوز چوٹ کرنے والا تھا۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''نارمل تم نہیں ہو جو اچھی بھلی آزاد زندگی چھوڑ کر غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے جارہے ہو۔'' اس نے اپنے نادر خیالات کا اظہار کیا۔

''تمہیں کسی نے غلط انفارمیشن دی ہے کہ شادی غلامی کا دوسرا نام ہے۔'' شیراز اس کی برین واشنگ کے موڈ میں تھا۔

''مجھے اپنی ذات سے عشق ہے اور میں شادی کو غلامی ہی سمجھتا ہوں۔ کیا دیتی ہے شادی.....! ایک بیوی جس کے چونچلے اٹھاتے رہو۔ اس کے پابند رہو۔ اس سے ملو، اس سے نہ ملو، میرے میکے چلو۔ پھر بچے جو آتے ہی زندگی حرام کردیں۔ جیبیں پیس کرتے رہیں۔ ان کی دیکھ بھال، ویکسینیشن وغیرہ..... ملازموں کی فوج کے ہوتے ہوئے بھی بچے کے نخرے اٹھاؤ۔ اوہ مائی گاڈ!''

''بے وقوف انسان لوگ ترستے ہیں اس رونین کے لیے۔ تو واقعی کبھی شادی نہیں کرے گا ہمیشہ فلرٹ کرتے ہی زندگی گزارے گا۔'' شیراز آج اس پزل کو حل کرنے کے موڈ میں تھا۔

''پیار اور ہار، جگر آفندی کی ڈکشنری میں نہیں ہے مائے ڈیئر۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بیڈروم کو کوئی اور شیئر کرے۔ میرے کمرے میں جہاں پرفیومز، لوشنز، روم اسپرے ہوتے ہیں۔ وہاں بچوں کی دوا کی بوتلیں، ڈائے پر اور سرہانے قبر کی پہلی رات ٹائپ کوئی کتاب ہو۔ میں اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔'' وہ پیپر ویٹ گھماتا ہوا بول رہا تھا۔ شیراز کو اس کے خیالات پر حیرت ہورہی تھی۔ وہ آج تک یہ سوچ رہا تھا کہ وہ میچور ہوتے ہی بدل جائے گا۔ پریکٹیکل لائف اسے زندگی کا ڈھنگ سکھادے گی مگر وہ تو کسی اور ہی سمت کا راہی تھا۔

''شادی صرف ٹینشن کا ہی تو نام نہیں ہے۔ ایک مکمل گھر، فیملی اس میں کھیلتی خوشیاں بھی ہیں۔ نفسی خواہش، ذہنی، جسمانی سکون سب اس میں پنہاں ہے۔'' شیراز پیچھے نہ ہٹا۔

''سب کچھ میرے پاس ہے۔ رہی بات خواہش کی تو وہ تم جانتے ہو، میرے ایک اشارے پر لڑکیاں ہر حد سے گزرنے کو تیار رہتی ہیں۔'' وہ تمسخر اڑاتی مسکراہٹ سے بولنے لگا۔

''جب اسلام نے بیوی کا حلال رشتہ فرض کیا تو یہ سب کیوں؟ معاشرے میں بے راہ روی ان حرام کاریوں کی وجہ سے پھیل رہی ہے۔'' شیراز اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

''یہ بہت ہی بوداپوائنٹ ہے مائی ڈیئر فرینڈ۔ بے راہ روی کا شکار زیادہ تر میرڈ عورتیں ہی ہوتی ہیں، جو فیملی اور شوہر کے ہونے کے باوجود دھندے کررہی ہیں۔ آج گھر جاتے ہوئے سڑکوں کو غور سے دیکھتے جانا۔ شادی کا طوق گلے میں ڈالے بہت سی عورتیں سگنلز پر کھڑی نظر آئیں گی۔'' یہ معاشرے کا وہ کڑوا سچ تھا جسے جھٹلانا شیراز کے بس میں نہیں تھا۔

''شادی صرف نفسانی تقاضے تو پورے نہیں کرتی یار، کبھی دل چاہتا ہے کوئی اپنا ہو بہت قریب جو ہماری سنے، تھکے ہوں تو اس کے کندھے پر سر رکھ کے تھوڑی دیر ستالیں۔ دل بوجھل ہو تو اس کے آنچل میں منہ چھپا کے رولیں۔''

مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے نا آج، نا کل۔'' وہ سر جھٹک کر چیئر پر گھومنے لگا۔

☆.....☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زندگی بھی گھومتی رہی اپنے دائرے میں۔ موسم بدلے، حالات بدلے اگر کچھ نہیں بدلے تو وہ اس کے خیالات تھے۔ شیراز کی شادی ہوگئی تھی۔ اس کے تین بچے تھے جو اب شادی کے قابل ہوگئے تھے۔

والدین سفرِ آخرت کو سدھار گئے تھے۔ ان کے گزرنے کے بعد پہلی بار اسے اکیلا پن محسوس ہوا۔ بنگلے میں نوکروں کی فوج تھی آفس میں ورکرز کی بھرمار تھی۔ اس نے ایک فیکٹری سے اسٹارٹ کیا تھا اور آج ہر شہر میں اس کی فیکٹری تھی۔ وہ حقیقتاً پیسوں میں کھیل رہا تھا۔ کامیابیاں، کامرانیاں جیسے اس کی باندی تھیں۔

اس نے زندگی کو ایسے گزارا جیسے وہ گزارنا چاہتا تھا۔ ممی، پپا شادی کا ارمان اور اس کے بچوں کا خواب لیے دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس کی وجاہت آج بھی برقرار تھی جس طرح ماں نوزائیدہ بچے کا خیال رکھتی تھی اسی طرح وہ اپنا خیال رکھتا تھا۔ بڑھتی عمر نے اس پر کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ آج اسے شیراز بہت یاد آرہا تھا۔

شادی کے بعد سے وہ بہت کم ملنے لگا تھا۔ کبھی مسز کو شاپنگ پر لے کے جارہا ہوں، کبھی بچے کی ویلیشن کروانی ہے، کبھی بچے کے کپڑے لینے ہیں تو کبھی پیرنٹس ڈے پر اسکول جانا ہے۔'' وہ جب ملنے کا کہتا آگے سے یہ ہی سننے کو ملتا۔

''ہوگئے نا غلام بیوی اور بچے کے!'' وہ چڑاتا تھا۔

''یہ غلامی نہیں خوشی ہے۔ کل کو جب بچے بڑے ہو جائیں گے تو مجھ بوڑھے کو سہارا دیں گے۔ جب کسی کے پاس وقت نہیں ہوگا تو بیوی تو ہوگی جس سے میں اپنے دل کی بات کرسکوں گا۔'' وہ آج بھی اتنا مطمئن تھا۔

جگر آفندی کو تب اس اطمینان کا اندازہ نہیں تھا۔

آج وہ پارک کے بینچ میں تنہا بیٹھا تھا۔ پارک میں بچے کھیل رہے تھے۔ فیملیز کھانے پینے کی چیزیں نکالتے بچوں کو مسلسل آواز دے رہی تھیں۔ ایک سکون، مسرت سب کے چہروں پر تھا اور آج سے پہلے یہ سب اس نے محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی نئے ماڈل کی بی ایم ڈبلیو بہت دور سڑک پر لاوارث کی طرح پڑی تھی۔ آئی فون موبائل اس نے کہیں دور ہوا میں اچھال دیا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ سلور گولڈ کے کف لنکس سگنل پر کھڑے بھکاری کے کشکول میں ڈال کر اس نے آستین فولڈ کر لی تھیں۔ روبی کا بروچ ڈسٹ بن میں ڈال کر اب وہ بینچ پر کئی گھنٹوں سے بیٹھا تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ وہ ایک فائل تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اکاؤنٹ روپوں سے بھرا پڑا تھا۔ کروڑوں روپے سوئس بینک میں تھے۔ کئی ہزار کنال پر زمینیں پڑی تھیں۔

اس نے کلائی میں موجود ڈائمنڈ رسٹ واچ کو دیکھا اور جیسے اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ شاید ہی کبھی وہ اس سے پہلے اتنا ہنسا ہو۔ اردگرد کے لوگ تحیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ترحم بھری نظروں سے جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ وہ جس نے ہیروں کی کان کھودی آج وہ خود بے مول ہوگیا تھا۔ اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اربوں کا بینک بیلنس..... زمین..... آزادی۔ سب کچھ تو تھا اس کے پاس جسے اس کی چاہ تھی۔ نہیں تھا تو کوئی اپنا۔ اس کا جی چاہا اپنے ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگے اور وہ یہ ہی کرنے لگا۔ بچے ڈر کے بھاگ گئے۔

ویل ڈریس بندے کو اپنے بال نوچتے دیکھ کر سب ہی کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ چند ایک نے پارک انتظامیہ کو شکایت کی۔ لوگوں نے اسے ہلایا جلایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو انتظامیہ نے نفسیاتی اسپتال سے عملے کو بلا لیا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ وہ مسلسل ہنس رہا تھا اور آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔

''پاگل لگتا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''ارے اس کی فائل تو رہ گئی۔'' بھانت بھانت کی آوازیں آرہی تھیں۔

''اوہو یہ تو ایڈز کا مریض ہے۔'' کسی نے چیخ کے کہا تھا اور عملے کے لوگوں نے ایک دم سے اسے چھوڑ دیا تھا کہ چھوت انہیں بھی نہ لگ جائے۔ وہ بیچ سڑک پر بیٹھا رو رہا تھا۔

بیچ سڑک پر بیٹھا وہ سوچ رہا تھا اس نے کیوں اتنی محنت کی کہ آج چیمپئن آف کامرس کا صدر بنا بیٹھا تھا اور اب یہ پیسہ، زمین، جائیداد کیا کرے گا وہ اس کا؟ کون ہے اس کا والی وارث.....! کل جب وہ مرجائے گا تو کون ہوگا اس کا نام لیوا؟ اور ان سوالوں کے جوابات اسے اس وقت تک ڈھونڈنے تھے جب تک موت آکر اسے اپنے پنجے میں دبوچ نہ لیتی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ماہر

حمیرا خان

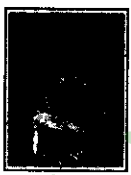

ایک ماہر چور کی داستانِ حیرت، جو انسانی نفسیات کو سامنے رکھ کر چوری کرتا تھا

فہد لفٹ سے نکل کر پارکنگ کی طرف چلنے لگا اس کے ایک ہاتھ میں لیپ ٹاپ بیگ تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ پاکٹ سے گاڑی کی چابیاں نکال رہا تھا لیکن جیسے ہی وہ پارکنگ میں اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی جھلکنے لگی۔ اس کی گاڑی اپنی جگہ پر نہیں تھی یعنی اس کی گاڑی چوری ہو چکی تھی۔ آج کا دن فہد کے لیے ہر لحاظ سے بُرا ثابت ہو رہا تھا صبح ایک بہت اہم ڈیل کینسل ہوئی تھی اور اب اس کی گرے کلر کی لینڈ کروزر جو اس نے ایک ماہ پہلے ہی شوروم سے نکلوائی تھی غائب تھی بلکہ یقینی طور پر چوری ہو چکی تھی۔ کچھ دیر پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے گویا خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور جیب سے موبائل نکال کر ایک نمبر ڈائل کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔ ”ہاں یار کدھر ہو تم؟“ کال ریسیو ہوتے ہی فہد نے کہا دوسری طرف ایس پی فیروز خان تھا کچھ دیر فون پر بزی رہنے کے بعد فہد نے فون بند کر دیا اور روڈ پر آ کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد فہد ایس پی فیروز کے سامنے اس کے آفس میں بیٹھا اپنا مسئلہ بتا رہا تھا۔

”ہوں ں تم فکر نہ کرو تمہاری گاڑی تمہیں جلد مل جائے گی“ ایس پی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو یار چل پھر میں اب چلتا ہوں کوئی پراگریس ہو تو کال کرنا“ فہد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”رکو ذرا میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ ایس پی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ارے نہیں یار تم کہاں ڈراپ کرو گے ڈونٹ وری میں ٹیکسی کر لوں گا“ فہد نے اسے روکنا چاہا لیکن ایس پی نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کے ساتھ آفس سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

”بڑی ٹینشن میں لگ رہا ہے کوئی ہاتھ مارا ہے کیا؟“ عدیل کی بے چینی دیکھ کر قیصر نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”بس یار دعا کر کام خیر خیریت سے ہو جائے تو آج رات تیری دعوت پکی“ عدیل نے ایک آنکھ دباتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا تو قیصر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کے ہنس پڑا۔

”چل پھر میں نکلتا ہوں زیادہ دیر کرنا بھی مناسب نہیں“ عدیل نے کھونٹی پر ٹنگی اپنی شرٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے قیصر سے کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆

عدیل بہت احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا وہ بہت چوکس تھا اور اس کی نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مین راستوں سے بچ کر گلیوں میں سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ عدیل کی منزل زیادہ دور نہیں تھی تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنی مطلوبہ جگہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پہنچنے والا تھا اور پھر اس کی خالی جیب نوٹوں سے گرم ہونے والی تھی یہ خیال ہی بہت خوش کن تھا، عدیل بے اختیار سیٹی پر ایک مشہور گانے کی دھن بجانے لگا۔ اس کا خوش ہونا بنتا بھی تھا کیونکہ کافی عرصے بعد اس کے ہاتھ کوئی اچھی چیز لگی تھی۔ پانچ منٹ بعد وہ ایک سنسان علاقے میں موجود گیراج کے سامنے گاڑی روک رہا تھا۔

عدیل نے گاڑی روکی اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے فون پر ایک نمبر ملا دیا۔ ''فون کیوں کر رہا ہے اندر آجا'' دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی عدیل نے ایک بھاری بارعب آواز سنی۔ ''تمہیں کیسے پتا کہ میں باہر ہوں'' عدیل نے بے ساختہ پوچھا جواب میں بارعب آواز کا بلند قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو اسے اپنے سوال کے بے ڈھنگے پن کا شدت سے احساس ہوا۔ ''میں آتا ہوں'' عدیل نے فون بند کرتے ہوئے کہا اور گیراج کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆☆

''اپنے خبریوں کو ایکٹو کرو اور پتا لگواؤ یہ کام کس کا ہے، مجھے کل تک چور چاہیے، یاد رکھو ایس پی صاحب کی اس معاملے میں خاص دلچسپی ہے۔ ایس ایچ او نے اپنے ماتحتوں کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔

''یس سر'' ماتحت ایڑیاں بجاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ ایس ایچ او فائل دیکھنے میں مصروف ہو گیا لیکن اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔

اگلے تین دن پولیس کافی سرگرم رہی تھی جس کا خاطر خواہ رزلٹ بھی سامنے آ گیا تھا چوتھے دن ظہر اور عصر کے بیچ کا وقت تھا جب پولیس کی گاڑی گیراج کے سامنے جا کر رکی۔ گیراج کے بیسمنٹ سے گرے لینڈ کروزر بھی مل گئی تھی۔ ''عام طور پر گاڑیوں کا رنگ، نمبر پلیٹ وغیرہ فوراً تبدل کر دیا جاتا ہے لیکن چار دن گزرنے کے بعد بھی یہ گاڑی جوں کی توں کھڑی ہے، کوئی خاص وجہ؟'' گیراج میں صرف ایک آدمی ملا تھا جسے گرفتار کر کے پولیس سٹیشن لایا گیا تھا۔ ''اصل میں ہمارے دوسرے اڈے پر یہ سب کام کیے جاتے ہیں لیکن اس گاڑی کی وجہ سے پولیس فل ایکشن میں تھی تو ہمیں موقع نہیں مل پایا گاڑی وہاں لے جانے کا'' آدمی نے گال سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی سی ''تفتیش'' کے بعد ہی دوسرے اڈے اور باقی لوگوں کے بارے میں معلومات مل گئی تھیں۔ گرفتاریاں کی جا رہی تھیں لیکن اصل چور ابھی تک پولیس کے ہاتھوں سے بچا ہوا تھا۔

☆☆☆☆

عدیل اس وقت ایک زیر تعمیر ویران بلڈنگ میں چھپا ہوا تھا اور اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس کی نظر اس گرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لینڈ کروزر پر پڑی تھی۔ اگر اسے ایک فیصد بھی یہ اندازہ ہوتا کہ یہ معاملہ اتنا سیریس ہوسکتا ہے تو وہ کبھی اس میں نہ پڑتا۔ پچھلے چار دن سے وہ ادھر سے ادھر چھپتا پھر رہا تھا لیکن ابھی تک شہر سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔ آج رات اسے یہاں سے نکل کر پھر سے شہر سے باہر جانے کی کوشش کرنی تھی۔ وہ بس اندھیرا پھیلنے کا منتظر تھا۔

☆☆☆☆

''تھینک یو یار لیکن مجھے اس چور سے ملنے کا بہت شوق ہے۔'' ڈنر کرتے ہوئے فہد فیروز خان سے مخاطب تھا۔

''تمہیں تمہاری گاڑی مل گئی چور کو پولیس دیکھ لے گی تم مزے کرو'' فیروز خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہیں یار سیریسلی میں اس کی زبان سے سننا چاہتا ہوں اس نے یہ چوری کیسے کی، اس لیے جب وہ تمہیں مل جائے تو مجھے اس سے ضرور ملوانا'' فہد کے زور دینے پر فیروز خان کو اس سے وعدہ کرنا پڑا۔

عدیل اس وقت پولیس کی حراست میں تھا لیکن اس کے خلاف کوئی پختہ ثبوت ہاتھ نہیں لگا تھا۔ کافی سختی کرنے کے باوجود وہ اپنے اس بیان پر قائم تھا کہ اس چوری سے اس کا دور دور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ فہد کو پتا چلا تو وہ عدیل سے ملنے جا پہنچا۔

عدیل کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ اس کی مہمان نوازی میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی لیکن وہ کافی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔ ایس پی فیروز کی وجہ سے فہد کو عدیل سے ملنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا اور اب وہ آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''تم یہ تو جان ہی چکے ہو گے کہ جو گاڑی چوری ہوئی تھی وہ میری تھی، لیکن اس کے باوجود اگر تم چاہو تو میں اس مصیبت سے نکلنے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں'' فہد کی بات پر عدیل کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی تھی لیکن وہ کچھ بولنے کی بجائے خاموشی سے فہد کو دیکھتا رہا تھا شاید وہ یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فہد کس حد تک سچ کہہ رہا تھا اور کیا اس پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا؟

''اگر میں اپنا پرچہ واپس لے لوں تو تمہیں یہاں سے رہائی مل سکتی ہے لیکن۔۔۔'' اتنا کہنے کے بعد فہد نے رک عدیل کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''لیکن کیا؟'' اس بار عدیل خاموش نہیں رہ سکا اور سوال کر بیٹھا۔ ''لیکن اس کے بدلے تمہیں ایک آسان سا کام کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ تمہیں مجھے بتانا ہوگا کہ تم نے میری گاڑی کیسے چوری کی تھی۔'' فہد کی بات پر عدیل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اور اس کے بعد تم کیس واپس لے لو گے؟ کیا مجھے بیوقوف سمجھتے ہو؟ اس کے بعد مجھ پر مقدمہ چلے گا اور میں جیل جاؤں گا'' عدیل کا انداز استہزائیہ تھا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں ایسا ہی کروں گا جیسا کہ میں نے تم سے کہا ہے، مجھ پر اعتبار کرنے کے سوا تمہارے پاس کوئی اور راستہ بھی نہیں، خیر مجھے کوئی جلدی نہیں تم جب تک چاہو پولیس والوں کے مہمان رہ سکتے ہو جب مجھ پر اعتبار ہونے لگے بتا دینا مجھے پیغام مل جائے گا۔ فہد نے اٹھتے ہوئے لاپروا لہجے میں کہا۔

''نہیں رکو جائیے۔ میں آپ کو سب کچھ بتانے کو تیار ہوں'' عدیل نے ہار مانتے ہوئے کہا اس کی بات سن کر فہد کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆

میرا چوری کرنے کا طریقہ بہت سیدھا سادا ہے جناب۔ ویسے تو ہماری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ بنا رسک کے کچھ کرنا ممکن نہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ جس حد تک ممکن ہو یہ رسک کم کر سکوں آپ کی گاڑی کے معاملے میں بھی میں نے وہی کیا جو ہمیشہ کیا کرتا ہوں۔ میں نے گاڑی کا کور خریدا اور آپ کی گاڑی کو اچھی طرح ڈھک دیا۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا گیا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے امید تھی آپ پارکنگ میں آئے تو اپنی گاڑی نہ دیکھ کر یہی سوچا کہ گاڑی چوری ہو چکی ہے جبکہ گاڑی اس وقت وہیں کور کی ہوئی کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں پہنچا اور گاڑی کی نمبر پلیٹ بدل کر گاڑی وہاں سے لے گیا۔ عدیل نے پوری کہانی کہہ سنائی جبکہ فہد اس دوران بالکل خاموش رہا تھا۔

''ہوں، تم نے انسانی نفسیات کا استعمال بہت خوبی سے کیا ہے کسی کی توجہ کور ڈ گاڑی کی طرف نہیں جاتی، جس طرح سے تم نے یہ سب کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک ذہین نوجوان ہو'' فہد نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''میں وعدے کے مطابق اپنا کیس واپس لے رہا ہوں، یہ میرا کارڈ اپنے پاس رکھو، یہاں سے فارغ ہو کر میرے پاس چکر لگانا امید ہے میں تمہارے لیے کسی اچھی جاب کا بندوبست کر سکوں گا۔ فہد کی بات پر عدیل نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

عادت

حمیرا خان

ایک ایماندار شخص کی داستان، جو ایک عجیب عادت کا شکار تھا

"تو کیا اس کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ انسان کو سمجھنا ابھی ممکن نہیں ہو سکا؟" ردا کے پوچھنے پر سر حیدر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"ہاں کسی حد تک یہ بات درست ہے کیونکہ انسانی فطرت اور رویے کو سمجھنے کا عمل ابھی تک جاری و ساری ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا۔" حیدر صاحب عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اپنے مخصوص نرم لہجے میں بتانے لگے۔

ویسے تو سائیکالوجی ہے ہی بہت دلچسپ سبجیکٹ لیکن اگر پڑھانے والا سر حیدر جیسا انسان ہو تو کوئی پاگل ہی ہوگا جو کلاس چھوڑے گا۔ یہاں بھی یہی حال تھا کلاس پوری

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

طرح بھری ہوئی تھی اور سب پڑھنے کے لیے تیار بھی دکھائی دیتے تھے۔

''تو سر کیا ہم کسی بھی انسان کے بارے میں یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ ہم اسے جانتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟'' فریحہ نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں سوال کیا تو اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کلاس میں دبی دبی ہنسی کی آوازیں بکھر گئیں۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک کہا فریحہ، یہی سچ ہے ہر انسان کی پرسنالٹی کے اتنے رخ ہوتے ہیں کئی بار ہم حیران پریشان رہ جاتے ہیں اس انسان کو دیکھ کر جس کے بارے میں ہمارا خیال ہوتا ہے کہ ہم اسے اچھے سے جانتے ہیں۔'' سر حیدر کے کہنے پر فریحہ نے ارسلان کی طرف دیکھا اس لمحے اس کے چہرے پر چڑانے والی مسکراہٹ تھی۔

''لیکن سر دنیا میں کوئی ایک انسان تو ایسا ہوگا نا جس کو ہم واقعی جانتے ہیں جس کی شخصیت کا ہر پہلو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔'' ارسلان کہاں پیچھے رہنے والا تھا فوراً بولا تھا۔

ساری کلاس اس بحث کو انجوائے کر رہی تھی۔

''سر میں ایک واقعہ سنانا چاہوں گی جس سے ثابت ہو جائے گا کہ کسی بھی انسان کے بارے میں کوئی فائنل رائے نہیں دی جا سکتی۔ یہ واقعہ میرے والد صاحب کے ساتھ پیش آیا ہے اس لیے اس کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔'' نائلہ بھی میدان میں اتری۔

''سر سے آئی؟'' نائلہ کے پوچھنے پر حیدر صاحب نے سر کے اشارے سے اسے بولتے رہنے کی اجازت دے دی۔

☆.....☆

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟'' فرید صاحب نے عاطف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ان کے لہجے میں پریشانی اور غصہ دونوں جھلک رہے تھے۔

''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم وہ بیگ جس میں دس لاکھ روپے تھے کہیں گم کر آئے ہو؟'' فرید صاحب کے پوچھنے پر عاطف نے سر جھکا لیا۔ ''آئی ایم سوری ڈیڈ بٹ یہی ہوا ہے۔'' ماں کے اشارے پر اس نے سر ضرور جھکایا تھا لیکن وہ بالکل بھی پریشان یا شرمندہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عاطف وہ بیگ کہیں بھولا نہ ہو بلکہ وہ کسی نے چوری کر لیا ہو؟'' مسز فرید فوراً بیٹے کی مدد کو آن پہنچیں۔

''تم چپ رہو مجھے اس سے بات کرنے دو، صاحبزادے دس لاکھ روپے گم کر آئے ہیں اور اتنے پرسکون ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔'' فرید صاحب کو عاطف کا سکون بری طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کا لاپرواہ انداز فرید صاحب کا غصہ بڑھا رہا تھا۔ ''صاحب جی ایک آدمی آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' ملازم نے اندر آ کر اطلاع دی۔

''اسے کہو میں گھر پر نہیں ہوں پھر کسی وقت آ جائے۔''

فرید صاحب اس وقت بہت پریشان تھے اور وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتے تھے۔ ''لیکن میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر موجود ہیں۔'' ملازم کی بات سن کر فرید صاحب نے غصے میں اسے گھورا تو وہ نظریں چرا گیا۔

''صاحب جی وہ کہہ رہا تھا کہ اسے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔'' ملازم نے ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

''بٹھاؤ اسے میں آتا ہوں۔'' فرید صاحب کے کہنے پر ملازم جان بچی سو لاکھوں پائے والے محاورے کے مطابق وہاں سے بھاگ نکلا۔

''تم کہیں جانا مت میں آ کر تم سے بات کرتا ہوں۔'' وہ عاطف کو رکنے کا کہہ کر ڈرائنگ روم کی طرف چلے گئے۔

فرید صاحب ڈرائنگ روم میں آئے تو ایک چالیس بیالیس سالہ شخص ان کا منتظر تھا۔ ''معاف کیجیے گا آپ کو انتظار کرنا پڑا دراصل میں کسی الجھن میں الجھا ہوا تھا۔'' فرید صاحب اپنی بامروت فطرت سے مجبور معذرت کی۔

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے جو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اجنبی مہمان نے ایک بیگ فرید صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ ''ارے یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟'' فرید صاحب نے جھپٹ کر اس سے بیگ لے لیا یہ ان کا وہی بیگ تھا جس میں دس لاکھ روپے تھے۔

''بس مل گیا کہیں، بیگ کی پاکٹ میں وہ رسید تھی جس کے مطابق آپ یہ پیسے کسی راشد صاحب کو دینے تھے لیکن اس پر راشد صاحب کے دستخط نہیں تھے تو اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ پیسے ابھی تک آپ کے ہی ہیں، مہربانی کر کے چیک کر لیں پیسے پورے ہیں نا؟'' اجنبی نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

''ارے صاحب یہ کیسی بات کر دی آپ نے، بھلا چیک کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' فرید صاحب شرمندہ دکھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دینے لگے۔

''بس میری خوشی کے لیے آپ بیگ ایک بار چیک کر لیں۔'' اجنبی نے اصرار کیا تو فرید صاحب نے دیکھا پورے دس لاکھ روپے تھے۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا آج کے دور میں بھی آپ کے جیسے فرشتہ صفت لوگ ہوتے ہیں، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرسکوں۔ پلیز میری طرف سے یہ چھوٹا سا گفٹ قبول کیجیے۔'' فرید صاحب نے نوٹوں کی گڈی میں سے ڈھیر سارے نوٹ نکال کر اجنبی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ اپنی جگہ سے یوں اچھل پڑا جیسے اسے کسی زہریلے بچھو نے ڈنک ماردیا ہو۔

''ایسی بات کہہ کر آپ میری بے عزتی مت کریں، میرا فرض تھا آپ کی امانت آپ تک پہنچانا سو میں نے اپنا فرض ادا کیا اب مجھے اجازت دیجیے۔'' اجنبی کا لہجہ اتنی ناراضگی لیے ہوئے تھا کہ فرید صاحب نے فوراً اپنا پیسوں والا ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔

اجنبی جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

''پلیز آپ کم از کم میرے ساتھ ایک وقت کا کھانا تو کھا ہی سکتے ہیں یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔'' اجنبی نے فرید صاحب کی درخواست مان لی اور ان کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے ہوٹل چلا آیا۔ کھانے کے دوران خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ اجنبی نے اپنا نام بشیر بتایا تھا اس کا اکیلا چلتا ہوا جنرل اسٹور تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب وہ دونوں ٹیبل سے اٹھے تو ایک ویٹر جو ان کی ٹیبل پر ڈیوٹی دے رہا تھا ان کے پاس چلا آیا اور فرید صاحب کے کان کے پاس جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''سر! آپ کے دوست نے ہوٹل کا چمچ چوری کیا ہے ان سے کہیں کہ چمچ ٹیبل پر واپس رکھ دیں۔''

ویٹر کی بات سن کر فرید صاحب کا دماغ گھوم گیا۔ ''کیا بکواس کررہے ہو؟ تم جانتے ہو تم کس کے بارے میں یہ بات کہہ رہے ہو؟ یہ شخص میرا محسن ہے۔'' فرید صاحب غصے سے کہہ رہے تھے۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اس ہوٹل میں آرہے تھے انہیں یہاں کا کھانا بہت پسند تھا اور یہاں کا اسٹاف بھی ان سے اور ان کی پسند ناپسند سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا اور آج ان کے اسی پسندیدہ ہوٹل میں ان کے معزز مہمان کی بے عزتی کی جارہی تھی۔ ''جانتے ہو یہ وہ شخص ہے کہ دس لاکھ روپے کی بڑی رقم دیکھ کر بھی جس کا ایمان نہیں ڈگمگایا اور تم کہہ رہے ہو کہ انہوں نے ایک معمولی چمچ چرایا ہے، ابھی اسی وقت اپنے منیجر کو بلاؤ۔'' فرید صاحب کی آواز خاصی بلند ہو چکی تھی اس ہنگامے کی اطلاع منیجر کو ہو چکی تھی سو وہ خود ہی وہاں چلا آیا تھا۔

''کیا بات ہے سر! کوئی پرابلم؟'' منیجر ان کے پاس آتا ہوا بولا۔ ''اپنے اس ویٹر کو سکھائیں کہ معزز مہمانوں سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔''

فرید صاحب کے کہنے پر منیجر نے ویٹر کی طرف دیکھا۔ ویٹر نے ساری کہانی کہہ سنائی۔

''سر آپ ان صاحب کی تلاشی لے لیں اگر ان کے کوٹ کی جیب سے چمچ نہ ملے تو آپ مجھے جو سزا دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔'' ویٹر کے کہنے پر منیجر نے فرید صاحب کی طرف دیکھا بشیر اس سارے وقت میں بالکل خاموش رہا تھا اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہا تھا اور نہ ہی ویٹر کی باتوں پر غصے کا اظہار کیا تھا۔ ''اگرچہ یہ میرے معزز مہمان کی بے عزتی ہے کہ ان کی تلاشی لی جائے لیکن آپ کے اس ویٹر کو اس بدتمیزی کی سزا دینے کے لیے میں اس کی شرط ماننے کو تیار ہوں آپ تلاشی لے سکتے ہیں۔'' فرید صاحب کے اجازت دیتے ہی منیجر آگے بڑھا اور اس نے ویٹر کے اشارے پر بشیر کے کوٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ ڈالا دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ جیب سے باہر تھا اور اس میں چاندی کا مخصوص چمچ دکھائی دے رہا تھا جو اس ہوٹل کی نشانی لیے ہوئے تھا۔

فرید صاحب ہق دق کبھی ویٹر تو کبھی بشیر کو دیکھ رہے تھے ان کے لیے اس بات کا یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جو شخص اتنی بڑی رقم واپس کردے وہ یہ معمولی چمچ کیسے چرا سکتا ہے بھلا۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' بشیر اتنا کہہ کر تیزی سے ہوٹل سے باہر چلا گیا۔ فرید صاحب صدمے کی کیفیت میں تھے کہ اسے روک کر کچھ پوچھ بھی نہ سکیں۔ اس کے بعد بشیر انہیں کبھی دکھائی نہیں دیا نہ ہی انہوں نے بشیر سے ملنے کی کوئی کوشش کی۔

نائلہ کی کہانی ختم ہوئی۔

''بہت خوب نائلہ آپ سائیکالوجسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی بھی بہت اچھے انداز میں بیان کرتی ہیں کیا خوب سماں باندھا، ویری نائس، so guys، ہم کل یہیں سے آغاز کریں گے۔''

کلاس کا ٹائم ختم ہو چکا تھا سو حیدر صاحب انہیں خدا حافظ کہتے کلاس سے چلے گئے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آخری پونجی

حمیرا خان

اُس ماں کی کہانی قدرت نے جسے ہر موڑ پر لہو رُلایا تھا

لوگ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ساتھ مرنا تو دور کی بات ہے بعض اوقات ساتھ جینا بھی انسان کے اختیار میں نہیں رہتا۔ زندگی کب کس موڑ پر کس سے ملا دیتی ہے اور کس سے جدا کر دیتی ہے کچھ پتا نہیں چلتا۔ انسان بس حیرت سے اپنے ساتھ وہ سب ہوتا دیکھتا رہ جاتا ہے جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔

☆.....☆

''ناشتہ تو سکون سے کر لے میری دھی۔''

کمرے میں داخل ہوتی جمیلہ نے کتاب پر نظریں جمائے بے دھیانی سے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتی اپنی پوتی کو پیار بھری ڈانٹ پلائی تو عالیہ نے مسکراتے ہوئے کتاب سائیڈ پر رکھ دی۔ جمیلہ دوپٹے سے اپنے گیلے ہاتھ پونچھتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

''ارے یہ کیا پراٹھا تو پورا کھا، یہ کیا خالی پیٹ یہ کالا پانی پے جا رہی ہے۔'' جمیلہ کی بات پر عالیہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

''ہنستی کیوں ہے کچھ غلط کہہ رہی ہوں کیا؟'' جمیلہ نے بُرا مناتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

''اماں تم بھی کمال کرتی ہو آدھے سے زیادہ پراٹھا کھا چکی ہوں میں اور پراٹھا بھی وہ جو ماشاءاللہ سے دو پراٹھوں کے برابر ہے اب بھی اگر میں خالی پیٹ ہوں تو بس پھر تو.....'' عالیہ جو بمشکل ہنسی ضبط کر رہی تھی بات ادھوری چھوڑ کر پھر سے ہنسنے لگی۔

''ایک تو یہ آج کل کی لڑکیاں پتا نہیں ہوا پانی پر ہی زندہ ہیں بس۔'' جمیلہ بڑبڑاتے ہوئے کمرہ سمیٹنے لگی اور عالیہ نے ایک بار پھر کتاب اٹھالی۔

☆.....☆

جمیلہ اور عالیہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تھیں۔ جمیلہ کی ماں نئی زندگی کو جنم دیتے ہوئے خود زندگی سے رخ موڑ گئی تو عالیہ کے باپ اور دادی نے اس معصوم کو اپنی شفقت بھری آغوش میں سمیٹ لیا۔

زندگی ایک بار پھر رواں دواں ہوگئی مگر قسمت میں ابھی کچھ اور دکھ کچھ اور آزمائشیں باقی تھیں تبھی اچھا بھلا صحت مند انسان اچانک حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوگیا تو جمیلہ پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی جوان بہو کے بعد جوان اکلوتے بیٹے کی موت کا بوجھ اٹھانا اس کے لیے ہرگز

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آسان نہ تھا ایک بار تو یوں لگا کہ اب کبھی اس کی زندگی میں مسکراہٹ کا گزر تک نہ ہو پائے گا کبھی کوئی خوشی اس کے آنگن میں نہیں اترے گی مگر وہ زیادہ دیر اپنی بربادی کا ماتم نہ کر پائی تھی کہ عالیہ کا ننھا منا وجود ہر وقت اس کی توجہ کا طلب گار تھا۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے بالکل غلط کہتے ہیں کبھی غم ایسے نہیں ہوتے جو گزرتے وقت کی دھول میں چھپ کر دلوں سے اوجھل ہو جائیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ دل کے مر جانے کے بعد بھی اپنے کچھ پیاروں کے لیے زندہ رہنے کی اداکاری کرتے رہنا پڑتی ہے جمیلہ کو بھی عالیہ کے لیے یہ سب کرنا تھا۔ سو اپنی تڑپتی بلکتی ماموتا کو عالیہ پر نچھاور کرتی جمیلہ ایک بار پھر زندگی کے میدان میں ڈٹ گئی تھی اور آج فرمانبردار اور لائق فائق عالیہ کی صورت میں جمیلہ کی محنت کا پھل اس کے سامنے تھا جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ سر جھکائے کتاب پڑھتی عالیہ پر نظر جمائے جمیلہ ماضی کی گلیوں میں کھو گئی تھی تبھی عالیہ کی آواز پر چونکی جو اسکول جانے کے لیے تیار کھڑی اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ سفید شلوار قمیض پہنے گھنے خوبصورت بالوں کو سمیٹ کر سادہ سی چٹیا بنائے جوانی کی دہلیز پر کھڑی عالیہ کو جمیلہ بے اختیار ہی دیکھے جا رہی تھی۔ کالی چادر کے ہالے میں اس کا سرخ و سفید چہرہ بے حد معصوم اور پیارا لگ رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو اماں جلدی کرو نا مجھے دیر ہو جائے گی۔'' عالیہ دروازے کی طرف بڑھی تو جمیلہ بھی تالا ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے گھر سے نکل آئی۔

''دعا کرنا اماں میرا آج کا پیپر بھی اچھا ہو جائے، آج تو ابھی سے کتنی گرمی ہو رہی ہے۔'' چادر کے پلو سے چہرے پر آئے پسینے کو صاف کرتی عالیہ تیز تیز قدم اٹھاتی مین روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتی جمیلہ ہانپنے لگی تھی لیکن عالیہ کو دیر نہ ہو جائے اس خیال سے وہ بس چلے جا رہی تھی۔ آخر بستی سے نکل کر وہ دونوں روڈ تک پہنچ گئیں۔

''لگتا ہے ہم لوگ زیادہ جلدی آ گئے ہیں شیدا تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔'' چاروں طرف دیکھتے ہوئے جمیلہ نے اپنی سوچ کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

''نہیں اماں ہم ٹھیک وقت پر پہنچے ہیں چاچا شیدا آج جانے کہاں رہ گیا ہے، کہا بھی تھا کہ دیر مت کرنا رات دیر تک بیٹھا ہوگا اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں لگا ہوگا اب آنکھ نہیں کھلی ہوگی۔'' ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالتے ہوئے عالیہ نے بے چینی سے بستی کے راستے کی طرف دیکھا مگر شیدے اور اس کے رکشے کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔

وہ بستی جس جگہ پر تھی وہاں سے ٹریفک کا گزر نہ ہونے کے برابر تھا بستی میں بھی ایک اکلوتا رکشا تھا جو رشید عرف شیدے کی ملکیت میں تھا۔ پانچ منٹ مزید گزرے تو عالیہ کی بے چینی میں اضافہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوگیا۔ اس کو تسلی دیتی جمیلہ کی آنکھوں میں بھی تشویش کے رنگ جھلکنے لگے تھے تبھی بستی کی طرف سے ایک موٹر سائیکل آتا دکھائی دیا دونوں کی نظریں دور سے آتے موٹر سائیکل پر جم گئیں ان کے قریب آکر موٹر سائیکل رُک گیا وہ نظیر تھا اس کے پیچھے اس کی دونوں بیٹیاں بیٹھی تھیں اور تیسرے نمبر پر ان کی سہیلی اور کلاس فیلو نجمہ تھی۔

''خیریت تو ہے نظیرے شیدا کہاں ہے؟'' اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے جمیلہ نے بے تابی سے سوال کیا۔

''وہ تو رات سے بخار میں پڑا ہے اماں اس موسم میں بھی رضائی اوڑھے پڑا ہے اور اس میں بھی سردی سے کانپ رہا ہے، تبھی تو انہیں میں چھوڑنے جا رہا ہوں۔'' اس کا اشارہ یقیناً پیچھے بیٹھی لڑکیوں کی طرف تھا۔

''میں عالیہ کو کیسے بھیجوں گی؟'' جمیلہ کو اس صورتِ حال نے پریشان کر دیا اور عالیہ تو بالکل رونے والی ہو رہی تھی۔

''میں لے جاتا اماں لیکن پہلے ہی تین بچیاں ہیں میرے ساتھ اور کسی کو بٹھایا تو گاڑی چلانا مشکل ہو جائے گی خدانخواستہ ایکسیڈنٹ ہوگیا تو؟'' نظیرے کی بات پر جمیلہ کا دل کانپ کر رہ گیا۔ جمیلہ نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی اور بولی۔ ''تم اللہ کا نام لے کر جاؤ بیٹا میں کرتی ہوں کچھ۔''

وہ تو اللہ حافظ کہہ کر وہاں سے چلے گئے پیچھے جمیلہ اور عالیہ ایک دوسرے کی پریشان صورتیں دیکھتی رہ گئیں۔

''اب کیا ہوگا اماں میں کیسے جاؤں گی میرا پیپر رہ گیا تو پورا سال ضائع ہو جائے گا مجھے تو ڈاکٹر بننا ہے اماں۔'' عالیہ کو اپنا پورا مستقبل داؤ پر لگا دکھائی دینے لگا تو وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

''خوامخواہ خود کو ہلکان کر رہی ہے پہنچ جائے گی تو وقت پر اللہ سوہنا کوئی سبب بنا دے گا تو رونا بند کر ورنہ سر میں درد شروع ہو جائے گا پھر پرچے میں کیا لکھے گی۔'' اس کو تسلی دیتے ہوئے جمیلہ نے امید بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا ہر طرف کھیت ہی کھیت دکھائی دے رہے تھے کسی رکشے یا ویگن کا نام نشان تک دکھائی نہ دے رہا تھا۔

''میری بچی کی مدد فرما میرے مالک میری بچی نے بڑی محنت کی ہے اور تو تو کسی کی محنت ضائع نہیں جانے دیتا میری بچی کا بھی کوئی وسیلہ بنا دے۔'' جمیلہ دل ہی دل میں خدا کو پکار رہی تھی۔

☆.....☆

کاندھے پر کالج بیگ لٹکائے نظر سڑک پر جمائے وہ بڑی احتیاط سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا اس کی بستی میں کوئی کالج نہ تھا اور اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اس کے شوق اور لگن کو دیکھتے ہوئے اس کے ابا نے شہر کے کالج میں اس کا داخلہ کروا دیا تھا۔ کالج کا پہلا سال تو اس نے بسوں اور ویگنوں کے سفر کرتے ہی گزارا تھا لیکن گیارہویں میں اس کے شاندار رزلٹ سے خوش ہو کر ابا نے اسے موٹر سائیکل دلوا دی تھی اب اسے بہت سہولت ہوگئی تھی بسوں ویگنوں کے سفر سے جان چھوٹی تو گھر سے صبح سویرے نکلنے کی مشقت سے بھی پیچھا چھوٹ گیا۔ وہ ہمیشہ وقت پر کالج پہنچ جایا کرتا تھا لیکن کل رات اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی رات خاصی بے چینی میں گزری تھی اس کے ماں باپ نے اسے کالج سے چھٹی کر لینے کا کہا مگر آج اس کا جانا بہت ضروری تھا ان کے کالج کا بہت پرانا اور قابل استاد ریٹائر ہوا تھا اور آج کالج اور بچوں کی طرف سے انہیں الوداعی دعوت دی جا رہی تھی، ایک تو وہ نعیم کا بہت پسندیدہ استاد تھا دوسرے اس دن فنکشن کے کئی اہم کام نعیم کے ذمے تھے جن میں سرفہرست فنکشن کی میزبانی تھی سو وہ کسی بھی صورت چھٹی نہیں کر سکتا تھا، آج اسے دیر ہو رہی تھی، کالج پہنچ کر اسے کیا کیا کرنا تھا کس کو کیا کہنا تھا وہ ذہن میں وہ سب کام ترتیب دیتا اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا تبھی اس کی جیب میں پڑا موبائل فون بجنے لگا اس نے موٹر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سائیکل ایک سائیڈ پر روک کر موبائل جیب سے نکال لیا۔ آنے والی کال اس کے دوست اسد کی تھی جو اسے جلدی پہنچنے کی تاکید کرتا انتظامات کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ فون بند کر کے نعیم نے ٹائم دیکھا اور پھر ایک فیصلہ کرتے ہوئے بائیک دوسری سڑک کی طرف موڑ لی۔ اس نے وقت بچانے کے لیے اپنا روز کا راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ سے جانے کا ارادہ کیا تھا۔

☆.....☆

جمیلہ اور عالیہ کو وہاں کھڑے پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن ابھی تک سواری کا انتظام نہ ہو سکا تھا تبھی جمیلہ کی نظر سڑک سے آتے موٹر سائیکل پر پڑی تو اس کا چہرہ امید کی روشنی سے جگمگانے لگا، اس نے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر موٹر سائیکل روکنے کا اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ موٹر سائیکل سوار نعیم تھا۔

''بیٹا ہماری مدد کرو میری پوتی کا آج پرچا ہے اور کوئی نہیں جو اسے شہر پہنچا دے بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں اور اب اللہ نے تمہاری صورت میں ایک فرشتہ ہماری مدد کو بھیجا ہے۔'' جمیلہ نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا جیسے اسے خدشہ ہو کہ دیر ہوئی تو نعیم وہاں سے غائب ہو جائے گا۔ جمیلہ کی بات سن کر نعیم ایک لمحے کو جھجکا مگر ان کی مدد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا پھر اس نے عالیہ کو پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ عالیہ بھی جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے سیٹ پر ٹک گئی۔

''جیتے رہو بیٹا اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔'' خدا کا شکر ادا کرتی بستی جانے والے راستے کی طرف چل پڑی۔

☆.....☆

عالیہ کی پریشانی دیکھتے ہوئے نعیم نے موٹر سائیکل کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا، دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ابھی وہ شہر کی حدود میں داخل ہی ہوئے تھے کہ جانے کیسے عالیہ کی چادر کا پلو اس کے ہاتھ سے کھسک گیا، خبر تو تب ہوئی جب چادر موٹر سائیکل میں پھنس گئی۔ چادر پھندے کی صورت عالیہ کی گردن کے گرد لپٹ گئی اس کے منہ سے اذیت میں ڈوبی چیخ بلند ہوئی نعیم بھی اس صورت حال سے بدحواس ہو گیا تھا تبھی وہ دونوں موٹر سائیکل سمیت سڑک پر گر پڑے، نعیم نے خود کو سنبھالتے ہوئے عالیہ کو دیکھا وہ آنکھیں بند کیے بے خبر پڑی تھی چہرے پر اذیت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی کچھ لوگ جنہوں نے حادثہ ہوتے دیکھا تھا دوڑ کر ان کی طرف آئے نعیم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔

''جلدی کرو ہاسپٹل پہنچاؤ۔'' نعیم نے اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے کسی کو کہتے سنا۔

''لڑکی تو ختم ہو گئی بھائی لڑکے کو دیکھو۔'' کوئی افسوس سے کہہ رہا تھا۔ نعیم خوف اور پریشانی سے رہا سہا حوصلہ بھی ہار گیا اور جہاں بیٹھا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کو گرتا دیکھ کر بھی تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

☆.....☆

نظیر تینوں لڑکیوں کو امتحانی مرکز پہنچا کر واپس بستی کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے سڑک پر لوگوں کے ہجوم کو دیکھا تو غیر ارادی طور پر رک گیا۔ لوگوں کو پرے ہٹاتا آگے بڑھا تو اس کی نظر سڑک پر بے جان پڑی عالیہ پر پڑی۔ عالیہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ ''کیا ہوا اسے؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا لڑکی تو موقع پر دم توڑ گئی تم اسے جانتے ہو کیا؟'' اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا گیا۔

''میں..... ہاں میں جانتا ہوں یہ..... یہ عالیہ ہے اماں جی کی عالیہ۔'' وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا تھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شاید عالیہ کے بے جان جسم کو دیکھتے ہوئے اسے جمیلہ پر ٹوٹنے والی قیامت کا احساس تڑپا گیا تھا جس کی آخری پونجی بھی اس کے ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل گئی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ناول

کاوش صدیقی

خانقاہ

قسط نمبر: 05

خانقاہوں، آستانوں، درباروں، مزاروں سے جڑی ایک مردِ درویش کی داستانِ عجب

تصوف اور محبت کی پُراسرار دنیا کی کہانی

''یہ کیا کیا تم نے۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ملک ریاض کو گھورا۔ ''اب وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔!''

''قسم لے لیں، حلف اٹھوالیں جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں لیکن یہ دھما کا میں نے نہیں کروایا۔'' ملک ریاض

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بہت بری طرح پریشان تھا۔علی مراد اس کی جان کو آیا ہوا تھا۔شاہ ہارون گیلانی کی دشمنی آسان نہیں تھی۔وہ اونٹ تھے برسوں اپنا کینہ چھپانے کے ماہر۔

''لیکن کون مانے گا۔اس کا بھتیجا نہیں تو اس کا بھائی مارا گیا۔جو اس کا سمدھی بھی تھا۔دوہرا رشتہ۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

''کچھ تو کیجئے۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''میں اس طرح بڑے نقصان میں ہوں۔پارٹی پر پہلے ہی مرحلے پر اتنی بڑی افتاد آپڑے تو پھر کس طرح آگے بڑھ سکیں گے۔''

''کیوں بندے پکے نہیں ہیں تمہارے۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے پوچھا۔

''پیر جی ہنڈیا میں کٹا ہوا گوشت بھی گلنے سے پہلے اینٹھتا ہے۔پھر کہیں جا کر گلتا ہے اور کھانے کے قابل ہوتا ہے۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''پیسے سے نیتیں خریدی جاتی ہیں۔وفاداریاں نہیں۔یہ تو برسوں میں جا کر کہیں بدلتی ہیں۔جبلت کی طرح۔بندے بھی آہستہ آہستہ ہی پختہ ہوتے ہیں۔خیر۔۔۔!'' وہ گہری سانس بھر کے بولا۔''آپ کچھ تو کیجئے۔!''

''اچھا۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ایک گہری سانس لی۔''تم کہتے ہو تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔مگر کچھ کرنے کے لئے،ہلچل کے لئے،اخراجات ہوتے ہیں اور تم تو بڑے بے مروت ہو۔فوراً ہی نفع نقصان کا حساب کرنے بیٹھ جاتے ہو۔حالانکہ دیکھ لو،ہماری ضرورت پڑ ہی گئی نا۔۔۔!''

''چھوڑیں بھی پیر جی۔!'' ملک ریاض نے کہا۔''چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل سے نہیں لگاتے۔۔!''

''تو پھر دل لگانے والی بات کرو۔!'' جہانگیر شاہ ہمدانی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''یہ دو کروڑ ہیں۔!'' ملک ریاض نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ ان کے آگے سرکایا۔

''اچھا۔!'' انہوں نے بے نیازی سے لفافہ پیروں سے ایک طرف کھسکا دیا۔اور فون کے بٹن پش کرنے لگے۔

''ہیلو۔۔۔!'' انہوں نے سلسلہ ملتے ہی کہا۔''ہم بول رہے ہیں۔بہت افسوس ہوا شاہ سکندر گیلانی کی شہادت کا۔لوگ اس موقع پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں مگر میں حوصلہ اور امید دیتا ہوں۔کیونکہ شہادت نعمت بھی ہے۔روایات میں آتا ہے کہ ایک شہید اپنے ستر عزیز و اقربا کی شفاعت کروائے گا۔اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔۔!'' پھر وہ رک کر دوسری طرف کا ردِعمل جاننے لگے۔

''ٹھیک ہے۔۔ملک ریاض بھی آپ کی حویلی تعزیت کے لئے حاضر ہونا چاہتے ہیں۔انہوں نے حلفاً کہا ہے کہ ان کا اس حادثے میں کوئی ہاتھ نہیں۔اختلافات تو الیکشن کے ہوتے ہیں۔کوئی دشمنی ذاتی تو نہیں ہے۔!''

''بالکل۔۔بالکل!'' ''اچھا اللہ حافظ۔۔۔!''

''لو جی ملک ریاض۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔''تعزیت کے لئے آنے سے ہارون گیلانی نے منع نہیں کیا ہے۔''

''چلو جی اچھا ہے۔دل صاف ہو گیا۔!'' ملک ریاض ہنسا۔

''دل صاف ہو گیا یہ کس نے کہا۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اچنبے کا اظہار کیا۔

''آپ ہی تو کہہ رہے ہیں۔'' ملک ریاض نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔''انہوں نے تعزیت کے لئے آنے سے منع نہیں کیا۔''

''تم سیاست کی دنیا میں داخل ہو رہے ہو۔یہاں رویوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔یہ بزنس ڈیل نہیں ہے۔جہاں ایک ہاں،ایک بیعانے،ایک ایم اوز کے ذریعے کمٹ منٹ فائنل ہو۔یہاں ہر لمحہ،ہر انداز سمجھنا پڑتا ہے اور پھر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر سیاست میں مقام بنتا ہے!''۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ٹھیک کہتے ہیں آپ۔!'' ملک ریاض نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے اتنی جلدی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔''
''کوئی بات نہیں۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ ''پیروں سے جڑے رہو گے تو فیض پاتے رہو گے۔ سیکھتے رہو گے۔ نکھرتے رہو گے۔!''
''کل دس بجے نماز جنازہ ہے، ہم ایک بجے چلیں گے۔!''
''کیا نماز جنازہ میں شرکت نہیں کرینگے۔؟''
''ہمارا یہ مقام نہیں کہ ہم کسی کے پیچھے کھڑے ہوں۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''بہت زیادہ بھیڑ اور ڈسٹ سے کبھی کھانسی آنے لگتی ہے، استھما شدید ہو جاتا ہے۔ یہ مجبوری ہے، فاتحہ خانی کریں گے۔!''
''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔!'' ملک ریاض اٹھا اور انہیں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے خادم کو دوبارہ قہوہ لانے کا حکم دیا جو دوران گفتگو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔
''شاہ جی۔!'' سہیل نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو پیر ستارہ شناس کو حاضر کروں۔!''
''کب آیا تھا۔؟'' انہوں نے پوچھا۔
''تین چار گھنٹے ہو چکے ہیں۔'' سہیل نے بتایا۔
''خالی ہاتھ آیا ہے یا پھر کچھ نذر نیاز لایا ہے۔؟'' انہوں نے بے دلی سے پوچھا۔
''ہے تو بہت پرجوش۔!'' سہیل نے بتایا۔ ''لگتا ہے کہ سچ مچ کام کروانا چاہتا ہے۔!''
''چلو پھر لے آؤ۔!'' انہوں نے کہا اور اپنے شہ نشین پر دراز ہو گئے۔
دو چار منٹ کے بعد ہی پیر ستارہ شناس اندر داخل ہوا۔ اس نے بادامی رنگ کا جبہ پہنا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر روپہلی گوٹا لگا ہوا تھا۔ سر پر اسی سے ہم رنگ دستار تھی۔ جس پر ایک بڑا سا سپید موتی لگا ہوا تھا جو کہ مصنوعی تھا۔ تمام انگلیوں میں یاقوت، مرجان، عقیق کی انگوٹھیاں تھیں۔ پیروں میں منقش کھسے تھے۔ جو اس نے پاس ادب سے کافی دور اتار دیئے تھے۔
''سرکار۔۔۔ سرکار۔۔۔'' وہ کہتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ اور ان کے پاؤں چھوئے۔
پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے۔
''یہ کیا کرتے ہیں آپ، ہم گناہگاروں کو جنت سے دور کرتے ہیں۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے ان کے پاؤں تھام لئے۔
''رہنے دو ستارہ یہ منہ دیکھے کی محبت۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ ''جب ہم بلاتے ہیں تو تم مصروف ہوتے ہو۔''
''معاف کیجئے گا سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے اپنے کلے پیٹے۔ ''روپوں، روپوں کو ترستا ہوں۔ لوگ آتے ہیں بس جی اپنا کام کروا کے مٹھائی کا ڈبہ دیکر چلے جاتے ہیں۔ بس ان ہی جنجالوں میں پھنسا رہتا ہوں۔ انتظار کراؤں تو بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی بلاوے سے غیر حاضری ہو جاتی ہے۔!''
''ہاں۔۔۔'' پیر جہانگیر ہمدانی نے ایک گہری سانس لی۔ ''تمہارے معاملے میں غور کرنا ہی پڑے گا۔ ڈھیری کے بغیر بندہ بے نام و نشان رہ جاتا ہے۔۔۔!''
''حضور سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے لپک کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ''کب سے التجائیں کر رہا ہوں کہ محکمہ اوقاف والوں سے کوئی دربار الاٹ کروا دیں۔۔۔ عزت بن جائے گی۔۔۔!''
''خرچ وغیرہ بھی کر سکتے ہو، یا ہمیں بھی کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں بنا دو گے۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی مسکرائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''یہ لیجئے سرکار۔۔۔'' پیر ستارہ شناس نے ایک تھیلا ان کے سامنے الٹ دیا۔ اس میں سے سو، سو روپوں کی نئی نئی گڈیاں نکل کر ان کے سامنے ڈھیر ہوگئیں۔ ''پورے پانچ لاکھ کی نذر گزار رہا ہوں سرکار کو۔ قسم خدا کی، ساری عمر غلام بن کر ہی رہونگا۔ آپ ہی کا دیا کھا رہا ہوں۔ آئندہ بھی نمک حرامی نہیں کرونگا۔''

''اچھا۔۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کتنے مرید ہوگئے ہیں تمہارے۔۔۔؟''

''حضور دنیا کو ہزاروں ہی کہتے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ چودہ، پندرہ سو سے زیادہ نہیں ہونگے، اور وہ بھی بہت کھینچ تان کر۔''

''یہ سب ہی مرید ہیں یا سائل بھی لپیٹ لئے ہیں۔!''

''پتا نہیں۔!'' پیر ستارہ شناس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''کہتے تو خود کو ہمارا مرید اور جانثار ہی۔ لیکن کل کلاں کوئی وقت پڑا تو پلٹ کے دیکھیں گے بھی یا نہیں۔؟ یہ تو نہیں جانتے۔۔۔!''

''پھر تو سائل ہی ہوئے۔'' وہ ہنسے۔ ایک معنی خیز ہنسی۔ ''قیادت، سیادت، ولایت، ہم پر ہی سجتی ہے۔ سیدوں پہ ہی۔''

''حضور ہی سب کچھ ہیں۔!'' پیر ستارہ شناس نے ناز سے کہا۔ ''ہمیں تو بس اپنا لیجئے۔۔۔!''

''تم اپنا شجرہ ہمیں دینا۔! ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لئے کیا کیا جاسکتا ہے۔ دو چار دن بعد آؤ تو مجھ سے کسی کو بلوائیں گے۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوسکتا ہے۔ کہاں کی گدی تمہارے لئے مناسب رہے گی۔۔۔!''

''بس جی جہاں بھی رہونگا۔ سرکار کے ہی گن گاؤں گا۔'' پیر ستارہ شناس نے والہ وشیدا ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں خادم چائے وغیرہ کے لوازمات لے آئے۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے انہیں چائے پینے کا اشارہ کیا۔

اچانک سہیل اندر داخل ہوا، اور پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ چند لمحے سنتے رہے۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ سہیل تیزی سے رخصت ہوگیا۔

''لو جی پیر ستارہ شناس۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔ ''تمہاری قسمت اچھی ہے کہ محکمہ اوقاف کا ایک اہم افسر آرہا ہے۔ تمہیں اس سے ملواتے ہیں مگر ذرا لئے دیئے رکھنا۔ تاکہ تمہارے متعلق اچھا تاثر بنے۔۔۔!''

''فکر نہ کریں سرکار۔ ہم آپ کے خادم ہیں۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں شلوار قمیض اور سیاہ واسکٹ میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ وہ بھی گرم جوشی سے ملا۔

''آج اتنے دنوں کے بعد کیسے یاد کیا۔ آپ نے حمیدی صاحب۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا نیاز حاصل کرتا چلوں، پچھلے دنوں سنا تھا۔ آپ ملک سے باہر تھے۔'' مقصود حمیدی نے بتایا اور پوچھا ''درگاہ شریف کا سنائیں۔ سنا ہے کہ اس کو یونیسف والے ٹیک اوور کررہے ہیں۔''

''کہہ تو رہے ہیں۔ لیکن ہم تو صرف یہی چاہتے ہیں کہ وہ اس کی مرمت اور دیکھ بھال کا خرچ اٹھالیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ یہ گورے بڑے حسیس بنیئے ہوتے ہیں۔ پائی پائی کا حساب مانگتے رہتے ہیں۔ ان کے سوال و جواب سے خدا ہی بچائے۔۔۔!''

''بات تو ٹھیک ہے آپ کی۔ ہماری تو عادت ہی نہیں حساب کی۔ حساب دوستاں در دل کے مصداق۔ جو تیرا ہے وہ میرا ہے۔'' مقصود حمیدی ہنسا اور قہوے کا ایک گھونٹ لیا۔ جو ابھی خادم لاکر رکھ گئے تھے۔

''پھر آپ نے درگاہ حضرت میاں کا کیا کیا۔؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ ابھی خالی رکھئے گا۔۔۔'' پیر جہانگیر ہمدانی نے کہا۔ ''ہم اس کے لئے موزوں متولی کی تقرری کے لئے صلاح

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشورہ کر رہے ہیں۔!''

''جلدی کرلیں۔۔'' مقصود حمیدی نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔''میرے لئے اس کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔آپ تو جانتے ہی ہیں کہ درگاہوں کو خالی نہیں چھوڑا جاسکتا ہے۔ورنہ پھر نئے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''فکر نہ کریں ہم اس کے لئے بہت اچھا بندوبست کر رہے ہیں۔چند ہی دنوں میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''جی بہتر ہے۔'' مقصود حمیدی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔''مجھے اجازت دیجئے۔''

''کھانا کھا کر جایئے گا۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

''مجھے جلدی ہے ایک اور کام بھی ہے۔سوچتا ہوں اس کو دیکھتا جاؤں۔'' مقصود حمیدی نے اپنی عجلت کا جواز پیش کیا۔

''اچھا تو پھر ایک تحفہ لیتے جایئے۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے سہیل کو آنکھ کا اشارہ کیا۔سہیل نے جلدی سے سنہرے کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ مقصود حمیدی کو پیش کیا۔جس کو اس نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔اس تمام کاروائی کے دوران پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے ایک لحظے کے لئے بھی پیر ستارہ شناس کو توجہ دی اور نہ ہی اس کا تعارف کروانے کی زحمت کی۔

پیر ستارہ شناس نے مقصود حمیدی کے جاتے ہی پیر تھام لئے۔''سرکار اب تو کچھ کر دیں۔''

''اچھا بھئی وعدہ تو کر لیا نا تم سے، پھر کاہے کو مرے جا رہے ہو۔؟''

''بس مجھے درگاہ حضرت میاں دلوا دیں۔۔'' اس نے کہا۔

''کیا۔۔۔؟'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔''تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔اتنی بڑی درگاہ سنبھال لو گے۔؟ پھر اس کے اخراجات اور لوازمات۔۔۔!''

''بس آپ ایک بار ہاں تو کہہ دیں میں اپنی زمیں بیچ کر لے لونگا۔''

''چالیس پچاس لاکھ کا خرچا ہے۔تم کر لو گے اتنا دو چار دنوں میں۔؟''

''آپ حکم تو کریں۔میں اپنی جان پر کھیل کر یہ کر لوں گا بس آپ کی ہاں چاہیے۔''

''مجھے کیا فائدہ ہو گا۔؟'' پیر جہانگیر ہمدانی نے خالص کاروباری لہجے میں پوچھا۔

''جیسا آپ حکم کریں گے ویسا ہی ہو گا۔'' پیر ستارہ شناس نے کہا۔''میں آج بھی اور کل بھی آپ کے حکم سے کب باہر ہوں۔آپ سمجھ لیں کہ آپ ہی وہاں کے مالک و مختار ہیں۔''

''دیکھو بھائی۔۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔''شرع میں شرم کیسی۔؟ اس درگاہ کی سالانہ آمدنی دو ڈھائی کروڑ روپے ہے۔یہ سب تم کو مبارک رہے۔ہمیں تو بس ہمارا حصہ پانچ لاکھ روپے ماہانہ پہنچا دیا کرنا۔پہلے تین مہینے کے ایڈوانس پھر ہر مہینے یکم تاریخ کو،تم ساٹھ لاکھ کا بندوبست کر لو۔ایک ہفتے میں درگاہ تمہارے سپرد۔۔'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے کہا۔

پیر ستارہ شناس نے خوشی میں گردن ہلائی۔لپک کر پیر جہانگیر شاہ ہمدانی کی بلائیں لیں اور بولا۔''مجھے اجازت ہے۔میں بندوبست کر لوں۔!''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔!'' پیر جہانگیر شاہ ہمدانی نے جواب دیا۔''بڑے شوق سے۔''

پیر ستارہ شناش بے حد خوش خوش وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ہم خادم حسین کے گاؤں پہنچے۔وہ گاؤں کی بیرونی حد پر ہی ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ہم میں سے وہ صرف ڈرائیور کو ہی پہچانتا تھا۔باقی لوگوں کے نام اس کو معلوم تھے۔مگر ناموں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ساتھ چہرہ شناسی اب ہو رہی تھی۔

''بہت جلدی پہنچ گئے۔ آپ لوگ۔!'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''ایک سو چالیس سے کم کہیں بھی نہیں رہا۔۔۔!'' ڈرائیور نے فخریہ انداز میں کہا۔

''حالانکہ سرکار ہمیشہ کہتے ہیں کہ رفتار اتنی رکھو جتنی قابو میں رکھ سکو۔۔۔!'' دوسرے خادم عبدالشکور نے کہا۔ جو ہمارے ساتھ ہی آیا تھا۔ ''اتنی رفتار پر قابو قادری سرکار کی دعا سے ہی تو ہے۔!'' ڈرائیور نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''اب یہ اں باتیں ہی بناتے رہو گے یا چلو گے بھی؟'' ۔خادم حسین نے کہا۔

''چلو۔۔!'' ہم نے اس کو بھی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ذیلی سڑک سے گزر کر گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں کیا تھا۔ اچھا خاصا قصبہ تھا۔ جب گاڑی خادم حسین کے گھر پر رکی تو کئی بچے جمع ہو گئے۔

''ماسٹر جی کے مہمان آ گئے۔۔۔ مہمان آ گئے۔۔!'' جیسے کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''کیوں شور کر رہے ہو، بچو۔!'' اچانک ایک آواز بچوں کے شور پر حاوی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑی عمر کا آدمی تہبند باندھے، قمیض پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے چلا آ رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی بچوں میں خاموشی چھا گئی۔

''یہ میرے ابا جی ہیں۔۔۔!'' خادم حسین نے مجھے بتایا۔ ''غلام حسین۔۔!''

''آؤ جی بسم اللہ۔۔۔!'' غلام حسین نے قریب آ کر ہم سے گرم جوشی سے کہا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ ہم لوگ بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ''چلو جی کھانا تیار ہے۔ پہلے کھانا کھا لیں پھر باتیں کریں گے۔!''

ان دونوں باپ بیٹوں کے رویے سے قطعاً ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ ہم، کم از کم میں ان سے پہلی بار مل رہا ہوں۔ یوں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

ہم لوگ گھر میں داخل ہو گئے، سادہ سا گھر تھا۔ بڑا سا وسیع صحن، ایک جانب طویل دالان تھا۔ جس پر سرکنڈوں کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اس طویل دالان کو چار، پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر حصے میں دس، بارہ بچیں، ایک میز، کرسی، تختہ سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔ انداز بتا رہا تھا کہ یہ خادم حسین کی اپنے ہاتھوں سے تعمیر کردہ درس گاہ ہے۔ یہاں وہ بچوں کو زیورِ تعلیم سے آشنا کر رہا تھا۔ دالان کے سامنے وسیع صحن کے ایک حصے میں دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف باورچی خانہ تھا۔ جہاں چولہا بنا ہوا تھا اور اس میں سے بل کھاتا ہوا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک چودہ، پندرہ سال کی لڑکی ہنڈیا میں چمچ ہلا رہی تھی۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پاتے ہی اس نے تیزی سے اپنے سر پر دوپٹہ درست کیا اور کنکھیوں سے ہماری جانب دیکھا۔ اس کی گندمی رنگت آگ کی تپش سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں سلام کیا تو اس کے ہاتھوں کی حرکت سے فضا میں چوڑیوں کی کھنک گونجی۔ وہ مسکرائی، ایک سادہ دل آویز خیر مقدمی مسکراہٹ، جس میں محبت اور گرم جوشی تھی۔

مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ نجانے کیوں۔؟ بعض اوقات ہمیں سادگی ہمیں اپنی اور بلاتی ہے۔ مگر ہم فطرت سے دور، مصنوعی حوالوں سے زندگی پرکھتے رہتے ہیں۔ مصنوعی رویے، مصنوعی باتیں، مصنوعی خاطر داریاں، مصنوعی ذائقے۔ کچھ بھی تو اصل نہیں ہوتا۔ ہم بے اصل رہ جاتے ہیں۔

''چلو بیٹا آپ لوگ ہاتھ، منہ دھولو۔۔۔!'' اس نے ایک جانب لگے ہینڈ پمپ کی جانب اشارہ کیا۔ ہم نے اسی جانب رخ کیا۔ میں جیسے ہی ہینڈ پمپ کے پاس پہنچا، خادم حسین نے اس کے ہینڈل کو دھیرے دھیرے چلانا شروع کیا۔

''رہنے دو میں منہ دھولوں گا۔!'' میں نے کہا۔

''آپ کو عادت نہیں ہے۔ سارے کپڑوں پر چھینٹیں پڑیں گی۔'' وہ مسکرایا۔ ''ہم لوگ تو اس کے عادی ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پانی نہایت ٹھنڈا، میٹھا تھا۔ چند ہی منٹوں میں ہاتھ، منہ دھو کر فارغ ہو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آجاؤ جی دسترخوان تیار ہے۔۔!'' غلام حسین کی آواز سنائی دی۔ جو اندرونی کمرے سے آرہی تھی۔ ہم اندر چلے گئے۔ زمین پہ دری پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ دال، مرغی کا سالن، ہری مرچ کی چٹنی، روٹی، زیرے سے بگھارے چاول، روٹیاں اور ان کی سوندھی مہک، بھوک پہلے تو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لیکن تازہ روٹی کی مہک نے جیسے اچانک اشتہا بیدار کر دی۔ ہم سب دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانا شروع کر دیا۔ کھانے کے دوران خادم حسین اور غلام حسین دونوں خانقاہ کے متعلق سوالی جواب کرتے رہے۔

کھانا کھانے کے بعد اصلی دودھ پتی کی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خادم حسین نے بتایا۔ ''ادھر تو جی بڑا غضب ہو گیا۔ عبداللہ سکندر شاہ گیلانی کے جلسے میں دھماکا ہو گیا۔ جس میں سکندر شاہ گیلانی بڑے شاہ جی شہید ہو گئے۔ کئی دوسرے لوگ بھی شہید ہوئے ہیں۔ زخمی تو بے شمار ہیں۔''

''اچھا۔۔!'' مجھے حیرت ہوئی۔ ''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''کل کا جی۔'' خادم حسین نے جواب دیا۔ ''کافی چینلز پر نیوز چل رہی تھی۔ ہمارے گاؤں کے دو بندے بھی شہید ہوئے ہیں۔ تین چار زخمی بھی، مگر معمولی زخمی ہیں۔'' آج بڑے شاہ جی کا جنازہ تھا۔ بڑی دنیا آئی ہوئی تھی۔ وزیراعظم نے بھی آنا تھا۔ مگر پھر سکیوریٹی کی وجہ سے منع کر دیا گیا۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا۔؟'' میں نے خادم حسین سے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی ٹی وی تو اب لمحہ لمحہ کا حال بتا رہا ہوتا ہے۔ ابھی بھی چل رہا ہے۔ مگر ہماری صبح چھ بجے سے لائٹ گئی ہوئی ہے۔''

''چینل والوں نے تو جی بڑی اودھم مچائی ہوئی ہے۔ بڑی دور کی باتیں نکالتے ہیں۔ بعض باتیں تو بکواس لگتی ہیں۔ مگر بندہ ٹھنڈے دل سے سوچے تو ہوتا تو کچھ ضرور ہے۔!'' اس مرتبہ غلام حسین نے مداخلت کی۔

''آپ کا اس بم دھماکے کے متعلق کیا خیال ہے؟'' میں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''خلیفہ جی!'' اس نے مجھے بے حد احترام سے مخاطب کیا۔ ''میں کسان ہوں، بیج بونے کے بعد بڑے صبر سے فصل کے پھوٹنے کا انتظار کرتا ہوں۔ میلوں دور سے ہم پانی کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ میرا باپ علاقے کا بڑا مشہور کھوجی تھا۔ کھرا اٹھانے والا تھا۔'' اس نے کہنا شروع کیا اور میرے چہرے پر حیرت آمیز استفہامی تاثرات دیکھ کر مسکرایا۔ اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''کھرا اٹھانے والے تو ناپید ہو گئے ہیں۔ ورنہ پہلے جب کہیں کوئی واردات، چوری چکاری، قتل، ڈکیتی، رسہ گیری ہوتی تھی تو علاقہ پولیس اپنے مخبروں کے ساتھ ساتھ کھوجی کو لازم ساتھ رکھتی تھی۔ جو واردات کے بعد آس پاس گھوم پھر کر کھرا اٹھانا یعنی پیروں کے نشانات کے ذریعے مجرم کا کھوج لگاتا تھا۔ اس دوران بڑے دلچسپ واقعات بھی سامنے آتے تھے۔ بعض اوقات وارداتیے اپنے پیروں کے نشانات چھپانے کے لئے اُلٹے جوتے پہنتے، ایک چور نے تو اپنے سر کے اوپر بوری رکھ کر وارداتیں کی۔ تاکہ واردات کسی حاملہ خاتون کی چوری لگے۔ مگر پھر بھی پکڑے جاتے تھے۔ بعض زمین دار اپنے دشمنوں کو پھنسانے کے لئے خود ہی چوری یا ڈکیتی کی کارروائی ڈال دیتے تھے۔ کچھ سمجھے؟'' غلام حسین نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

اس کی جہاندیدہ آنکھوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ برسوں کا مشاہدہ جھلک رہا تھا۔ آدمی پڑھا لکھا یا جاہل جاننے کے فرق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے سائنس لیتے واقعات سے بے بہرہ ہو جائے تو جاہل۔ اگر سمجھے تو پڑھا لکھا۔

''تنزیل جی! یہ ڈگریاں تو کیپیاں ہیں، بھلا کیپیوں سے سمندر کھنگالا جاتا ہے یا علم پرکھا جاتا ہے؟۔ بس ایک اعتراف ہے۔ کہ جی یہ کاغذ کا ٹکڑا تمہارے اتنے برسوں کی عبادت کا ثمر ہے۔ ہیں جی؟ علم حاصل کرنا بھی تو عبادت ہی ہے''۔

میں اس کو دیکھتا رہا۔ یا اللہ۔! آدمی کیا ہے؟۔ اک معمہ ہے سمجھنے کا یا سمجھانے کا؟۔ کیا کیا بھر دیا ہے تو نے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چند بالشت کی مخلوق میں۔ کیسے کیسے سوالات، بجھارتیں، اونچے نیچے راستوں کو اندر ہی اندر کھوجتے رہنے والا یہ بے بس، جب اپنے ارادوں کو پورا کرنے پر آئے تو ایورسٹ کو بغیر آکسیجن فتح کر کے دکھا دے۔ یا ربا۔ تیرے بھید تو جانے۔

''آپ کو اس معاملے پر شک ہے۔؟'' میں نے غلام حسین کی طرف دیکھا۔

''ہم شک کیسے کر سکتے ہیں۔؟'' غلام حسین نے بڑے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''صدیوں سے ہم بڑوں کو سلام کرتے، جھکتے ان کے حکم کو مانتے اور ان سے پیار کرتے چلے آئے ہیں۔ پھر ہم کیوں شک کریں؟۔ ہمیں ان کے ہر لفظ اور ہر فعل پر یقین ہوتا ہے۔ ان پر شک کرنا تو گناہ ہے۔''

''اور حقیقت ابا۔۔؟'' خادم حسین نے پوچھا۔ ''شک کرنا تو مفروضے پر مبنی ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت تو اپنا آپ۔ آپ ہی بیان کر دیتی ہے۔''

''سچ ہے پتر۔۔!'' غلام حسین نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس سے بڑھ کر سچ کیا ہوگا کہ تو الیکشن کے لئے کھڑا ہے۔ ان کے مقابلے پر، جو اتنے بڑے، اتنی اونچائی پر کھڑے ہیں کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوپی نیچے گر جائے۔ ٹوپی نیچے گر جائے۔'' وہ ہنسا۔ ''ٹوپی نیچے گر جائے یعنی دوسرے کی عزت اچھالتے ہوئے، اس کی عیب جوئی کرتے ہوئے، اپنی عزت، اپنا آپ ہی داؤ پر لگ جائے۔''

غلام حسین نے ایک ایسی سامنے کی حقیقت کی نشان دہی کی کہ میں حیران رہ گیا۔

''پتر۔! کچھ حقیقتوں سے پردہ آپ ہی سرک جاتا ہے اس کو سیانے مکافات عمل کہتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے نا کہ، پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔ ایک یہ بھی ہے کہ آدمی اپنی اونچائی کے زعم میں۔ خود ہی سب کچھ ہونے کی فکر میں، ایسے فیصلے کرتا ہے۔ کہ وہ فیصلے نہیں بلکہ غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطیاں بچے دیتی ہیں۔ پھر ان سے غلطیوں در غلطیوں کا سلسلہ پھیل کر سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔''

''ابا کا فلسفہ بڑا عجیب ہے۔!'' خادم حسین مسکرایا اور میری طرف دیکھا۔

مجھے غلام حسین بہت اچھا لگا۔ اس کی باتوں میں وہ سب کچھ تھا۔ جس کی حقیقت اور سچائی کے لئے ہم مغرب اور وہاں کے عمرانی فلسفے کی جانب جاتے ہیں۔ ان کی موٹی موٹی کتابوں اور بڑے بڑے ناموں سے مرعوب ہوتے ہیں۔ یہاں ایسی زندہ کتابیں تہبند باندھے، حقہ گڑگڑاتے ہوئے، اُپلوں کی راکھ کریدتے جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔ مگر ہم دانش کو، فکر کو، اجتماعی شعور کو باہر سے منگوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا اُلٹے بانس بریلی کو بھیجنے کی بات۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ قادری سرکار نے ایک خط بھجوایا ہے، امام صاحبان کے نام۔۔''

''جی معلوم ہے۔!'' غلام حسین نے کہا۔ ''سرکار کا حکم تھا کہ آپ آئیں تو آپ کو تمام امام صاحبان سے ملوا دیا جائے۔''

''تو پھر اس ملاقات کا بندوبست کس طرح ہو سکتا ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''آج صبح بڑے شاہ جی کی نماز جنازہ تھی۔ اس میں کئی لوگ آئے تھے۔ شام کو مغرب کے بعد سارے اِدھر ہی آئیں گے۔ سب ہی سرکار سے پیار کرتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں جو کہ سرکار کی بات سے بال برابر بھی انحراف کرے۔''

غلام حسین نے کہا۔ اس کے لہجے میں عقیدت، محبت اور یقین کا امتزاج تھا۔

''ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ ان بڑے لوگوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دوسری طرف آپ قادری سرکار کے متعلق اس قدر پر یقین ہیں کیا یہ عجیب نہیں۔؟'' میں نے سوال کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''توبہ جی توبہ۔۔کہاں ہمارے سرکار۔اللہ میاں جی کے گھر عزت والے، پیار والے، ہمارے مرشد پاک اور کہاں دنیا کی دولت والے بڑے بڑے گھر والے، اربوں پتی، پیار سے، دین سے خالی لوگ، کاغذی گڈے۔'' اس نے اپنے دونوں گال کو ہاتھ لگایا۔توبہ کے انداز میں۔''جی قادری سرکار کا دنیاداروں سے موازنہ کرنا، مقابلہ کرنا جی گناہ ہے۔بہت بڑا گناہ۔'' اس کے لہجے میں پانی بھر گیا۔

''یا اللہ!'' میں نے دل میں کہا۔قادری سرکار کیا ہیں۔؟ سینکڑوں میل دور بھی اتنے اثر دار، اتنے خوش قسمت۔ اتنے معتبر کہ لوگ ان کے پیار کی گواہی میں آنسوؤں کی شہادت ملائیں۔

''چاچا جی۔۔۔!'' میں نے نجانے کیوں انہیں اس لقب سے پکارا۔پر وہ مجھے بہت اپنا اپنا سا لگا۔''آپ کو کیسے پتا کہ قادری سرکار اتنے بڑے مرتبے پر ہیں۔اللہ میاں کے پیارے۔؟''

''بیٹا جی۔!'' اچانک جیسے غلام حسین کی آنکھوں میں بجلی پیدا ہوگئی۔''کیوں ہمیں پھرولتے ہو؟۔آپ تو جی ان کے خلیفہ ہو۔جب خدا اپنے بندے کو چن لیتا ہے۔جب بندہ اپنے آپ کو مالک کے سپرد کر دیتا ہے۔اس کی مرضی میں ڈھل جاتا ہے۔تو پھر خدا کی رضا کا تحفہ ملتا ہے۔اور خدا کی رضا اس کی محبت ہے۔جو خدا کی طرف سے نور کی صورت بندوں کے دلوں پر نازل ہوتی ہے۔اور ہر بندہ اس بندے کو پیار کرنے لگتا ہے۔۔سمجھے خلیفہ جی۔۔!''

میں بُری طرح سٹپٹا گیا۔یہ غلام حسین کیا کہہ رہے ہیں۔میں اور خلیفہ۔وہ بھی قادری سرکار کا۔یہ یقیناً کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

''چاچا جی! میں خلیفہ نہیں میں خادم ہوں ان کا۔۔!'' میں نے کہا۔

''اچھا۔۔!'' وہ مسکرایا۔بہت پیار بھری۔بے ریا۔بے کھوٹ مسکراہٹ۔مگر جو کہہ رہی تھی، جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔

''جب بندہ خود کو اللہ والے کے سپرد کر دیتا ہے۔تو وہ کمار کے آوے پر چڑھا مٹی کا تو دا ہوتا ہے۔کمار اپنے پیروں سے آوے کو گھما تا رہتا ہے۔ہاتھوں کی حرکت سے اس مٹی کو اپنی مرضی سے مٹکا، پیالہ، صراحی کسی بھی برتن میں ڈھال لیتا ہے۔پر شرط مٹی کا ڈھلنے پر راضی ہونا ہوتا ہے۔!'' غلام حسین کی آواز سنائی دی۔جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے دن میں اجالا نہیں اندھیرا ہو۔ایسا اندھیرا جس میں ڈر، اور خوف نہیں کچھ ہونے کا امکان بھرا ہو۔میں نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔وہاں غلام حسین کے بجائے قادری سرکار بیٹھے تھے۔

''آپ یہاں۔۔؟'' میں نے بمشکل کہا۔

''ہم تو آپ کے ساتھ ساتھ ہیں ہر جگہ تنزیل میاں۔جلوت میں، خلوت میں۔!'' وہ مسکرائے۔

''لیکن۔!'' میں تشکیک کے جال میں الجھ رہا تھا۔

''لیکن کیا۔تنزیل میاں۔؟''

''یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔؟''

''آدمی کے اندر، اس کے پروگرام کو روزِ ازل سے ہی مرتب کر دیا جاتا ہے۔مگر دنیا کے جھمیلوں میں وہ پروگرام سامنے نہیں آپاتا۔تو پھر قدرت اس کو اُسی دائرے میں واپس لے جاتی ہے۔جس کے لئے اس کو تخلیق کیا گیا ہے۔''

''پھر میری تخلیق کا مقصد کیا ہے۔؟'' میں نے آرزو گی سے پوچھا۔

''تلاش۔۔۔!'' انہوں نے بلا تامل کہا۔

''میری تلاش تو ترک ہوگئی۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔''کیا ہے میرے پاس۔نہ آرزو۔نہ شوق۔نہ جذبات اور نہ کوئی دامن گیر۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ترک کی منزلوں کے بعد ہی قرب کا اجراء ہوتا ہے۔ وہ دَروا ہوتے ہیں۔ جہاں لطف اور عنایات، کیفیات کی ایک نئی دنیا ہوتی ہے۔ جہاں ہر لمحہ نیا، دلچسپ، تحیر آمیز ہوتا ہے۔ ایسا تحیر، ایسا تعلق کہ پھر کسی اور تعلق کی تمنا ہی نہیں ہوتی ہے۔ ہر سوال اپنے جواب آپ دیتا ہے۔ ہر رنگ اپنی تفہیم آپ کرتا ہے۔ ہر مرتبہ اپنے اضافے کا آپ جواز ہوتا ہے۔ ابھی تو شروع ہوا ہے سفر۔۔۔!''

''مگر مجھے مجاہدوں کا یارا نہیں۔!'' میں نے بہانہ تراشا۔

''تمہیں مجاہدوں کی کیا ضرورت۔؟'' انہوں نے کمالِ شفقت سے اپنا ہاتھ، میرے سر پر پھیرا۔'' مجاہدے مراقبے کی منزل تو یکسو ہونے کے لئے کرائی جاتی ہیں۔ تم تو یکسو ہو۔۔۔!''

''مگر کیسے۔؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اپنے آپ سے پوچھو۔'' وہ مسکرائے۔

''کیا پوچھوں۔؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''پوچھیں تنزیل میاں کیا ہوا۔؟'' کسی نے جیسے مجھے زور سے ہلایا۔ میں جیسے ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ غلام حسین، خادم حسین، ڈرائیور سب وہیں تھے۔ تو پھر میں کہاں تھا؟۔ کہاں سے ہو آیا تھا؟۔ دن روشن اور چمک دار تھا۔ پھر اچانک اندھیرا کیسے چھا گیا؟۔ یہ کیا اسرار ہے؟۔ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔۔۔!

''خلیفہ جی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔؟''۔ خادم حسین نے میرا ہاتھ چھوا۔

''ہونہہ۔۔۔!''

''ارے بیٹا تھک گئے ہیں خلیفہ جی۔۔۔ بس ذرا اونگھ آ گئی ہو گی''۔ غلام حسین نے تسلی دی۔''اندر چارپائی بچھی ہے۔ بستر لگا ہے۔ گھنٹہ، ڈیڑھ آرام کر لیں تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔''

''اچھا تو ہم چلتے ہیں۔'' عبدالشکور نے کہا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھنے لگا۔''خلیفہ جی! اگر کوئی پیغام سرکار کے لئے دینا ہے تو پھر کہیے۔''

''بس میرا اسلام کہہ دینا۔'' میں نے کہا۔

عبدالشکور ڈرائیور کے ہمراہ رخصت ہو گیا۔ میں اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ موٹی موٹی مٹی کے دیواروں والا کمرہ گرمیوں کے موسم کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ میں لیٹا تو میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ بعض اوقات ذہن کی کیفیت بے خیال ہو جاتی ہے۔ اور یہی لمحہ سب سے پیارا ہوتا ہے۔ کیا خالی پن بھی سکون کا باعث ہو سکتا ہے۔۔؟ اس سے پہلے کہ مزید سوال سامنے آتے نیند کی مہربان آغوش نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔

☆☆☆☆

ٹی وی پر سب سے مقبول نیوز چینل کا پروگرام ''سیاسی باتیں'' چل رہا تھا۔ احمد عبدالحئی اس پروگرام کا میزبان تھا۔ اس پروگرام کی ریٹنگ سب سے زیادہ تھی۔ اس لئے یہ پروگرام سب سے زیادہ اسپانسرز لیتا تھا۔ خود احمد عبدالحئی کا معاوضہ ماہانہ نہیں بلکہ فی پروگرام تھا۔ احمد عبدالحئی کا شمار ان اینکر پرسنز میں ہوتا تھا۔ جو نا صرف یہ کہ اپنی قیمت کا ادراک رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی رقم وصولی کا ہنر بھی جانتے تھے۔ وہ رقم جو ہر طرف سے اس کی سمت بھاگی چلی آتی تھی۔ بے شمار اہم سیاسی لوگ، سماجی شخصیات اس کے پروگرام میں آنے کے لئے ہر وقت نا صرف یہ کہ تیار رہتی تھیں۔ بلکہ اس کی تمام فرمائشیں بھی پوری کر دیتی تھیں۔

اس وقت اس کا پروگرام آن ائیر تھا۔ اس میں حکمران جماعت کا ایک نہایت اہم شخص سردار حیات اللہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ دو سیاسی جماعتوں کے دیگر نمائندے بھی تھے۔

احمد عبدالحئی نے سوال کیا۔''بحیثیت رولر پارٹی آپ امن و امان کے قیام میں قطعاً ناکام ہیں۔ کیا وجہ ہے۔؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

''سیدھی سی وجہ ہے۔'' دوسری سیاسی پارٹی کے کرمانی سعید نے مداخلت کی۔ ''یہ نااہل ہیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں کہ کیا ہونیوالا ہے''۔

''بالکل ٹھیک۔!'' شاہد مجید نے تائید کی۔ ''ان کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے دو خودکش حملہ آور چل پڑے ہیں۔ فلاں لوگ ان کا ممکنہ نشانہ ہیں۔ ان کو چلنے کا، نشانہ بننے والی شخصیات کا علم ہے۔ مگر اس کو روکنے کا اختیار ان کے پاس نہیں۔''

''اگر آپ لوگ مجھے بولنے دیں تو میں کچھ عرض کروں۔'' سردار حیات اللہ نے ناگواری سے کہا۔ ''سوال مجھ سے کیا جارہا ہے۔''

''اب صرف سوال ہی ہونگے۔ جواب تو آپ کو آتے نہیں۔'' کرمانی سعید نے پھر سوال کا میزائل فائر کیا۔

''ان سے صرف کمیشن کا، کرپشن کا، اقربا پروری کا، اور ملک کو تباہ کرنے کا سوال پوچھئے۔'' شاہد مجید نے بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

''کہا جاتا ہے کہ وقت تیزی سے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔'' احمد عبدالحئی نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا پارٹی الیکشن کروائے گی۔؟''

''کیوں کروائے گی الیکشن، کیا بچوں والی بات ہے۔؟'' سردار حیات اللہ نے تیزی سے کہا۔ ''کیا ہماری اقتصادی حالت، ملک بھر میں سیلاب کے متاثرین، نادرا کی طرف سے انتخابی فہرستوں کا معاملہ، امن وامان کا مسئلہ۔ یہ اتنی جلدی الیکشن کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور ویسے بھی جمہوری حکومت کو اپنی مدت پوری کرنا چاہیے۔''

اصل میں ابھی کچھ ادارے ہمارد دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔'' کرمانی سعید ہنسا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں۔'' شاہد مجید نے لقمہ دیا۔

احمد عبدالحئی نے ان کے جملوں کو نظرانداز کیا۔ اور اپنے سوالوں کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ''اگر الیکشن ہونگے تو آپ کی جانب سے وزارت عظمیٰ کا امیدوار کون ہوگا۔؟''

''کیا مطلب۔۔۔؟! یہ آپ بے وقت کے سوالات کیوں کررہے ہیں۔؟'' سردار حیات اللہ نے تیزی سے کہا۔ ''یہ تو پارٹی کی ہائی کمان کا فیصلہ ہوگا۔ میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔؟''

''لیکن خلق خدا تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔'' احمد عبدالحئی مسکرایا۔

یہ بات ایسی تھی کہ شاہد مجید، کرمانی سعید اور سردار حیات اللہ خاموشی سے، ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اسکرین پر خاموشی چھا گئی۔ چہروں پر حیرت بولتی رہی۔ تقریباً دس سیکنڈ کے وقفے کے بعد، عبدالحئی نے کہا۔ وہ دس سیکنڈ جس میں ہر ناظر کی قوت سماعت اپنی پوری شدتوں سے اس کی جانب مرکوز تھی۔ ''شاہ ہارون گیلانی کو آئندہ وزیراعظم کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔''

یہ جملہ نہیں دھماکا تھا۔ میڈیا کے تمام لوگوں کو احمد عبدالحئی کی باخبری کا علم تھا۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا بات کررہے ہیں آپ۔؟'' سردار حیات اللہ نے بری طرح گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''کس نے اڑائی یہ بے پر کی، کس کی ہے یہ بے وقت کی راگنی۔؟''

''ہمیں کیا پتا۔؟'' احمد عبدالحئی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو خلق خدا کی آواز آپ تک پہنچاتے ہیں۔''

''جھوٹ ہے۔ بالکل غلط۔'' سردار حیات اللہ نے کہا۔ مگر احمد عبدالحئی اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے ناظرین سے مخاطب ہوگیا۔ ''ناظرین آج کے پروگرام ''سیاسی باتیں'' آپ نے سنیں۔ کیسا لگا آج کا پروگرام۔؟ ہمیں اپنی رائے، مشورے سے آگاہ کرتے رہیں۔ کل پھر اسی وقت آپ کے روبرو نئی ''سیاسی باتیں'' لیکر حاضر ہونگے۔ میں شکرگزار ہوں اپنے شرکاء کا۔ انہوں نے ہمارے لئے وقت نکالا۔ اللہ حافظ''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پروگرام آف ہوگیا۔

''یہ کیا کہا آپ نے۔؟'' سردار حیات اللہ نے احمد عبدالحئی سے شدید برہمی کے عالم میں سوال کیا۔اور مائیک اتارنے والے لڑکے کو پیچھے دھکیلا۔''مجھے آتا ہے مائیک اتارنا۔تم اپنے ہاتھ مجھ سے دور رکھو'' اس نے کالر کے نیچے سے وائرلیس مائیک نکال کر لڑکے کے ہاتھ پر پٹخ دیا۔

''میں نے کیا کہا۔؟'' احمد عبدالحئی نے سادگی سے کہا۔

سردار حیات اللہ نے اچانک بے تکلفی کا رنگ اختیار کرلیا۔''تمہیں ضرور کچھ نا کچھ معلوم ہے۔تم جانتے ہو کہ میں پارٹی کا کتنا بڑا فنانسر ہوں۔پھر میری مرضی کے بغیر کچھ کیسے ہوسکتا ہے؟''۔

''جمہوریت۔۔سردار جی جمہوریت۔اب راج کرے گی خلقِ خدا'' احمد عبدالحئی نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

''جہنم میں گئی جمہوریت۔'' سردار حیات اللہ نے غصے سے کہا۔''تم مجھے رات کے کھانے پر ملو'' اور اسٹوڈیو سے باہر نکل گئے۔شاہد مجید،کرمانی سعید یہ سارا ماجرا دیکھتے رہے۔اس کے جانے کے بعد شاہد مجید نے پوچھا۔''کیا تبدیلی آرہی ہے۔؟''

''مجھے کیا پتا۔؟'' احمد عبدالحئی نے کہا۔''سیاست میں تم لوگ ہو،رہتے سمندر میں ہو اور تہہ کا حال مجھ سے پوچھتے ہو۔؟''

''ارے بڑا گہرا آدمی ہے۔'' کرمانی سعید نے کہا۔''آسانی سے نہیں بتائے گا۔''

احمد عبدالحئی مسکرایا اور گنگنانے لگا۔''وہ بات کیوں پوچھتے ہو جان من۔۔جان من۔۔۔جو بتانے کے قابل نہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ ملا کے رخصت ہوگئے۔اسی وقت احمد عبدالحئی کا فون مرتعش ہونے لگا۔اس نے بٹن پش کیا۔

''ہاں بھئی کیسے یاد کیا۔؟'' احمد عبدالحئی نے خوش دلی سے کہا۔دوسری طرف اظہر صدیقی تھا۔''آج تم نے کمال کردیا۔ان کی تو چولیں ہل گئی ہوں گی۔'' اظہر صدیقی نے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہو'' احمد عبدالحئی نے جواب دیا۔''سردار حیات اللہ نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔''

''کیا بات ہے۔!'' اظہر صدیقی ہنسا۔''سردار حیات اللہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔اگر کوئی آف دی ریکارڈ بات ہو تو مجھے بتانا۔''

احمد عبدالحئی ہنسا۔''یہ آف دی ریکارڈ بات بتانے والا جملہ خوب ہے۔''

اظہر صدیقی ہنسا۔اور فون بند کردیا۔

☆☆☆

میں سو کر اٹھا تو عصر کا وقت نکل رہا تھا۔جلدی سے وضو کر کے نماز عصر ادا کی۔اتنی دیر میں خادم حسین چائے لیکر آگیا۔''خلیفہ جی بڑی گہری نیند سوئے۔''

''پتر۔۔ذمہ داری بڑا اوزن ہوتی ہے۔'' غلام حسین نے کہا۔''بہت مشکل ہے راہ نمائی کرنا۔دوسروں کا بھار اٹھانا۔جی یہی تو ہیں کہ ہم جن پر ناز کریں گے بڑے دن۔''

''بڑے دن۔؟'' خادم حسین نے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''خادم حسین بڑا دن پچیس دسمبر نہیں،قیامت کا دن ہے۔جس کی مقدار ہمارے دن کے مطابق پچاس ہزار برس بتائی جاتی ہے۔!'' نا معلوم کیسے جملے میری زبان سے ادا ہوگئے۔مجھے خود حیرت ہوئی۔مجھے دین کا بہت زیادہ علم نہیں تھا۔مگر اس تمثیلی بات کا مفہوم جیسے یکلخت میرے قرطاس ذہن پر روشن ہوگیا۔

''تیار ہو جائیں کچھ لوگ آنے والے ہیں۔'' خادم حسین نے کہا۔''ٹھیک ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اگر کپڑے وغیرہ استری کرنا ہوں تو مجھے دیدیں لائٹ آگئی ہے۔'' خادم حسین نے کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلادی اور چائے ختم کر کے اپنے بیگ سے کپڑے نکالنے لگا۔

''کشور۔!'' خادم حسین نے آواز دی۔ چند لمحوں میں وہ نوعمر لڑکی جس کو آتے ہوئے چولہے کے پاس دیکھا اندر آ گئی۔ ''جی خلیفہ جی اسلام علیکم۔!'' اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے سلام کیا اور میرا سوٹ خادم حسین سے لیکر چلی گئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دوبارہ اندر آئی اور خادم حسین سے بولی۔ ''باجی کہہ رہی ہیں کہ جتنے سوٹ ہیں دے دیں ابھی لائٹ ہے تو سارے کر کے ہینگر کر دوں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' خادم حسین نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لائٹ جاتی ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی۔ بعض اوقات تو دس دس گھنٹے لائٹ نہیں آتی۔''

میں نے انہیں اپنے سارے کپڑے دے دیئے۔ تھوڑی دیر میں کشور نے ایک سوٹ لا کر دیدیا۔ اس میں سلیقے سے ازار بند بھی ڈالا ہوا تھا۔ کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا سب خیال رکھ رہے تھے۔ خیال کا، دھیان کا، ایک دوسرے کے ہونے کا، احساس کا، کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے چلتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم، غیر محسوس باتیں۔ جن میں نازک حساسات موجود ہوتے ہیں۔ میں نہا کر تیار ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور کسی کے باتیں کرنے، گرمجوشی سے استقبالیہ جملوں کی آوازیں گونجیں۔ چند ہی لمحوں میں غلام حسین تین آدمیوں کے ہمراہ اندر آ گئے۔ وہ تینوں سفید شلوار کرتوں میں ملبوس تھے۔ تینوں کے سروں پر سفید ظ عمامے اور ماتھے پر محراب نمایاں تھے۔

''السلام علیکم۔!'' وہ اندر داخل ہوتے ہی بولے۔

''تنزیل میاں شہر سے تشریف لائے ہیں۔''

''ماشاءاللہ۔۔۔ ماشاءاللہ۔'' انہوں نے باری باری مصافحہ کیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''تنزیل میاں قادری سرکار کی خانقاہ سے آئے ہیں۔'' غلام حسین نے سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب تو جانتے ہی ہیں کہ قادری سرکار ہم سب کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ کتنا پیار کرتے ہیں۔''

''بے شک۔۔۔ بے شک۔!'' انہوں نے تائید کی۔

''خادم حسین کو جی انہوں نے یہی لکھایا۔ پڑھایا۔ پھر انہوں نے حکم دیا کہ گاؤں کا حق زیادہ ہے۔ جاؤ وہاں لوگوں کی خدمت کرو۔ پھر انہوں نے الیکشن میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ آپ سب جانتے ہیں سرکار کا حکم تو حکم ہوتا ہے۔''

''بے شک۔۔۔ بے شک۔!'' ان لوگوں نے پھر تائید کی۔

''لیکن خادم حسین کو، یا پھر مجھے ان چیزوں کا اتنا تجربہ نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے خانقاہ سے اپنے خاص بچے، اپنے خلیفہ! تنزیل میاں کو ان معاملات کی دیکھ بھال کے لئے یہاں بھیجا ہے۔''

''خلیفہ جی۔۔۔!'' وہ تینوں اچانک یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے بیٹھ کر گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ ''قادری سرکار کے خلیفہ جی۔'' انہوں نے کہا اور میرے ہاتھوں کو تھام کے بوسے دینے لگے۔

''ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔'' میں سچ مچ بوکھلا گیا۔ مجھے ان سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ لیکن پتا نہیں قادری سرکار کا نام کیسا طلسمی اسم ہے۔ کہ ان سے جڑتے ہی عام سا بندہ خاص ہو جاتا ہے۔

''آپ لوگ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں۔ ایسا مت کیجئے۔ آپ سب بیٹھیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ ہمارے مرشد کے خلیفہ ہیں۔ تو ہمارے بھی مرشد ہی ہوئے نا۔ ہم تو جی آپ کی محبت، نظر عنایت کے طلبگار ہیں۔ مرشد کی خوشنودی جی اللہ کی رضا ہے۔ وہی تو ہمیں سوہنے نبی تک لے جائیں گے۔ جہاں اللہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

۔نجات ہے جی۔'' میں ان کو دیکھ کر رہ گیا۔ یہ اعتماد، یہ یقین، یہ بھروسہ، زندگی بدل دیتا ہے۔ آدمی کو کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیتا ہے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں معتبری کی سیڑھیاں چڑھنے لگا ہوں۔

''بس خلیفہ جی آپ تو ہمیں حکم دیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔؟''

''میں سب سے پہلے آپ کو ایک خط سنانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس خط کو سننے کے بعد ہم اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔''

''جی بہتر ہے۔!''

''میں پہلے آپ لوگوں کا تعارف کرادوں۔'' غلام حسین نے کہا۔ اور بتانے لگا۔ یہ سامنے اپنے ملک معراج دین ہیں۔ حافظ ہیں۔ جامعہ اظہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔ ان کی باتیں سنو تو بس جی بندہ سنتا ہی رہ جاتا ہے۔ دوسرے جو درمیان میں بیٹھے ہیں۔ یہ میاں محمد سلمان ہیں۔ یہ بھی بہت بڑی دینی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ حدیث وفقہ کے متبحر عالم ہیں۔ اتنی آسان باتیں کرتے ہیں۔ کہ مشکل سے مشکل مسئلہ لمحوں میں سمجھ میں آجاتا ہے۔ فن تقریر گویا ان پر ختم ہے۔ اور آخر میں مسکراتے بھائی! محمد حنیف صحرائی ہیں۔ شاعری کا شوق رکھتے ہیں۔ اردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ ایک ادبی رسالے میں کالم لکھتے ہیں۔ اور اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد، تصوف کی طرف رجحان ہوگیا۔ ایک دینی ادارے میں داخلہ لے لیا۔ بہت جلد دینی تعلیم مکمل کی۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر کمال کی کرتے ہیں۔ گویا سماں باندھ دیتے ہیں۔''

میں ان لوگوں کا تعارف جان کر دنگ رہ گیا۔ اتنے عالم، فاضل دینی اسکالر میرے ہاتھ چوم رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ میرا تعلق قادری سرکار سے ہے۔

''جی ہم کیا۔ ہماری گفتگو اور علم کیا۔ ہم نے تو جو کچھ پایا قادری سرکار کی توجہ اور محبت سے پایا۔ علوم تو وہاں ہیں۔'' میاں محمد سلمان نے انتہائی عقیدت سے کہا۔

''چلیں جی اب خط سن لیں سرکار جی کا۔'' غلام حسین نے تعارف کے مرحلے کے بعد کہا۔

میں نے ان کی باتوں سے محسوس کیا۔ کہ ان میں خط کے مندرجات کو جاننے کا خاصا تجسس ہے۔ مگر وہ اپنے شوق کو احترام کے پردے میں چھپائے ہوئے تھے۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ وہ سب نہایت اشتیاق اور تجسس سے خط سننے لگے۔ میں نے تھوڑی دیر میں خط ختم کیا۔ تو وہ گہری خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے نہایت سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے غور سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگ خط کے مندرجات اور قادری سرکار کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔؟''

''بات یہ ہے کہ اپنے خلیفہ جی! کہ ہم سب اس بات کی جرأت ہی نہیں کر سکتے کہ سرکار کی کسی رائے سے اختلاف کریں۔ جو وہ کہتے ہیں۔ اس کے متعلق وہ ہمیشہ پُر یقین ہوتے ہیں۔'' ملک معراج دین نے کہا۔

''جی اللہ کے بندے ہی تو پُر یقین ہوتے ہیں۔ پور۔۔ پور خدا کی رضا میں ڈوبے ہوئے۔'' غلام حسین نے گہری عقیدت سے کہا۔ ''اور۔۔''

اس سے پہلے کہ غلام حسین اپنا جملہ مکمل کرتا۔ دروازے پر زوردار دستکیں ہونے لگیں۔ ساتھ ہی کسی نے پکارا۔ ''خادم حسین باہر آؤ۔۔''

اسی وقت کشور اندر داخل ہوئی۔ اور بدحواسی سے بولی۔ ''ابا جی! باہر پولیس آئی کھڑی ہے۔ بہت گاڑیاں ہیں۔''

تصوف اور محبت کی اِس پراسرار دنیا کے حیرت ناک واقعات! اگلے ماہ ملاحظہ فرمایئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مختصر نمبر کی 12 جاں گداز دل نواز کہانیاں

ان کی انفرادیت ہی ان کا حسن ہے

ڈارلنگ

سید ملازم حسین شیرازی

بھیانک سچائی میں لپٹی، تیسری دنیا کا المیہ اک خوفناک کتھا

بابو لال 18/20 سال کا نوجوان تھا۔ سانولا رنگ اور اسمارٹ لڑکا تھا۔ اس کا تعلق ہندو برادری سے تھا۔ میرے دفتر میں بطور آفس بوائے کام کرتا تھا۔ ہر وقت چست اور اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔ میرا دفتر ڈیفنس فیز VI کے کمرشل ایریا میں تھا۔ صبح آٹھ بجے دفتر کھولنا، صفائی ستھرائی کرنا، میری عدم موجودگی میں فون اٹینڈ کرنا، پیغامات نوٹ کرنا اور مہمانوں، کلائنٹس کی خاطر مدارات کرنا اس کے فرائض میں شامل تھے۔ اس نے مڈل پاس کیا ہوا تھا۔ اس کا گھر کلفٹن دو تلوار کے سامنے ہندو بچی آبادی میں تھا۔

وہ دو سال سے میرے پاس کام کر رہا تھا اس نے کبھی مجھے یا دیگر اسٹاف کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ اس کے خاندان میں والد، والدہ اور بڑے بھائی تھے۔ بڑا بھائی میر پور خاص میں کسی فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ پچھلے کئی دن سے میں دیکھ رہا تھا کہ کبھی کبھی اس سے ملنے اس کی عمر کے دو تین لڑکے آتے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے۔ میں نے کبھی روک ٹوک نہ کی اور نہ ہی کسی قسم کا استفسار کیا۔ ایک دن دفتر بند کرنے سے پہلے میرے کمرے میں آیا۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتا تھا میں نے اس سے پوچھا۔

''بابو لال سب ٹھیک ہے ناں؟ کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''صاحب سب خیریت ہے۔ میں دراصل.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں ہاں کہو کیا بات ہے؟ کیا کوئی پریشانی ہے؟'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

''پریشانی تو کوئی نہیں ہے۔ میرے والدین میرے بھائی کے پاس جانا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

''تو ٹھیک ہے جاؤ! کتنے دن کی چھٹی چاہیے؟'' میں نے محبت سے کہا۔

''ہم لوگ بھائی کے پاس مستقل جا رہے ہیں۔ بھائی نے گھر لے لیا ہے اور میرے لیے نوکری کا بندوبست کر دیا ہے۔ میں نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں اور خفا نہ ہوں۔'' اس نے بالآخر ہمت کر کے سب سے بڑا مسئلہ بیان کر ہی دیا۔ ''نہیں بابو اگر تمہیں اچھا چانس مل رہا ہے تمہارے والدین خوش ہیں تو کوئی بات نہیں۔ تم جب چاہو نوکری چھوڑ سکتے ہو۔'' میں نے بھی جی کڑا کر کے اسے اجازت دے ہی دی۔ میں دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اسے آفس چھوڑنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

''صاحب جی آپ نے میرا خیال رکھا، بچوں کی طرح میری دیکھ بھال کی۔''

''نہیں بابو! تم خود اچھے تھے۔ اپنی تیاری کرو۔'' میں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے دو ماہ کی تنخواہ برابر رقم دی کہ وہ اپنے لیے شاپنگ کرے اور پھر وہ دو دن بعد چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد دوسرے لڑکے کا بندوبست ہو گیا تھا۔

☆.....☆

ایک سال بعد میں کلفٹن سے صدر مین روڈ سے جا رہا تھا۔ تین تلوار کے قریب مڈ ایسٹ اسپتال کے آگے بابو لال کو دیکھا۔ وہ کمزور سا لگ رہا تھا۔ نیلی جینز اور آسمانی کلر کی شرٹ پہنے تھا۔ ایک ہنڈا ایکارڈ گاڑی رکی تھی اس میں ایک بزرگ گاڑی رو کے بابو سے بات کر رہا تھا۔ بابو اس کے آگے سر ہلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بابو اس گاڑی میں بیٹھ گیا اور وہ چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ بابو تو میرپور گیا تھا۔ کیا وہ واپس آ گیا ہے؟ یہ صاحب کون تھے؟ کیا بابو ان کے پاس نوکری کرتا ہے اگر کراچی میں تھا تو ملنے کیوں نہ آیا؟ بہر حال اس کی مرضی میں نے معمول کے مطابق بات سمجھی اور اپنی راہ لی۔

کچھ دنوں بعد میں اسی روڈ پر جا رہا تھا کہ دوبارہ ہی سین تھا۔ زمزمہ بلے وارڈ جہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے کارنر پر ٹویوٹا گاڑی میں بیٹھے کوئی اور صاحب سے بابو بات کر رہا تھا۔ بابو کریم کلر کی پینٹ کے ساتھ میچ کرتی شرٹ پہنے تھا۔ گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا۔

میں تشویش میں مبتلا ہوا۔ تجسس پیدا ہوا کہ آخر کیا وجہ ہے گاڑی رکتی ہے مختصر بات ہوتی ہے اور پھر چل سو چل۔ ماجرا کیا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کی پوری معلومات کروں گا۔

☆.....☆

ایک دن صبح گیارہ بجے میں بابو سے ملنے اس کے گھر گیا۔ فریئر تھانے کے سامنے پچی آبادی میں وہ رہتا تھا۔ مین روڈ پر پان کی دکان تھی اس سے بابو کے گھر کا پوچھا۔ پان والے نے بڑی عجیب نظروں سے نگاہ ڈالی۔ اشارہ کیا کہ سامنے نالے کو کراس کر کے دوسری گلی میں پہلا مکان ہے۔ پھر خود وہیں کھڑے لڑکے سے کہا کہ وہ بابو کو بلا لائے۔ میں نے اس سے پان، سگریٹ لیے تھوڑی دیر بعد بابو لال آ گیا۔ بہت کمزور، لاغر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ دوڑتا ہوا آیا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''صاحب جی آپ کیسے ہیں؟ یہاں کہاں؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''بابو میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ کوئی بات کرنی ہے۔
گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے دروازہ کھولا اور وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ بہت پریشان و کنفیوز تھا۔ میں اسے بوٹ بیسن لے گیا اور پھر ہم ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

''بابو لال تم تو میر پور گئے تھے۔ کیا واپس آ گئے ہو؟'' میں نے اسے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا۔

''صاحب جی! ہم لوگ شفٹ ہو گئے تھے۔ تین چار ماہ وہیں رہے پھر بھائی کا ویزہ آ گیا۔ وہ بحرین چلا گیا اور ہم واپس کراچی لوٹ آئے۔ (بعد میں پتا چلا کہ اس نے غلط بیانی کی تھی) وہ نہیں بھی نہیں گیا۔

''پھر تم نے دفتر کا چکر کیوں نہیں لگایا؟ یہاں کب سے ہو؟''

''میں چھ ماہ سے یہاں ہوں اور.....'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم آج کل کیا کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں دو دفعہ کلفٹن مین روڈ پر دیکھا۔ تم ہر بار گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ وہ کون تھے؟ اور تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' میں نے تفتیش کرتے لہجے میں کہا۔

''صاحب جی! آپ بہت مہربان ہیں۔ مجھے بچوں کی طرح رکھا۔ میری بہت دیکھ بھال کی میں نے ہمیشہ آپ کو دل سے یاد کیا۔ میں آپ کے آگے جھوٹ نہ بولوں گا۔ سچ بتاؤں گا کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ صاحب جی یہ گاڑی والے صاحب ڈیفنس، کلفٹن اور دیگر پوش علاقوں کے مقیم ہیں۔ ملوں فیکٹریوں اور کمپنیوں کے مالکان ہیں۔ ان کی اعلیٰ رہائشیں ہیں۔ بہت دولت مند اور امیر کبیر ہیں۔ ان کا المیہ یہ ہے (میں سب کی بات نہیں کر رہا ہوں یہاں معزز اور اشراف لوگ بھی رہتے ہیں۔ صرف چند لوگوں کی بات کر رہا ہوں) کہ انہوں نے جوان، خوب صورت اپنی عمر سے کافی چھوٹی لڑکیوں سے شادی کر رکھی ہے جنہیں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ ان کی بیویوں کے پاس دنیا بھر کی ہر شے موجود ہے لیکن ''مند بڑھاپے اور دیگر وجوہات کی بنا پر ازدواجی آسودگی فراہم کرنے میں ناکام ہیں۔ دن رات روپے، پیسے کے چکر میں سرگرداں ہیں، جس کی وجہ سے ہر وقت لڑائی جھگڑے اور مختلف قسم کے فتنوں کا شکار رہتے ہیں۔ اپنی بیویوں کی خاطر ہم جیسے اسمارٹ، بے روزگار نوجوانوں سے رابطہ کرتے ہیں، سودا بازی کر کے بعض اوقات آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر بھی سیٹوں کے نیچے چھپا کر رات کے اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اپنی کوٹھیوں میں لے جاتے ہیں جہاں ان کی ہوس زدہ منتظر بیویاں نوچنے اور ادھیڑنے کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہیں۔ ہزار پانچ سو کے عوض خود سب کچھ بغور چشم تماشا دیکھتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں، غیرت، شرم، عزت، حیا کے چولے اتار کر معزز دکھائی دینے والے یہ بے غیرت شیطان کے چیلے بن جاتے ہیں۔ دن کے اجالے میں شرافت، عزت، وقار کا درس دینے والے اتنے بے حیا بن جاتے ہیں کہ انسانیت بھی منہ چھپا لیتی ہے۔ صاحب جی میرے دوستوں نے مجھے یہ عیاش پرور راہ دکھائی تھی وہ خود تو مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر اسپتالوں میں آخری ہچکیاں لے رہے ہیں اور ہمیں تباہی کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیا ہے۔

صاحب جی میں آپ کے پاس آنا چاہتا تھا لیکن اپنی بیماری کے پیش نظر آپ سے سامنا کرنا اچھا نہ لگتا تھا۔ صاحب آپ کچھ کریں ورنہ نوجوان نسل تباہ ہو جائے گی۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر، صاحبان، علماء کرام، این جی اوز اس طرف توجہ دیں انسانیت کی تضحیک ہو رہی ہے۔ سفید چادر کی اوٹ میں شرافت داغدار ہو رہی ہے۔ غربت مٹانے والے یہ بڑے لوگ غربت کو نہیں بلکہ غریبوں کو مار رہے ہیں۔ صاحب، ان کی بیویوں کے پاس ایسی دوائیاں اور دیگر مہلک اشیاء ہیں کہ چند لمحوں کی تسکین کی خاطر دوسروں کی زندگیوں کو ویران کر دیتے ہیں۔ میں ساری رات سو نہیں سکا۔ کھانستا رہتا ہوں۔ خون کی الٹیاں کرتا ہوں، میرے بوڑھے والدین بے بسی کی چادر اوڑھ کر حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ سونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نیند کی دیوی روٹھی رہتی ہے۔ یہ ہمارا کاروبار دھندہ ہے جس سے چند روپوں کی خاطر ہم پھنس چکے ہیں نکلنا ناممکن ہے۔ اذیت ناک موت منہ پھاڑے ہماری طرف روانہ ہے۔ انتظار میں ہیں کہ کب یہ دنیا چھوڑنی پڑے۔''

بابو لال کی باتیں سن کر میں خود چکرا گیا تھا۔ آج کی نئی نسل کہاں جا رہی ہے۔ ہم کتنے بے حس ہو گئے ہیں اپنے آپ کو انسان کہلانے والے درندوں سے بھی بدتر ہیں۔

ایک بابو لال کا شاید میں علاج کرا سکوں لیکن اردگرد پھیلے ان گدھوں سے نئی نسل کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

دوسری منفرد کہانی

کمی کہاں رہ گئی

عظمیٰ شکور

دل میں درد جگاتی، ایک ماں کی حقیقت بیانی

زندگی نے بہت سے دکھ جھولی میں ڈالے، ہنستی رہی صبر کرتی رہی کہ اچھے دن آئیں گے مگر شاید سکھ بھی نصیبوں سے ملتے ہیں۔

ان ہاتھوں کی لکیروں میں خوشی رقم ہی نہیں شاید کہ خوشی نصیب بنتی۔

ماں کی جلد موت نے دنیا میں تنہا کر دیا اور جب بڑی ہوئی تو باپ کو فکر لاحق ہوئی کہ زمانے کی نگاہوں سے مجھے کیسے بچائیں گے سو بیاہ دی گئی، مطلب ایک گھر سے دوسرے گھر روانہ کر دی گئی۔

مگر!

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

وہ گھر تو ساس صاحبہ کا تھا۔ اب زیادتیوں کا نیا دور شروع ہوا تھا بلکہ قربانیوں کا وقت آیا، سب سننا مگر لب پر حرف شکایت نہ لانا۔ نندوں کی زیادتیاں، ساس کی بے اعتنائیاں سب برداشت کیں۔

اب ایک نیا مسئلہ زندگی بنا رہی تھی۔ شادی کے سال گزر جانے کے بعد میں اولاد کی خوشی سے اب تک محروم تھی، بہت دعائیں کیں۔ سجدے کیے اس کی بارگاہ میں اور شاید اس ذات کو مجھ پر ترس آ گیا اور میں امید سے ہوئی مجھ سے ڈیل تو میاں صاحب خوش تھے وہ بھی اللہ کا انعام تھے نہایت ہی اچھے انسان مگر کبھی کبھی اپنی والدہ کی باتوں میں آ کر غصہ کر جاتے مگر دل کے بہت اچھے۔ بہت خیال رکھتے تھے میرا، اللہ اللہ کر کے وقت کٹا۔ تو میری گود میں اللہ نے بیٹا دیا۔ اللہ نے اتنی بڑی نعمت عطا کی میں تو اس قابل نہیں تھی۔ خوشی کے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ میں اپنی قسمت پر حیران تھی۔

ان دنوں اباجی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی میں ان سے ملنے بھی گئی تھی مگر پھر بھی بے چین تھی۔ میں ان کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر ساس صاحبہ کو قبول نہ تھا یہ سب۔ میاں صاحب بھی چپ تھے۔

گزرتا وقت میرے والد کو بھی لے گیا اور میں جیسے ڈھے سی گئی۔ گود میں مصطفیٰ کو دیکھ کر بس چپ سی ہو جاتی کہ جیسے مصطفیٰ میرے سب دکھ دور کر دے گا۔

جب میرا مصطفیٰ بڑا ہو گا تو زندگی بہت آسان ہو جائے گی بس خوشیاں ہی ہوں گی میں اپنی ہی سوچوں پر مسکرا جاتی مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب مصطفیٰ نے مجھے پہلی بار ماں بولا تھا، میں تو جیسے مکمل ہو گئی تھی جیسے میں اپنی قسمت پر شاداں تھی اور پھر وہ ننھی ننھی باتیں کرنے لگا تھا۔

ساس صاحبہ کے وہی پرانے حالات تھے۔ جیسے وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

تو کیا اب اس گھر سے مجھے جانا ہو گا نہ اباجی کا گھر میرا تھا اور نہ ہی یہ گھر میرا ہے۔ دو آنسو چپ چاپ آنکھوں سے بہہ کر گالوں سے پھسل گئے۔

مگر مصطفیٰ پر نظر پڑتے ہی جیسے میں ایک لمحے کو میں سب دکھ بھول گئی تھی۔ یہ ہے نا! میری خوشی! دل نے اندر سرگوشی کی تھی اور میں مسرور ہو گئی تھی۔ دل میں جیسے اطمینان اترا تھا اور آنکھیں تشکر سے جھک گئی تھیں۔

آج تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مصطفیٰ دیوار کو پکڑ کر کھڑا ہوا تھا اس کے کانپتے پیروں کو میں نے ہتھیلیوں کا سہارا دیا تھا اور اسے گرنے سے بچایا تھا۔ وہ دھم سے میری گود میں آ گیا تھا اور چھپ گیا تھا جیسے زمین پر قدم ٹکانا بہت مشکل کام ہو، میاں صاحب ان لمحات کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے ماں بیٹے کی انمول محبت دیکھ دیکھ کر حیران تھے۔

میں نے تھوڑے پیسوں کی شیرینی بانٹی تھی کہ میرا بیٹا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ میرا انگ انگ خوش تھا میرا بیٹا ہی مجھے دنیا کے جھمیلوں میں بہت اپنا لگتا تھا۔

دن خوب صورت تھے مگر ساس کی لڑائیوں کا تڑکہ لگا رہتا، میاں صاحب اس گھر سے نکلنا نہ چاہتے تھے کہ حالات ہی اجازت نہ دیتے تھے۔

آج میاں صاحب کی چھٹی تھی مگر مجھے اس قدر مصروف دیکھ کر وہ جھنجھلائے جا رہے تھے۔ مصطفیٰ نے دانت کیا نکالا جیسے شادیانے بج اٹھے ہوں میری زندگی میں میں نے چنے کا پلاؤ بنا کر گلی کے بچوں کو کھلایا تھا خوشی میں۔

کبھی کبھی تو میاں صاحب بھی مصطفیٰ سے جلنے لگتے تھے کہ بیگم صاحبہ ہم تو آپ کو نظر ہی نہیں آتے اور میں ان کی باتیں سن کر جھینپ جاتی۔

میری تو جان بسی تھی مصطفیٰ میں، پتا نہیں وہ بے حد حسین تھا یا میری ہی نظروں میں محبت کے سمندر تھے کہ وہ سب سے الگ دکھتا تھا۔

☆.....☆

آج تو میرے لیے قیامت کا دن تھا۔ مصطفیٰ کو بخار آ گیا تھا اور میں یوں تڑپ رہی تھی جیسے میرے بدن میں جگہ جگہ درد اٹھ رہے ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے کہ جب اس کے تپتے وجود پر رکھتی۔

میاں صاحب ڈاکٹر کے پاس تو لے گئے تھے مگر میرے دل کو قرار نہ تھا۔ میں نے صبح ہی صدقہ دیا تھا کہ میرے بیٹے سے بلائیں دور ہوں۔ میری روح جیسے بے چین تھی اور یہ دو دن میں نے قیامت سے گزارے تھے کہ پل پل مصطفیٰ کی حالت مجھے مارے دے رہی تھی، میاں صاحب مصطفیٰ کو بھول کر میری فکر میں گھلے جا رہے تھے، کہتے اللہ کی بندی خود کی بھی فکر کر..... کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

اور میں جھٹ سے ان کے سینے سے لگ گئی تھی اور زار زار

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

روئی تھی کہ آپ نہیں جانتے مصطفیٰ میں میری جان بسی ہے، مجھے کیسے قرار آئے میں کیا کروں۔"

اور جب مصطفیٰ کو بخار نے چھوڑا تھا میں نے جھٹ سے چاول بنا کر بچوں کو کھلائے تھے اور نوافل شکرانہ پڑھے تھے، روزہ رکھا تھا کہ شکر میرے بیٹے کو اللہ نے شفا دی۔

ساس صاحبہ دیور کی شادی کے چکروں میں تھیں اور بڑے بیٹے کو گھر سے نکالنے کے منصوبے پر عمل کر رہی تھیں اور وہ کامیاب بھی ہوگئی تھیں۔

اور میں ایک بار پھر ایک دوسرے سے تیسرے گھر آگئی تھی۔ میاں صاحب نے کرائے پر دو کمروں کا گھر لیا تھا دل پر جیسے ایک چوٹ سی لگی تھی۔

مگر میں نے چپ سادھ لی تھی مصطفیٰ کو دیکھ کر سب دکھ بھول جاتی تھی میں کہ میرا بیٹا ایک دن بڑا ہو کر سب ٹھیک کردے گا اور مجھے یقین تھا ایسا ہی ہوگا بس۔

وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن تھا کہ جب مصطفیٰ پہلے دن اسکول گیا تھا، میرے تو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

میاں صاحب دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہے تھے کہ یہ عورت اولاد کی محبت میں کس قدر پاگل ہے۔

رفتہ رفتہ گزرتا وقت مصطفیٰ کو ترقی دے رہا تھا اور اس کا اس قدر انہماک سے پڑھنا مجھے ایک لمحے کو حیران کر دیتا۔ اپنا اسکول بیگ کو تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا بہت محنت سے ہوم ورک کرتا اور جب اس نے اپنی کلاس میں اول پوزیشن لی تھی، اف..... مجھے لگا تھا جیسے مجھ سے خوش قسمت کوئی ماں نہیں ہوگی دنیا میں۔ میں فخر سے تنی کھڑی تھی۔

میاں صاحب ہنستے۔ "بھلی لوگ مجھے تو لگتا ہے جیسے تمہارا بیٹا منسٹر لگ گیا ہے جو یوں خوشی سے اڑتی پھرتی ہو۔"

ان کے یوں کہنے پر میں یوں دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

میں پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگی تھی مصطفیٰ کا۔ اسے یوں چھپا چھپا کر رکھتی کہ جیسے اسے گرم ہوا نہ چھو جائے جیسے اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

☆.....☆

ڈوبتا اگتا سورج بہت سے ماہ سال پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

مصطفیٰ نے جب بی۔اے بہت اچھے نمبروں میں پاس کیا تو جیسے یہ میری کامیابی تھی۔

میاں صاحب نے مصطفیٰ کو گورنمنٹ جاب دلا دی تھی۔

اب تو نظریں ایک ہی سپنا بنا تیں کی بیٹے کے سر ہر سہرا سجادوں جبکہ میاں صاحب ابھی اس حق میں نہیں تھے۔ مگر میرے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔

اپنی بہو کو ڈھونڈ لیا تھا میں نے۔ اونچے قد کی گوری چٹی صباحت مجھے پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی، بس پھر کیا تھا، میں نے اور میاں صاحب نے بات پکی کر دی۔

مصطفیٰ نے میری خوشی میں سر خم کیا تھا۔

اور چند مہینوں میں ہی صباحت ہمارے آنگن میں خوشبو بن کر اتری۔

دن خوب صورت ہو گئے تھے جیسے سب کچھ امید کے مطابق ہو رہا تھا۔ میں جیسے خود کو ہلکی محسوس کر رہی تھی، یہ شاید خوشی کا احساس تھا جو رگ و پے میں اتر کر سکون کا باعث بنا تھا۔

اور اللہ پاک نے مجھے وہ دن بھی دکھایا کہ جب میرے مصطفیٰ کے ہاں پہلی اولاد بیٹے نے جنم لیا تھا، اس وقت وہ حالت تھی کہ بس..... آنسو تواتر سے سجدہ ریز تھے خدا کے حضور میں اس کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا، اللہ جی مجھ ناچیز کو اتنا نواز دیا میری تو کوئی اوقات نہیں۔

میں واقعی خوش قسمت تھی۔

مگر شاید.....!

خوشیوں کی عمر تھوڑی ہوتی ہے۔

شاید..... خوشیاں بھی زوال پذیر ہیں۔

میرے لیے اتنی ہی خوشیاں تھیں۔

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی کہ جب میرے مصطفیٰ نے آکر میرے سامنے بنا سمجھے یہ کہا تھا۔

"امی جی صباحت الگ گھر چاہتی ہے اور میں اس کی یہ خوشی رد نہیں کر سکتا اس لیے مجھے اب جانا ہوگا۔ صباحت کو پورا حق ہے کہ وہ اپنی خوشی کی زندگی گزار سکے۔"

"مگر بیٹا....." لفظ جیسے زبان کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

وہ اپنا فیصلہ سنا گیا تھا اور میں اپنی ہی ذات کے کٹہرے میں خود سے ہی سوال کر رہی تھی کہ..... مجھ سے کہاں بھول ہوگئی اس کی پرورش میں..... مجھ سے کہاں کمی رہ گئی اس کی تربیت میں، میں نے تو اسے محبت میں گوندھ گوندھ کر پالا تھا۔

اللہ یہ سب کیا ہے۔

میں نے سر تھام لیا تھا اور وہیں ڈھے گئی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیسری منفرد کہانی

اصل پریشانی

سعدیہ سیٹھی

آج کے جدید چوروں اور چوری کا سدِ باب لیے چشم کشا تحریر، لندن سے

فون پر آنے والی یہ کوئی چوتھی کال تھی جسے میں نے تنگ آ کر اُٹھا لیا تھا اور بند آنکھوں سے ہی فون اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔ اپنی نیند خراب ہونے پر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا۔ دوسری طرف کولیگ تھا جو مجھ سے بھی زیادہ اکتایا ہوا بولا تھا۔

''یار یہ ٹمپر سوئچ کیسے لگتا ہے اور اس کی پروگرامنگ کیا ہے اور ساتھ ہی بولا یار یہ کس عذاب میں ڈال دیا ہے کمپنی نے۔ ان کو بیٹھے بٹھائے نئی نئی ترکیبیں سوجھتی رہتی ہیں ہمیں پریشان کرنے کی۔''

میں نے اس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے نیند بہت زیادہ آ رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے مطلب کی بات اس کو سمجھائی اور موبائل کو پھینکنے والے انداز میں ایک طرف رکھ دیا اور کمبل کھینچ کر پھر سو گیا۔ ابھی سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ موبائل نے ایک بار پھر سے اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔

جسے میں نے ایک بار پھر غصے سے اٹھایا تو دوسری طرف پھر وہی سوال تھا لیکن اس بار بندہ کوئی اور تھا۔ اس کا مسئلہ حل کرنے تک میری نیند کسی گہری کھائی میں جا سوئی تھی۔

''میں آپ لوگوں سے اپنا تعارف کروا دوں۔ میں ایک سیکیورٹی کمپنی میں بطور ٹیکنیشن جاب کرتا ہوں۔ ہماری کمپنی بینکوں اور بنگلوز کو سیکیورٹی سسٹم فراہم کرتی ہے۔ حال ہی میں ہونے والی چوری نے ٹیکنیشنز کا بہت سارا کام بڑھا دیا تھا۔ جس سے تقریباً سارے ہی تنگ آ گئے تھے۔

کچھ نئے قسم کے sensors آئے تھے جن کی کچھ ٹیکنیشنز کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان کو کیسے لگایا جاتا ہے اور ان کو کیا پروگرامنگ دینی ہے اور جو سسٹم کے پینل اوپن لگے ہوئے ہیں یا IT ہوئے ہیں ان کو Volt Room کے اندر منتقل کرنا تھا جو کافی محنت طلب کام تھا۔

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ ایک صبح میں سو رہا تھا اور موبائل کے شور مچانے پر اٹھا تھا۔ اسکرین پر نمبر دیکھا تو باس کا تھا میں نے جیسے ہی فون اٹھا کر کان کو لگایا باس بڑے تشویش بھرے لہجے میں بولے تھے۔ ''یار مسئلہ ہو گیا۔ فلاں بینک میں چوری ہو گئی ہے اور ہمارے سسٹم نے کام نہیں کیا۔'' باس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے بینک کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا۔ ''تم جتنی جلدی ہو سکے بینک میں پہنچو اور موقع دیکھ کر رپورٹ کرو۔''

میری نیند ایک دم سے اڑ گئی اور میں جلدی سے تیار ہو کر بینک پہنچ گیا۔ راستے میں یہی سوچ رہا تھا کہ آخر ہمارا سسٹم ناکام ہوا تو ہوا کیسے۔

میں جیسے ہی بینک کے اندر داخل ہوا۔ بہت سارے لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور طرح طرح کی باتیں سنانے لگے اور سب کے سب غصے اور ٹینشن میں تھے۔

میں نے ان کی باتوں کا اثر نہ لیتے ہوئے کی پیڈ کی طرف آیا جس میں پاور ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آ کر منیجر کو بتایا اور اس کو ساتھ لے کر IT روم کی طرف آیا جہاں سسٹم کا کنٹرول پینل لگا ہوا تھا۔ اس کو کھول کر دیکھا تو اس کی پاور اور بیٹری کی وائر کٹی ہوئی تھی۔

میں IT روم سے باہر آ گیا اور آپریشن منیجر کو صورتحال بتائی اور ان سے پوچھا کہ ''کیمروں والا کوئی آیا نہیں تا کہ پتا چل سکے کہ آخر ہوا کیا اور کیسے ہوئی یہ چوری۔ اور اندر موجود گارڈ بھی غائب ہے۔ ایک جگہ کافی خون تھا جو جم چکا تھا اور اس کی لکیریں ATM کے دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ زیادہ تر کا خیال تھا کہ گارڈ کی ہاتھا پائی ہوئی ہے چوروں کے ساتھ اور ان کا کوئی ساتھی مارا گیا ہے اور وہ گارڈ کو بھی ساتھ لے گئے ہیں، کچھ کا خیال تھا کہ گارڈ مارا گیا ہے اور وہ اس کو ساتھ لے گئے ہیں۔ مطلب بہت سوں کے بہت سے خیال تھے۔

میں نے بینک کا پورا راؤنڈ کیا تھا۔ کیش روم بند تھا اس کو توڑا نہیں گیا تھا بلکہ لاکر روم کو توڑا گیا تھا اور اندر موجود تمام کے تمام لاکر کاٹ کر ان کا سامان غائب تھا اور پھر ایک جگہ پر کافی سارا خون پھیلا ہوا تھا جو جم چکا تھا۔

ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنی دیر میں کیمروں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

والا اندر داخل ہوا اور اب آپریشن منیجر بات کرنے لگا تھا اور میں بھی چلتے ہوئے ان کے قریب چلا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر چور اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے، ہر طرح کی احتیاط کرنے کے باوجود۔ اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا تھا ورنہ ہمیں کبھی بھی پتا نہ چلتا کہ رات کیا ہوا اور کیسے، ہوا۔

ہر بینک میں دو DVR ہوتے ہیں۔ مطلب کہ جس میں کیمروں کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ ایک DVR آئی ٹی روم یا کسی بھی دوسری جگہ رکھا ہوتا ہے اور دوسرا DVR چھپا کر رکھا ہوتا ہے جس کے بارے میں بعض اوقات بینک والے بھی نہیں جانتے جو DVR سامنے ہوتا ہے وہ ڈمی کے طور پر ہوتا ہے۔

جبکہ اصل DVR چھپا کر رکھا ہوتا ہے جس میں ریکارڈنگ ہو رہی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں آپریشن منیجر اور منیجر کو ہی معلوم ہوتا ہے اور ایسا ہی یہاں ہوا تھا۔ چور جاتے ہوئے DVR بھی ساتھ لے گئے اور وہ ڈمی DVR ساتھ لے گئے تھے جو صرف دھوکا دینے کے لیے رکھا ہوتا ہے۔

کیمروں والے لڑکے نے ریکارڈنگ نکال لی تھی اور play کردی اور ہم دیکھنے لگے۔ ساڑھے آٹھ کے قریب جب سارا اسٹاف چلا گیا تو گارڈ نے ایک کال کی اور پھر آدھے گھنٹے بعد ATM کے اندر کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی سے دو گیس سلنڈر لے کر اندر رکھ لیے تھے اور پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا تھا اور پھر ایک بجے کے قریب ایک بار پھر گارڈ نے فون کان کو لگایا اور پھر پندرہ منٹ بعد ایک ایک کر کے تین بندے اندر داخل ہوئے۔ ATM کے دروازے کے ذریعے سے اور پھر گارڈ IT روم میں داخل ہوا اور ہمارا سسٹم کھول کر اس کی پاور کی وائر کاٹ دی تھیں۔

اب وہ بے فکر ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے سلنڈر کے ذریعے سے لاکر روم کا دروازہ کاٹنا شروع کیا اور ایک گھنٹے کی محنت کے بعد دروازہ کاٹ دیا اور پھر ایک ایک کر کر لاکر روم کے اندر داخل ہوتے گئے اور ایک کے بعد ایک لاکر توڑتے گئے اور تھیلے بھرتے گئے۔ دو گھنٹوں میں انہوں نے تمام کے تمام لاکرز توڑ دیے تھے اور پانچ تھیلے بھر لیے تھے۔

اس کے بعد گارڈ نے IT روم سے DVR اتار لیا اور ایک آدمی نے خون کی ایک تھیلی نکالی اور ایک جگہ پر گرانا شروع کر دیا اور باقی دو سامان کو اِدھر اُدھر پھینکنے والے اسٹائل میں رکھنے لگے جیسے لڑتے ہوئے سامان بکھر گیا ہو اور پھر تھوڑی دیر میں ایک گاڑی باہر آکر رکی۔ اور سب بھاگنے والے انداز میں خون پھیلایا تھا اس نے خون کی تھیلی پکڑی اور ATM کے دروازے تک آیا اور پھر خون کی تھیلی رول کی اور باہر نکل گیا۔ پھر گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے۔

ریکارڈنگ پولیس کے حوالے کر دی گئی تھی۔ جب تک کارروائی شروع ہوئی چور کہاں کے کہاں پہنچ چکے تھے۔ چوروں کے ہاتھ بہت بھاری مال لگا تھا۔ جس میں سونا، بانڈز اور ڈالر شامل تھے۔ جبکہ اگر وہ کیش روم توڑتے تو ان کو چند لاکھ ہی ملتے کیونکہ سارے دن کا کیش شام کو مین برانچ میں جمع کروا دیا جاتا ہے۔

اس چوری میں بے شک گارڈ شامل تھا لیکن پھر بھی ہمارے سسٹم کی کمزوری شامل تھی کہیں نہ کہیں۔ جس کو کمپنی نے بہت جلد دور کرنا شروع کر دیا تھا اور ہر طرف sensors لگانے شروع کر دیے تھے۔ IT روم کے اندر پینل کے اندر اور ان تمام جگہوں پر جہاں کہیں ہلکی سی بھی کمزوری نظر آرہی تھی اور جن کے آئی ٹی محفوظ نہیں ان کے پینل کیش روم کے اندر منتقل کرنے شروع کر دیے تھے اور یہی پریشانی سب کو تنگ کیے ہوئے تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

چوتھی منفرد کہانی

فرح انیس

مختصر نمبر کی ایک خاص کہانی، جس کا انجام آپ کو چونکنے پر مجبور کر دے گا

آفس سے گھر آتے ہوئے میں جوں ہی گلی میں داخل ہوا وہ مجھے اپنے گھر کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے نظر آئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی میں نے والٹ سے دس روپے نکال کر اس کو دیے جس پر کانپتے لبوں سے مجھے دعائیں دیتے ہوئے خوشی سے روتے ہوئے اس دس روپے کے نوٹ کو چومنے لگی۔ مجھے اس فقیرنی پر بڑا رحم آیا کرتا تھا۔ اکثر ہمارے گھر کے آگے بیٹھی پائی جاتی۔ نہایت خستہ حال، بدرنگ ہوئے کپڑے، بالوں کو بھی نجانے کب سے کنگھا نہیں کیا گیا۔ پپڑی ہوئے گال

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی اس کی حالت دیکھ کر بے انتہا ترس آتا تھا۔ محلے والے اس کو کچھ کھانے پینے کو دے دیا کرتے تھے پر اس فقیرنی کو میں نے کبھی پوری روٹی بھی کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس کی بھوک جیسے ختم ہوگئی۔ اس نے بتایا تھا اس کی دو جوان بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے پر وہ لوگ اس کا ساتھ نہیں دیتے گھر پر پڑے رہتے ہیں۔ جو بھی پیسے ملتے ہیں وہ جمع کر کے اپنے بچوں کے لیے دال روٹی کا بندوبست کرتی ہے۔ مجھے اس فقیرنی کی اولاد کی بے حسی پر غصہ اور افسوس ہوتا تھا کہ کیسی اولاد ہے ماں کو اس بڑھاپے میں یوں تکلیف دی ہوئی ہے اور ماں پھر بھی اپنی اولاد کے خاطر کس طرح سے پیسے جمع کرتی ہے کہ اس کو اپنے کھانے پینے کی فکر نہیں بس اولاد کی فکر ہے۔

☆.....☆

ایک دن دوپہر کے وقت میں اس فقیرنی کو کھانا دینے کے لیے گھر سے باہر آیا۔ آج وہ وہاں دیوار سے ٹک کے بیٹھنے کے بجائے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے دو تین بار اس کو آوازیں بھی دیں پر وہ اٹھی نہیں مجھے دیکھ کر دو تین لوگ اور آ گئے۔ پتا چلا وہ بے ہوش ہوگئی ہمیں پتا تھا اس کا گھر کہاں ہے کیوں کہ محلے کے ایک آدمی نے دیکھا ہوا تھا۔ ہم اس کو گاڑی میں اس کے گھر لے کر گئے۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی مگر کمزوری سے نڈھال لگ رہی تھی۔ میں نے گاڑی روک کر اس کے لیے کچھ جوس کے ڈبے اور کھانے پینے کا سامان لیا اور اس فقیرنی کو دیا جسے اس نے بے دلی سے تھام لیا۔

''کیوں اپنے ساتھ ظلم کرتی ہو مائی کھالو۔''

''پتر میری بھوک مرگئی ہے۔ اس سے اچھا تھا تُو مجھے پیسے دے دیتا کہ میں اپنے بچوں کے لیے کچھ لے آتی۔''

''اب بھی تم ان خودغرض اولادوں کا سوچ رہی ہو جن کو تمہاری پروا بھی نہیں۔'' فقیرنی کی بات پر مجھے گاڑی چلاتے ہوئے تاؤ آ گیا۔

''کیا کروں بیٹا ماں ہوں ناں۔ ماں کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔''

اس کی بات پر میں چپ ہوگیا۔ اس کا گھر آ گیا تھا۔ اس کا گھر بھی اس کی حالت جیسا خستہ حال تھا۔ میرے دروازہ بجانے پر ایک لڑکی باہر آئی۔

''کیا کام ہے؟'' مجھے دیکھ کر وہ بدتمیزی سے بولی۔ اس کی بدتمیزی پر میں نے بمشکل ضبط کیا۔

''یہ تمہاری اماں بے ہوش ہوگئی تھی۔'' میں برابر کھڑی فقیرنی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ لڑکی آگے سے ہٹ گئی میں اور فقیرنی اندر داخل ہوگئے۔ چھوٹا سا صحن تھا۔ ٹوٹا پھوٹا فرش دو جھلنگا سی چارپائیاں رکھی تھیں جس پر فقیرنی لیٹ گئی اور میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دو بچے اور اس کے صحن میں آ گئے۔

''اماں تم مری نہیں۔'' اس کی دوسری بیٹی بولی۔

اس کے کہنے پر میں اس کو گھورنے لگا جس پر اس کے سارے بچے دانت نکال کے ہنستے رہے۔

''میں چلتا ہوں۔'' میں کہتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ مجھے لگا اگر میں تھوڑی دیر اور بیٹھا تو اس فقیرنی کے بچوں کے ایک ایک تھپڑ جڑ دوں گا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے پلٹ کے دیکھا تو اس کے بچے شاپر پر بھوکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے تھے جو میں نے اس فقیرنی کو راستے میں دلایا تھا۔ فقیرنی چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی مگر اس کے بچے اس سے غافل اپنا کھانے پینے میں لگے تھے۔

رات کو میں نے گھر پر آج دوپہر میں ہونے والے واقعے کا بتایا تو سب کو ہی فقیرنی کی اولاد کی سنگدلی پر افسوس ہو رہا تھا۔ میری چھوٹی بہن نگہت بولی۔

''مجھے سب سے زیادہ ہنسی اس فقیرنی کے نوٹ چومنے پر آتی ہے۔'' اس کی بات پر امی اسے ڈانٹنے لگیں۔

''بری بات ہے وہ پیسوں پر یوں خوش ہوتی ہے کہ اس کے بچوں کی ان پیسوں سے دال روٹی ہو جاتی ہے، پر اس کی اولاد ہے اتنی بے حس اس کو ماں کا اپنی ہوش ہی نہیں۔''

رات میں اپنے دوست سے مل کر گھر آ رہا تھا کہ گلی میں لوگوں کا رش دیکھ کر میں چونکا۔ میں اس جانب چلا آیا تو پتا چلا وہ فقیرنی مرگئی ہے۔ میرا دل بے انتہا دکھی ہوگیا۔ ہم فقیرنی کی لاش اس کے گھر لے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کر گئے پر وہاں اس کی اولاد کے چہرے پر فقیرنی کی موت پر میں نے ایک خوشی دیکھی مجھے اس فقیرنی کی اولاد سے نفرت ہو رہی تھی۔ ہم محلے والوں نے مل کر اس فقیرنی کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ جاتے ہوئے فقیرنی کی بیٹی میرے پاس چلی آئی۔

''صاحب کیا تم کل آسکتے ہو یہاں۔''

''کیوں؟'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''بس صاحب! آجاؤ۔'' وہ التجائیہ لہجے میں بولی تو ناچار میں نے ہامی بھر لی حالانکہ میرا دل راضی نہ تھا۔ دوسرے دن میں اس فقیرنی کے گھر میں موجود تھا۔ اس کے تینوں بچے میرے سامنے بیٹھے تھے۔

''کیوں بلایا تھا مجھے؟'' میں نے اس کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب! تمہاری آنکھوں میں جو نفرت ہمارے لیے ہے۔ اس سے ہم غافل نہیں۔'' فقیرنی کا بیٹا بولا۔

''اندر آؤ صاحب۔'' اس کے بچے کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''جو بات ہے یہیں کرو۔'' میں غصے سے بولا۔

''صاحب! تم آؤ تو۔'' ان کے کہنے پر میں ان کے ساتھ چل دیا۔ اندر ایک کمرہ تھا جس کو اس کا بیٹا کھول رہا تھا۔ دروازے پر موٹی زنجیر ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے اس زنجیر کو کھولا اور اندر کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا مگر اندر ایک بیڈ رکھا تھا جس پر پیسوں کی گڈیوں کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔ پورے کمرے میں جگہ جگہ پیسے رکھے ہوئے تھے کہ میرا پیر رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ مجھے لے کر آگے بڑھا کمرے کے کونے میں زمین پر رکھے بکسے ہٹانا شروع کیا پھر زمین پر رکھی اینٹوں کو ہٹایا تو زمین کافی گہری کھدی ہوئی تھی۔ اندر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ اتنا ڈھیر سارا سونا میرا سر چکرا کے رہ گیا۔

ہماری ماں پیسوں کا نشہ کرتی تھی وہ پاگل تھی پیسوں کے لیے یہ سب اس نے بھیک مانگ مانگ کے جمع کیا۔ سات سال کی عمر سے بھیک مانگ رہی تھی۔ اب ستر سال کی ہو گئی تھی۔ نہ خود کھاتی نہ ہمیں کھانے دیتی۔ اس کو یہ ڈر ہوتا کہ اس کے پیسے خرچ ہو جائیں گے۔ ہمیں بھی مجبور کرتی کہ بھیک مانگ کر اسے پیسہ جمع کر کے دو۔ ہمیں دنوں بھوکا رکھتی اس کی اس عادت سے ہم عاجز آ گئے تھے۔ رات وہ اس کمرے میں گزارتی پوری رات پیسوں کو چومتی اور کبھی ان نوٹوں کو سونگھتی۔ دوپہر وہ اس دروازے کو زنجیر ڈال کے جاتی اس کو ڈر لگا رہتا کہ ہم اس کے پیسے نہ لے لیں جو کبھی بھیک ملتا وہ اس کمرے میں رکھ لیتی ہمیں کھاتا دیکھ کر ہنگامہ کھڑا کر دیتی کہ ہم نے پیسے کیوں خرچ کیے ہیں۔ صاحب زندگی اجیرن کی ہوئی تھی اس نے ہماری۔''

ان لوگوں کی کہانی سن کر میں چپ چاپ باہر نکل آیا۔ تھوڑے دن بعد کسی کام سے میرا ڈیفنس جانا ہوا تو وہاں میں نے اس فقیرنی کی بیٹی کو دیکھا پر یہ وہ تو نہ تھی جو میں نے اسے پہلے دیکھا تھا کھلے بال، مہنگا لباس وہ مجھے دیکھ کر رک سی گئی اور مسکرا کے بولی۔

''آؤ نہ صاحب! یہاں میرا گھر ہے۔'' اس کے منہ سے صاحب عجیب لگ رہا تھا اب کیونکہ وہ فقیرنی کی بیٹی لگ ہی نہیں رہی تھی جس سے میری ملاقات اس کے خستہ حال گھر میں ہوئی تھی، میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے گھر چلا آیا۔ پورچ میں کھڑی دو شاندار گاڑیاں عالیشان بنگلہ میری تو آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ مجھے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ پانچ منٹ بعد ملازمہ جوس لے آئی۔

''یہ سب کیا ہے؟''

''بس صاحب اماں کے مرنے کے بعد سمجھو عیش ہو گئے بہت پیسہ جمع کیا تھا اس نے اس کے نشے نے تو ہمارے مزے کرا ڈالے۔'' وہ زور سے ہنس کے بولی۔

''اماں اگر زندہ ہوتی نا اور یوں ہماری شان و شوکت دیکھ لیتی نہ ہارٹ اٹیک سے مر جاتی۔'' وہ ایک بار پھر ہنس دی اور میں سوچ رہا تھا کہ فقیرنی کے نشے نے اس کی اولاد کو جہاں اتنی تکلیفیں دی اب اس ہی نشے نے عیش بھی کرا دیے تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پانچویں منفرد کہانی

سیمیں غزالہ نیہاں

اُس بیٹی کی کہانی جو باپ کے آنکھیں موندتے ہی ماں کے لیے فتنہ بن گئی

''بیٹا! اب تم اپنے گھر جاؤ۔ بہت دن ہو گئے ہیں تم یہاں رہ رہی ہو۔ اپنا گھر چھوڑ کے یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ تمہاری ساس بھی ناراض ہو رہی ہوں گی۔'' نفیسہ بیگم نے اپنی بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

ان کے شوہر کے انتقال کو اب چالیسواں بھی گزر گیا تھا۔ ان کی چھوٹی بیٹی اپنے والد کے انتقال پر آئی تھی مگر اب جانے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔

''امی..... مگر آپ اکیلی کیسے رہیں گی۔''

''بیٹا! میں اکیلی کب ہوں۔ اسد بھی تو ہے۔'' انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا نام لے کر کہا۔

''امی! عدت تک تو آپ کا اکیلے رہنا مناسب نہیں ہے۔''

''کیوں مناسب نہیں ہے۔ تم جانتی ہو میں بہت سوشل ہوں۔ میرے دوست احباب، محلے والے روز ہی آتے ہیں میرے پاس۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اسد میرے ساتھ ہے اور اب تو یہ تنہائی زندگی بھر کے لیے ہے۔ تمہارے ابو تو واپس آئیں گے نہیں۔ مجھے تو اکیلے ہی رہنا ہے۔ تم سب اپنے گھر بار والی ہو۔ جاؤ اپنے گھر، جب موقع ملے ملنے آجانا۔'' انہوں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی عمران بھی کہہ رہے ہیں ہم لوگ امی کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ میں تین کمرے کے اس گھر میں داماد کو کیسے رکھ لوں۔ تمہارا اپنا گھر موجود ہے۔ اپنے گھر میں رہو۔'' اب انہوں نے غصے سے کہا۔

''آپ ایسا کریں اوپر کا گھر خالی ہے۔ مجھے دے دیں کچھ دنوں کے لیے سہی۔'' وہ مسلسل ہٹ دھرمی کر رہی تھی۔

''مگر کیوں! مجھے اوپر والا پورشن کرائے پر اٹھانا ہے۔ میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ابھی تمہارا بھائی بھی پڑھ رہا ہے پھر اس کی شادی بھی کرنی ہے۔ میں تمہیں ہرگز نہیں رکھ سکتی۔'' انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اصل میں میری ساس کا بھی پروگرام ملیر سے یہاں آنے کا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں تم کچھ دن وہاں رہو پھر ہم کوئی گھر دیکھ لیں گے۔''

''ہرگز نہیں جب تمہیں گھر مل جائے اپنے گھر میں آنا۔ یہاں نہیں رکھوں گی۔

''مگر میں تو بچوں کا یہاں اسکول میں داخلہ بھی کروا رہی ہوں۔ مجھے کچھ دن رہنے دیں پلیز امی۔'' اب وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

خوشامدوں پر اتر آئی تھی۔ اس وقت انہیں احساس ہوا کہ شوہر کا سایہ بہت ضروری ہے۔ باپ کے بغیر بچے بھی شیر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ساری زندگی ان کی شوہر سے نہیں بنی تھی۔ ان کے اور شوہر کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انہوں نے کبھی بیوی کو وہ عزت نہیں دی تھی جو ان کا حق تھا۔ بچوں اور ہر آئے گئے کے سامنے ان کی انسلٹ کر دیتے تھے۔ اس کے باوجود بچوں نے بھی ماں سے اونچی آواز میں بات نہیں کی اور ان کے مرنے کے بعد ان کے سوگ کے تین کمروں والے گھر پر قبضہ جمانے ان کی بیٹی آ گئی تھی۔

واقعی شوہر جیسا بھی ہو بیوی کے لیے چھپر چھاؤں ہوتا ہے۔ ان کے حقوق کا پورا خیال نہیں رکھا تھا مگر چادر اور چار دیواری کا تحفظ تو تھا۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا بیٹی ہی ان کو بے گھر کر دے گی۔ بیٹے نے بھی دبی زبان سے احتجاج کیا تھا۔

''امی! آپی سے کہیں اپنے گھر میں رہیں۔'' مگر وہ تو ایسی ضدی اور ہٹ دھرم تھی کہ دوسرے ہی دن اپنا سامان لا کر اوپر کی منزل میں شفٹ ہو گئی۔ ماں بیٹے منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

نفیسہ بیگم کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ سب شادی شدہ تھے۔ صرف ایک چھوٹا بیٹا تھا جو ابھی تعلیمی دور میں تھا۔ شوہر دو سالوں سے ریٹائرڈ تھے۔ اچانک ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ابھی ان کا چالیسواں ہی گزرا تھا کہ یہ افتاد آ پڑی یہ تیسرے نمبر کی بیٹی تھی جو آ کر گھر پر قابض ہو گئی۔ چند ہی دنوں کے بعد اس کا شوہر باہر چلا گیا تو پھر انہوں نے اس کو سمجھایا کہ اب تم اپنا الگ گھر لے لو اس نے کہا۔

''امی! آپ بے فکر رہیں۔ عمران اچھا کما رہے ہیں میں اب اپنا فلیٹ خرید لوں گی۔'' وہ مطمئن ہو گئیں۔ ان کا ہاتھ اب بہت تنگ ہو گیا تھا۔ شوہر کی قلیل پینشن میں گزارا مشکل تھا۔ گھر کا کرایہ بند ہو گیا تھا۔ ان دنوں کرایہ دار نے گھر خالی کیا تھا اور وہ ابھی مناسب کرایہ دار کی تلاش میں تھیں کہ اچانک ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیٹی کو موقع مل گیا اور وہ ان

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

کے گھر زبردستی رہنے لگی۔ کرایہ کے نام پر ایک پائی بھی نہ دیتی بلکہ گیس، کیبل نیٹ اور بجلی کے بل کی بھی ذمہ داری بھی ان پر آگئی۔ ان کی قلیل آمدنی میں کبھی بجلی کا بل ادا نہ ہوتا تو کبھی گیس اور کیبل کا بل نہ دے پاتیں۔ جب کہ بیٹی بیدردی سے بجلی بھی استعمال کرتی اور نیٹ بھی چلاتی۔ پھر دوسرے مہینے جب ایریرجمع ہو جاتا تو پھر کسی بل کی ادائیگی روک کر پہلے والے کی ادائیگی کرنی پڑتی یوں چکر بلکہ گھن چکر شروع ہوگیا۔ ایسے ہی تین سال گزر گئے اور بجلی کے بل کی وقت پر ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑی رقم واجب الادا ہوگئی وہ بے حد پریشان ہوگئیں اب تو اس کے سسرال والے بھی آکر کئی کئی دن رہنے لگے تھے۔ ان کے مرحوم شوہر کا کمرہ اوپر تھا۔ ایک دن انہوں نے اس میں تالا لگا دیا اور بیٹی سے کہا کہ وہ فوری طور پر گھر خالی کر دے مگر وہ تو لڑنے پر اتر آئی کہ۔

''ابو کا کمرہ خالی ہی تو پڑا ہوا ہے اگر میرے سسر آکر کبھی رہ جاتے ہیں تو آپ کا کیا نقصان ہے۔''

''مجھے اپنے بیٹے کی شادی کرنی ہے۔ اس کو وہ کمرہ دوں گی۔ تم فوراً خالی کرو۔'' مگر اس نے تو اپنے سب بہن بھائی کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ وہ بھی یہ ہی کہنے لگے۔

''امی! چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ وہ اکیلی کیسے رہے گی۔''

''اپنی سسرال ہی رہے۔ یہاں کیوں رہتی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''وہ علاقہ اچھا نہیں ہے۔ بچوں پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔'' یوں تین سال کا عرصہ گزر گیا نہ اس نے اپنا الگ گھر لیا نہ ماں کا گھر خالی کیا۔ پھر اچانک ان کے داماد کی نوکری ختم ہوگئی اور وہ واپس آگیا۔ اب وہ جاب لیس تھا۔ اب بیٹی کا رونا یہ تھا کہ میرے پاس کچھ نہیں میں کہاں سے بچوں کو کھلاؤں۔ اسکول کی فیس دوں کیسے خرچہ پورا کروں۔ میرے پاس تو کھانے کے لیے بھی نہیں ہے۔ آخر وہ ماں تھیں۔ ان کا دل نہیں مانتا کہ بچے بھوکے رہیں جو پکاتیں وہ بچوں کو ضرور دیتیں۔ اکثر اسکول کی فیس اور کاپی کتابوں کا خرچہ بھی اٹھا لیتیں۔ اب تو دونوں کو اور بھی آرام ہوگیا۔ داماد سارا دن گھر میں آرام کرتا اور بچوں کی ذمہ داری بھی ان کے سر پر آپڑی۔ ابھی ان کے بیٹے کی جاب بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کی منگنی کردی۔ شادی سال بعد طے ہوئی تو انہوں نے پھر بیٹی اور داماد پر زور دینا شروع کیا کہ گھر خالی کرو مجھے کرائے پر اٹھانا ہے تاکہ بیٹے کی شادی کروں۔

بڑی مشکلوں سے داماد نے یہ کہہ کر جانا قبول کیا کہ ابھی بیوی بچوں کو چھوڑ کے جارہا ہوں۔ مجھے جاب مل جائے گی تو میں ان کو لے کر جاؤں گا۔ اس کے جاتے ہی انہوں نے اس کا سامان ایک کمرے میں شفٹ کردیا اور دو کمروں میں فوراً کرایہ لگا دیا۔ اب تو بیٹی اور اس کے بچوں کی مکمل ذمہ داری انہی پر آپڑی کیونکہ داماد نے صاف کہہ دیا کہ جب تک میری جاب نہیں ہوتی میں خرچہ نہیں اٹھا سکتا۔ یوں جو کرایہ ملنے لگا تھا وہ پورے کا پورا اسی پر خرچ ہونے لگا وہ پھر بری طرح پھنس گئیں۔

جس مہینے میں بیٹے کی شادی طے ہوئی تھی اس کی تاریخ رکھنے کا مرحلہ آیا تو اس بیٹی نے گھر میں جھگڑا شروع کردیا اور بھائی کی منگیتر کے لیے غلط الفاظ ادا کیے۔ کچھ جھوٹی شکایتیں لگائیں، کچھ اس کو بھی غلط سلط میسج کر کے ان کو اتنا متنفر کردیا کہ آخر وہ منگنی توڑنے پر مجبور ہوگئے۔ یوں بھائی کا گھر بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دیا۔ ان کا بڑا بیٹا بیرون ملک میں تھا۔ اس کو بھی نجانے کیا کیا شکایتیں لگائیں کہ وہ بھی ماں کے خلاف ہوگیا اور ان کو خرچ بھیجنے کے علاوہ ان سے بات چیت بھی بند کردی۔ وہ بہت پریشان ہوگئیں۔ یہ ان کی سگی اولاد تھی جو سگی ماں سے سوتیلی بیٹی کی طرح سلوک کر رہی تھی جب کہ بیٹیاں تو ماں کی ہمدرد ہوتی ہیں۔

مجبوراً انہوں نے اپنی بڑی بیٹی کو سارے حالات بتائے اور اس کو کہا کہ بہن کو سمجھائے تو بجائے اس کے وہ بہن سے باز پرس کرتی۔ ماں سے کہنے لگی۔

''وہ آخر کہاں جائے؟ وہ اپنے باپ کے گھر ہی رہ رہی ہے آپ کو کیا تکلیف ہے۔

''یہ پوچھو مجھے کیا تکلیف نہیں ہے۔ اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے، خرچہ بھی میں اٹھا رہی ہوں۔ گھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے کام میں ذرا سی بھی مدد نہیں کرتی ہے۔ اپنا گھر موجود ہے تو جاتی کیوں نہیں۔'' تو اس نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

''آپ ایسا کریں اس کو ایدھی سینٹر میں داخل کروا دیں۔''

''میں اس کو کیوں ایدھی سینٹر میں داخل کرواؤں۔ تم لوگ مجھے وہاں داخل کروادو۔ یہ گھر تمہارے باپ کا ہے۔ میرا تو کوئی حق نہیں اس پر۔ تم لوگوں کا جو دل چاہے کرو۔ میں ہی نکل جاؤں تو اچھا ہے۔''

''کسی ایک کو تو نکلنا پڑے گا ہی۔'' اس نے پھر سفاکی سے کہا۔

''کسی ایک سے مراد میں ہی ہوں نا۔ یہ ہی کہنا چاہتی ہو نا تم۔''

''ہاں کسی ایک تو نکلنا ہی پڑے گا۔'' اس نے پھر یہ ہی کہا۔ تو ان کے دل میں کچھ چھنا کے سے ٹوٹ گیا۔

''اسی دن کے لیے پالا تھا تم لوگوں کو کہ آج مجھے اپنے ہی گھر سے نکل جانے پر مجبور کرو۔'' وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ کہے گی۔

''امی خدا نہ کرے آپ کیوں کہیں جائیں۔ ہم اس کا کوئی حل نکالیں گے بلکہ اس نے بھی ان ہی کو ملزم گردانا۔ نہ ماں کا خیال ہوا نہ بھائی کا۔ اس کے بعد باہر والوں نے بھائی سے بھی پتہ نہیں کیا کیا کہا کہ اس نے بھی فون پر کافی لڑائی کی اور خرچ بھیجنا بھی بالکل بند کردیا۔

اور وہ بیٹی جو گھر پر قابض تھی اس نے تو بدتمیزی کی حد کردی۔ ماں اپنی سگی ماں سے بات چیت بالکل بند کردی۔ ان ہی کے گھر میں ان ہی کے سامان سے اپنا الگ پکاتی اپنے بچوں کو کھلاتی اور خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ شاید اسی انتظار میں تھی کہ مرجائیں تو ترکہ بٹے۔ ایک معمولی سے گھر کا کتنا ملتا مگر جب انسان لالچ میں آجائے تو اندھا ہو جاتا ہے پھر اچھے برے کی تمیز رہتی ہے نہ خون کے رشتوں کا پاس ہوتا ہے۔ اللہ نے خود اپنے کلام میں مال اور اولاد کو فتنہ قرار دیا ہے۔ اور یہ فتنہ ان کے گھر میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ وہ اولاد تھی جس کو انہوں نے بڑے ناز و نعم میں پالا تھا۔ ان کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ پڑھایا لکھایا شادیاں کیں ان کی اولادوں کی خدمت کی۔ آج وہی ان کے مقابلے پر کھڑی ہوگئی تھی اور زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچا کر خوش ہو رہی تھی تکلیف بھی اس کو دے رہی تھیں۔ جس کے قدموں تلے ان کی جنت تھی۔ اگر وہ ان کے گھر میں رہ رہی تھی تو اگر حسن سلوک ماں اور بھائی کے لیے ایک روٹی بھی نہیں پکائی۔ بچوں کی بدتمیزی نے ان پر اتنا غلط اثر ڈالا کہ وہ چند دنوں میں برسوں کی بیمار نظر آنے لگیں۔ ان کو اپنا اور اپنے بیٹے کے لیے کھانا پکانا بھی مشکل ہوگیا۔ ٹینشن اور ڈپریشن نے ان کو ادھ موا کردیا۔ وہ جو اتنی عمر میں بھی فٹ تھیں اکثر بیمار رہنے لگیں۔ تین دن سے طبیعت اتنی سخت خراب تھی۔ الٹی، موشن، بخار اور سر درد سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ بیٹی آتی جاتی رہی مگر اس نے پوچھنا بھی گوارہ نہیں کیا کہ امی کو کیا ہوا۔ کچھ نہ کھانے پینے سے شدید چکر آرہے تھے کہ وہ کھانا بھی نہیں پکا سکیں۔ ان کی اپنی تو حالت خراب تھی۔ بیٹا بھی رات کو بغیر کھائے بھوکا سویا مگر بیٹی جو اپنا کھانا انہی کے کچن میں پکاتی تھی۔ ایک روٹی بھی بھائی کے لیے پکانا گوارہ نہیں کیا۔

محلے والوں کو پتہ چلا تو کوئی سوپ بنا کے لایا کوئی سالن پکا کے لے کے آئیں مگر سگی اولاد وہ بھی بیٹی خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ شاید اسی انتظار میں تھی کہ مرجائیں تو ترکہ بٹے۔

لوگ بہوؤں کی بدسلوکی کی شکایتیں کرتے ہیں۔ یہاں تو بیٹی تھی سگی بیٹی۔ جو بدسلوکی ہی نہیں دشمنی پر اتر آئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ماں گھر بیچ کے ان کو حصہ دے دیں چاہے خود بے گھر ہو جائیں۔ ہے نا یقین نہ کرنے والی بات مگر سچ ہے اور سچ بڑا تلخ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ یہ کہیں کہ ''کیا نہیں ہوتا۔''

ایک نہیں کتنی نفیسہ بیگم ہوں گی جو اپنے ہی خون کے ظلم کا شکار بن کر اذیت اٹھا رہی ہیں۔ بلکہ اپنی زندگی کے دن گن رہی ہیں۔ بہت سی نفیسہ جیسی مائیں ایدھی ہوم یا کسی شیلٹر ہوم میں اپنی سگی اولادوں کے ظلم کا شکار ہو کر ایڑیاں رگڑ رہی ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گرہن زدہ

فصیحہ آصف خان

اُس معصوم کی داستان جسے ماں کی موت گرہن زدہ کر گئی تھی

میں چاند ہوں، تُو میرا ٹکڑا ہے۔ چاند کا ٹکڑا بھی چاند ہوتا ہے۔ ویسا چمکدار حسین، دیکھتے رہنے کو جی کرتا ہے، آنکھ تھکتی ہے نہ من بھرتا ہے۔

محبت بھرے ہونٹوں نے حسب معمول ماہتاب کے ماتھے پر پیار اتارا۔

چھ سالہ ماہتاب کے اندر ٹھنڈک وسکون کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ بند آنکھوں۔ قمرالنساء نے اس کی بلائیں لے ڈالیں اور ماہتاب کی نیند سے بھری آنکھوں میں بھی اس راز سے واقف تھا۔ ماہتاب نے اس سے لپٹ جانا چاہا مگر قمرالنساء نے اس کے بے سدھ وجود کو سیدھا کر کے لٹا دیا اور چادر اوڑھا دی۔

ٹھنڈی میٹھی نرم، گرم راتوں کا مہینہ تھا۔ سو ماہتاب نیند کی گہری وادی میں اتر چکا تھا۔

قمرالنساء نے بلب بند کر دیا اور ہلکی نیلی روشنی والا زیرو پاور کا ننھا سا بلب جلا دیا، خواب ناک سا عالم پورے کمرے پر طاری ہو گیا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ دوسرے کمرے میں آ گئی۔

سلائی مشین کی کھٹ کھٹ رات کی خاموش تاریکی پر غالب آنے لگی۔

مشین پر جھکی جھکی وہ کئی گھنٹے گزار گئی۔ گھڑیال نے بارہ کا ہندسہ عبور کیا تو اسے پہلی جھپکی آئی۔ کمر میں درد کی لہر نے اسے زندہ ہونے کا احساس دلایا تو قمرالنساء سب کچھ وہیں چھوڑ کر بجلی بند کر کے ماہتاب کے پہلو میں آ گئی۔

ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ پر ماہتاب نے کروٹ بدلی اور قمرالنساء کے سینے میں سما گیا، اس نے بھی اسے یوں سینے میں دبوچا جیسے کائنات اس کے وجود میں یا وہ کائنات میں سمٹ گئی ہو، روشنیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

☆.....☆

ماہتاب کی آنکھ کھلی تو قمرالنساء ناشتا بنا رہی تھی، پراٹھا اور چائے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ جلدی سے تیار ہوا اور ناشتا کر کے اسکول جانے لگا تو قمرالنساء نے حسب معمول اسے پیسے تھمائے۔ ماہتاب نے فرطِ مسرت سے ماں کو چوم لیا اور جواب میں قمرالنساء نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔

صبح صبح کی تازہ چمکیلی روشنی میں ماں کا چہرہ چاند سے زیادہ بارونق دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ناک کی لونگ حسب معمول نشکارے مار رہی تھی۔ ماہتاب نے بمشکل ماں کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور بستہ گلے میں لٹکایا۔ شرٹ کی جیب میں احتیاط سے پیسے رکھ کر وہ باہر آ گیا۔ قمرالنساء نے دروازہ بند کر لیا اور گھر کے کام سمیٹنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گئی۔ کل تک اسے بہت سارے کپڑے سلائی کر کے مکمل کر کے دینے تھے۔ سودال چڑھا کر وہ مشین میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ دال پک گئی، ماہتاب بھی آ گیا، دونوں نے کھانا کھایا اور پھر سے مشین کی گھر گھر شروع ہو گئی۔

ماہتاب چٹائی بچھائے اس کے قریب بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا اور وقفے وقفے سے سر اٹھا کر قمرالنساء کو دیکھتا، جو اپنے کام میں بری طرح منہمک تھی۔ کام ختم کر کے وہ بستہ بند کر کے ماں کو بتا کر باہر کھیلنے چلا گیا۔ سامنے ہی میدان تھا جہاں پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ماہتاب کا کوئی دوست نہ تھا، پھر بھی وہ کھیلنے کی سعی کرنے لگا۔ اس کے کم عمر ہونے کے سبب کوئی اسے شامل نہ کرتا تھا۔ گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو گھر کے باہر موٹر سائیکل کھڑی دیکھی۔ وہ حیران تھا کہ کون ہو سکتا ہے، دروازہ کھلا تھا، وہ اندر آ گیا۔ مشین بند تھی۔ ماں دوسرے کمرے میں تھی۔ آوازیں سن کر وہ وہیں چلا آیا۔

دو چارپائیوں والے کمرے میں ایک پر انجانا مرد اور دوسری پر قمرالنساء بیٹھی تھی۔ کالا بھجنگ، اونچا لمبا، دیو نما مرد۔ ماہتاب کو وہ ماں کے سامنے کالا ٹیکہ محسوس ہوا۔ کون تھا یہ؟ کی گردان ذہن میں گردش کرنے لگی۔

''یہ بیٹا ہے تیرا؟'' اس دیو نے ماہتاب کو دیکھتے ہی دانت نکال کر پوچھا۔

''ہاں۔'' قمرالنساء نے محبت بھرے لہجے میں ماہتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جواب قمرالنساء کے پہلو سے چپکا بیٹھا تھا، حیران سا۔

''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ خاموشی میں اس کی بائیک کی آواز کانوں کو ناگوار گزری۔

''یہ کون تھا اماں؟'' ماہتاب نے ماں کے ہاتھوں میں دبے نوٹ دیکھے۔ نگاہ ان روپوں پر تھی اور ہونٹوں پر سوال۔

قمرالنساء نے یکدم چونک کر اس کے سوال پر الجھی نظروں سے ماہتاب کو دیکھا اور پھر رقم کو جس پر اس نے مٹھی اور مضبوط کر لی تھی۔ پھر دھیمے لہجے میں بولی۔

''کپڑے سلوانے آئے تھے اور پیشگی رقم دے گئے ہیں۔'' قمرالنساء نے ایکا ایکی مٹھی اس کے سامنے کی جس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں کئی نیلے نوٹ تھے۔ ماہتاب حیران ہی تو رہ گیا اتنے سارے پیسے دیکھ کر۔ مگر سلوانے والے کپڑے کہیں نظر نہ آرہے تھے۔ اس کا معصوم ذہن زیادہ نہ سوچ سکا۔

''تم کھیل کر آئے ہو، جاؤ ہاتھ منہ دھولو.... پھر مدرسے جاؤ۔'' قمرالنساء فوراً اٹھی اور اس کا دھیان بٹانے کو اگلا حکم صادر کیا۔

ماہتاب باہر چلا گیا مگر ڈھیر سارے نوٹ اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ خواہشات کا جوانبار بار بار تنگ کر رہا تھا، اب ان کی تکمیل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ خوشی خوشی مدرسے چل پڑا۔

قمرالنساء نے نوٹ صندوق کے اندر رکھی تھیلی میں رکھ کر تالا لگایا اور چابی ازار بند کے ساتھ باندھ کر مطمئن ہوگئی مگر اندر ہی اندر ایک لرزا اس پر طاری تھا۔

☆.....☆

چھٹی کا دن ماہتاب کا پسندیدہ دن تھا۔ ماں اس روز حلوہ پوری سے ناشتا کراتی تو دودھ پتی چائے کا مزا آجاتا۔ دوپہر کو مرغی کا گوشت پکتا۔

ماں کلوحلوائی سے مزیدار حلوہ پوری لے آئی تھی۔ اس دن ماہتاب ذرا دیر سے اٹھا۔ دونوں نے گھی سے چپڑے ہاتھوں ناشتا کیا۔ دودھ پتی چائے کا گرم گرم پیالہ پی کر ماہتاب کی نگاہوں کے سامنے وہی نیلے نوٹ لہرا گئے۔

''چلو سامان لے آئیں۔ راشن ختم ہورہا ہے۔'' ماں نے تھیلا ماہتاب کو تھماتے ہوئے کہا اور چادر سر پر ڈال لی۔ ماہتاب کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''اماں میں ٹھنڈی کھیر بھی کھاؤں گا اور رنگین پنسلوں والی جیومیٹری بھی دلانا۔'' وہ لاڈ سے بولا تو قمرالنساء کے ہاتھ تالا لگاتے لمحہ بھر کو رکے۔ پھر مسکرا کے اس کا ہاتھ تھاما اور بازار کی طرف چلنے لگی۔

☆.....☆

قمرالنساء نے گوشت، سبزی، آٹا، مسالے لے کر مٹھائی، اس کے لیے ٹھنڈی کھیر اور کھلونوں والی دکان سے چابی والی کار دلائی۔ ماہتاب پھولے نہ سمارہا تھا۔ آخر میں رنگین پنسلوں والی جیومیٹری بھی لے کر دی۔ ماہتاب کا دل چاہا کہ اس لمحے وہ ماں کو چوم لے۔

قمرالنساء ماہتاب کے چہرے پر خوشی دیکھ کر نہال ہوگئی۔ دو گھنٹے بعد وہ گھر آگئے اس نے سامان سمیٹا اور کھانا پکانے لگ گئی۔ ماہتاب اپنی کار سے کھیلتا رہا یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

''کچھ دیر سو جا میرے بچے۔'' ماہتاب کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھ کر ماں نے کہا تو وہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

قمرالنساء مشین لے کر سلائی کرنے بیٹھ گئی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر کھولا۔ میڈم نرگس اور رحیمو اندر آگئے۔ قمرالنساء کے قدم جم سے گئے تھے اور دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ تیز۔ ایک ٹیس اٹھی اس کے اندر۔ شکر تھا کہ ماہتاب سو رہا تھا۔ آج میڈم دو ماہ کے بعد آئی تھی۔ جب بھی آتی ماہتاب موجود نہ ہوتا۔ آج بھی وہ سو رہا تھا۔ مرے مرے قدموں ان دونوں کو لے کر اندر لے آئی۔ رحیمو اسے میلی نظروں سے دیکھنے لگا۔ قمرالنساء نے سینے پر دوپٹہ برابر کیا تو میڈم کے لبوں پر طنزیہ ہنسی ابھر آئی۔ اسی طنز کے ساتھ وہ تیکھے انداز میں بولی۔

''جوانی ہے ابھی تجھ پر، کچھ بڑھاپے کے لیے جوڑ توڑ کرلے۔''

''زلفی آیا تھا ناں..... وہ زیادہ دن انتظار نہ کرے گا۔'' میڈم نے دوٹوک بات کی تو قمرالنساء کی جان نکلنے لگی۔

''ایڈوانس دے گیا ہے ناں تجھے۔'' وہ پاس آکر اپنی قیمتی انگوٹھی سے سجی انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر بولی۔

''ہاں۔'' قمرالنساء لرزتی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہے بس تو تیار رہنا۔ سن تیرا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اسے ابھی چھوٹا ہی رکھنا۔'' میڈم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''بس ہمارا حکم مانتی جا.... عیش کرے گی ورنہ بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ ابھی کچھ سال عیش کر۔ رحیمو آج بھی تیرا دم بھرتا ہے۔''

قمرالنساء نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''ہم چلتے ہیں، زلفی ہی اب حساب کتاب کرے گا۔'' وہ چلتی ہوئی مکاؤں کی طرح کہتی باہر جانے لگی۔ پھر ذرا رکی اور قریب آکر بولی۔

''خرید تو لیا اس نے پر مجھے بے مول کردیا۔ بہادر کی موت کا غم بھول جا۔ وہ بزدل تیرا شوہر کہلانے کے قابل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہ تھا بس نام کا ہی بہادر تھا ورنہ اور زندگی جی لیتا۔ تو کیا سمجھتی ہے اس عزت دار محلے میں تو اپنی دریدہ عزت کی رفو گری کر سکے گی۔ نہ.... نہ.... نہ...... وہ کیچڑ آج بھی تیری ذات پر دھبہ بن کر تجھے یاد دلاتا ہے کہ تو قمر النساء نہیں بلکہ زمرد ہے۔ تو قمر النساء تو بن گئی مگر آج بھی وہ ہیرا ہے جو ریزہ ریزہ ہو کر بھی اپنی چمک دمک نہیں کھوتا۔ آج بھی بازار میں وہ زمرد آجائے تو بام و در روشن ہوجائیں گے۔ واپس چلی آ....... زمرد...... ورنہ سب کچھ ختم ہوجائے گا..... زلفی بڑا خطرناک بندہ ہے۔ اس کی بات مان لینے میں تیری بھلائی ہے۔ کنول کیچڑ میں ہی کھلتا ہے اور وہیں اپنی زندگی پوری کر کے ختم ہو جاتا ہے۔ میں تیری دشمن نہیں ہوں۔ اب زلفی آئے تو اسے انکار کرنے سے پہلے اپنے اس لاڈلے کو سامنے رکھنا۔''

تب قمر النساء نے مڑ کر دروازے میں بت بنے کھڑے ماہتاب کو دیکھا۔

''چلتی ہوں۔'' وہ کہتی باہر کی طرف چل دی۔ رحیمو بھی اسے انتہائی غلیظ نگاہوں سے گھورتا اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

قمر النساء نے دوڑ کر ماہتاب کو سینے سے لگایا اور زار و قطار رو پڑی۔

☆......☆

جانے کیا ہوا.... قمر النساء آج خود اس کے ساتھ مدرسے آ گئی جہاں مولوی صاحب کی بیوی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا رہی تھیں۔ وہ قمر النساء کو لے کر کمرے میں آ گئیں۔ قمر النساء کے کہنے پر انہوں نے مولوی ضیاء الدین کو بلایا۔ وہ آ گئے۔

وہ سر جھکا کر ان سے مخاطب تھی۔

''اسے اپنا بچہ بنالیں۔ میں کچھ دنوں کے لیے یہاں سے جا رہی ہوں، تب تک اسے اپنا بچہ سمجھ کر رکھ لیں۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ بی بی جی آپ میرا مان رکھ لیں۔''

قمر النساء تڑپ کر رو دی تو مولوی صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر لیا۔ بی بی نے بھی اسے تسلی دی۔ قمر النساء کے سر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ وہ چہرہ صاف کرتی گومگو کی حالت میں کھڑے ماہتاب کو دیکھتی گھر چلی آئی۔

☆......☆

اگلی صبح وہ اسے سینے سے لگا کر اس قدر روئی کہ ماہتاب گھبرا سا گیا۔ اس نے قمر النساء کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ کئی دنوں سے پریشان دکھائی دیتی تھی، وہ اسکول چلا آیا۔ اس رات وہ ماہتاب کے ساتھ لیٹی تو گلوگیر لہجے میں بولی۔

''زندگی بڑی تلخ ہے، بڑی کڑوی ہے ماہتاب۔ میری بات سن۔ یہ لے چابی اور صندوق کھول کر سارے پیسے نکال کر باہر چارپائی پر رکھ دے اور مولوی صاحب کے گھر چلا جا۔ میں اپنی عزت کا سودا نہ کر سکی۔ بہادر سے شادی کے بعد میں نے عزت کی رکھوالی کی مگر وہ ٹی بی سے جان نہ چھڑا سکا..... اور چلا گیا.... میں بھی جا رہی ہوں۔''

''تم کہاں جا رہی ہو ماں؟'' وہ اس سے لپٹ گیا۔

''چاند بھلا کہاں جا سکتا ہے۔ وہ تو ہر وقت آسمان پر رہتا ہے، تم اسے دیکھتے رہنا۔'' قمر النساء کی آواز رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی گویا چاند چھپ رہا تھا۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ ماہتاب سے دوری اور لٹی عزت سے موت بہتر تھی۔

وہ نیم مردہ ہوگئی، جھاگ منہ سے نکلنے لگی۔ ایک سکون تھا اس کے روشن چہرے پر اور ماہتاب کو وہ آج سب سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ تب اس نے آخری ہچکی لی اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ماہتاب چیخ مار کر اس کو آوازیں دینے لگا۔ کچھ نہ سوجھا تو مولوی صاحب کی طرف بھاگا۔

پھر کیا تھا، عورتوں سے گھر بھرنے لگا، چہ میگوئیاں، تہمتیں، بدکاری کے الزامات.... کیا.... کیا نہ سن رہا تھا ماہتاب۔

اس کا چھ سات سالہ ذہن ماں کی دوری کے احساس سے تڑپ رہا تھا۔ کاش میں اتنا بڑا ہوتا..... اور ماں کو لے کر کہیں دور چلا جاتا۔

رو رو کر وہ رلا رہا تھا۔ بی بی جی نے اسے خود میں سمو لیا تھا۔

چاند..... ماہتاب..... قمر النساء۔

آج چاند کو گرہن لگ گیا تھا۔ دل پر لگے زخم گرہن کی طرح ہی ہوتے ہیں اور ماہتاب اس گرہن میں چکرا رہا تھا کسی مدار میں، کہ زندگی میں ملنے والا یہ پہلا گرہن ایک داغ کی صورت اسے سدا ماں کی یاد دلائے گا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

ساتویں منفرد کہانی

سلّو بھیا

شانی خامان

معاشرے کے کم حیثیت مگر حقیقی وفادار کردار، جن کے دم سے انسانیت زندہ ہے

''امی امی میں باہر گلی میں کھیلنے جاؤں۔'' میری بیٹی حوریہ نے کہا تو میں نے گیلری کی دیوار سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ گلی میں کوئی نہ تھا اور نظریں بے اختیار پاس کے تھڑے کی جانب اٹھ گئیں جو گلی کی طرح سنسان تھا۔ یہ دیکھ کر خوف کے اندیشے ذہن میں پلنے لگے اور میں نے حوریہ کو صاف منع کر دیا۔

''کوئی ضرورت نہیں اس وقت باہر کھیلنے کی۔''

''کیوں امی پہلے تو آپ روز جانے دیتی تھیں اب کیوں نہیں؟'' حوریہ نے روتے ہوئے کہا۔

''بس کہہ دیا نا نہیں جانا سمجھ نہیں آتی تمہیں۔''

حوریہ کو تو سمجھ نہ آئی مگر مجھے بہت اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی اور میں چاہتی ہوں آپ بھی میری اس سمجھ کو سمجھ جائیں جس کی شروعات مجھے اس تھڑے سے کرنی ہے جو ہمارے گھر کے ساتھ والے گھر کے آگے تھا بلکہ ہے۔

وہ صبح ہوتے ہی تھڑے پر آ بیٹھتا تھا اور رات گئے تک تھڑے پر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ نام تو ان کا اسلم تھا مگر وہ پہچانے سلو کے نام سے جاتے تھے۔ پھیلے ہوئے جسم، کھچڑی بال، ملگجا لباس دنیا سے بے نیازی سے تاثرات لیے چہرہ۔ یہ تھے سلو بھائی چھوٹے بڑے سب ہی انہیں اس نام سے پکارتے تھے۔ گو بال بچے دار تھے مگر کام کاج کچھ نہ کرتے تھے۔ میں نے ایک بار کسی بک میں پڑھا تھا کہ ایک بار حضرت موسیٰ نے خدا سے کلام کے دوران پوچھا اے خدا تو نے آخر چھپکلی کو کیوں پیدا کیا ہے تو جواباً اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ کل چھپکلی بھی مجھ سے پوچھ رہی تھی اے خدا تو نے موسیٰ کو کیوں پیدا کیا ہے۔ غرض کہنا یہ ہے کہ جو چیز ہمارے قریب فضول و بے کار ہو وہ واقعی فضول نہیں ہوتی ہر شے کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہوتا ہے اور زندگی میں ہمیں اس چیز کی ضرورت اچانک پیش آ جاتی ہے جسے ہم اکثر اسٹور روم میں فضول جان کر پھینک دیتے ہیں۔ میں نے گھر شفٹ کیا تو بہت سا (فالتو سامان میرے نزدیک) حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے اِدھر اُدھر بانٹ آئی جس پر امی سے بھی کافی ڈانٹ کھانے کو ملی کہ بقول امی ان اشیاء کی کبھی نہ کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے اور امی کی یہ بات اکثر ٹھیک ثابت ہوتی رہتی ہے کہ وہ چیزیں جو میں ناکارہ جان کر خیرات کر آئی تھی اب اکثر ان کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ چیز نئے سرے سے مجھے لانا پڑتی تھی۔ بہرکیف میں تھڑے اور تھڑے پر بیٹھے سلو بھائی کی بات کر رہی تھی۔ ان کی شادی بھی والدین نے یہ سوچ کر ہی کی کہ شاید بیوی آئے تو سلو بھائی ٹھیک ہو جائیں اور کام کاج کرنے لگیں مگر یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ الٹا ایک نئی جان مصیبت میں آ گئی۔ تھڑا تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سلّو بھائی کو بھگت ہی رہا تھا اب سلّو بھائی کی بیوی اور پھر بچے بھی اس میں شامل ہو گئے۔

اچھا ہو برا ہو وقت کا کام ہے گزرنا، سو وہ گزر ہی جاتا ہے کیسی پر بہار بن کے تو کیسی پر خزاں مگر عرصہ گزر جانے کے باوجود سلّو کی وہی روٹین رہی۔ وہ روز و شب گو کہ وہ ایک نکمے شخص تھے مگر اخلاق کے بہت اچھے تھے۔ گلی کا ہر فرد ان کا عادی تھا۔ شرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جب وہ تھڑے پر کسی شہنشاہ جیسے براجمان ہوتے تو ہر گزرنے والی لڑکی یا عورت خود کو اک انجانے سے تحفظ میں گھرا محسوس کرتی۔ مجال ہے جوان کے ہوتے ہوئے کوئی کسی کو میلی نظر سے دیکھے، جہاں کسی کی نگاہ بھٹکی وہاں سلّو بھائی کا ہاتھ اس کی گدی پر ہوتا اس لیے ہی ان کے پاس سے گزرنے پر ایسی برادرانہ شفقت کی مہک اٹھتی کہ بے اختیار ہی نگاہیں ان کے احترام میں جھک جاتیں۔

وہ دن بھر فارغ ہی رہتے مگر ان کی یہ فراغت بھی اہل محلے کی سہولت کا سبب بن گئی۔

''امی میں باہر جا رہی ہوں سودا لینے۔'' میں نے گیلری سے جھانک کر دیکھا اور پھر اطمینان سے دروازہ بند کیے بغیر بازار چلی گئی۔ کیوں کہ نیچے گلی کے باڈی گارڈ سلّو بھائی اپنے تخت میرا مطلب ہے تھڑے پر آرام فرما تھے۔

عید قرباں کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف جانوروں کی رونق لگی ہوئی تھی۔ گلی میں تقریباً بارہ سے تیرہ بڑے جانور لائے گئے تھے۔ دن کو تو بچے جوان سب ان جانوروں کے ناز و نخرے اٹھاتے انہیں کھلاتے پلاتے رہتے مگر رات کو ان کی چوکیداری کون کرے گا تو ایسے مواقع پر سلّو بھائی سب سے اچھی آپشن ثابت ہوتے۔ وہ اپنا یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتے۔ اہل محلہ جب سکون سے نیند کے مزے اٹھا رہے ہوتے اور سلّو بھائی گانے گاتے ہنستے مسکراتے جانوروں کے سنگ جاگ کر پوری رات گزار دیتے اور پھر اتنے عرصے بے کار رہنے کے بعد ایک روز انہونی ہو گئی۔

میں اسکول سے بچوں کو لے کر گھر آ رہی تھی کہ میں نے دیکھا سلّو بھائی کے ہاتھوں میں گھر کے سودا سلف کے کچھ شاپر ہیں۔ یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے سلّو بھائی اور یہ سودا سلف۔ پھر کچھ دن سب نے اس تبدیلی کو محسوس کیا کہ ہر وقت سلّو بھائی کے دم سے آباد رہنے والا تھڑا صبح سے شام تک اکیلا رہتا ہے۔ تھڑے سے اس بے وفائی کا راز آخر کھل گیا۔ سلّو بھائی کام کرنے لگ گئے تھے۔ تھڑے کی ویرانی ان کے گھر مسکراہٹیں لے آئی تھی مگر کہتے ہیں نا چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، مگر اب کی بار اس کی وجہ سلّو بھائی کا نکما پن نہیں بلکہ ان کی بیماری تھی جو جانے دیمک کی طرح کب سے انہیں اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی کہ یہ کچھ دن کی خوشگوار تبدیلی سمجھنے سے پہلے شمع کا بھڑکنا ثابت ہوا۔ ان کی حالت اس بے حس مسافر کی تھی کہ جس نے چلنا شروع ہی کیا تھا کہ سفر ختم ہونے کا اشارہ مل گیا۔

''میں ابھی جینا چاہتا ہوں کام کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سارے پل جو میں نے اپنے ہاتھوں گنوا دیئے انہیں واپس تو نہیں لا سکتا مگر اپنے بیوی بچوں کو چند خوشیاں ضرور دینا چاہتا ہوں جسے وہ زندگی کا حاصل جانیں مگر یہ بیماری اب مجھے کچھ کرنے ہی نہیں دیتی۔'' ایک روز وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بہت مغموم ہو کر امی سے کہنے لگے تھے۔

''نہ بیٹا! افسردہ نہ ہو تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اپنی اور بیوی بچوں کی زندگی میں ضرور بہار لاؤ گے۔ خدا پر بھروسا رکھو، وہ سب سے بہتر کارساز ہے۔'' امی ان کو تسلی دیتی ہوئی بولی تھیں۔ اور پھر وہ ہنس کر تھڑے پر جا بیٹھے تھے۔ گو ان کی زندگی میں بہار بھری تبدیلی آ گئی تھی مگر ان کا دل بقول شاعر پاگل نکلا صحنِ گل چھوڑنے کے لیے پر تولتے لگا یوں کہ دن بہ دن ان کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ بیماری کی خزاں پوری طرح ان کے وجود پر چھا گئی تھی جسے وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ پھر ایک روز موت کی تیز ہوا اس خزاں رسیدہ پتے کو پل میں یہاں سے وہاں لے اڑی۔

آج جب میں بچوں کو اسکول سے لے کر آ رہی تھی تو خالی تھڑا خالی گل دان کی طرح اداس تھا۔ بلاشبہ سلّو بھائی ہی اس کا پھول تھے جس کے بکھرتے ہی وہ اپنا مصرف کھو بیٹھا اور میں سوچ رہی تھی اس قدر کمی کیوں محسوس ہو رہی ہے کہ کمی تو اس کی ہی محسوس ہوتی ہے جو ہماری ضرورت رہا ہو اور جو ضرورت ہو وہ ناکارہ کیسے ہو سکتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم گلی والے غلط تھے جو اپنا مصرف جانے بغیر انہیں بے مصرف سمجھتے رہے۔ ہم نے اندھیرے کو ہی سامنے رکھا یہ سوچے بغیر کہ اندھیرے میں ہی سویرے کا اجالا چھپا ہوتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آٹھویں منفرد کہانی

منگتا

راحت وفا راجپوت

اُس منگتے کی کہانی، جس کے ہاتھوں میں صرف کشکول کی کمی تھی

آج جاوید کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ صبح گھر سے بغیر ناشتا کیے نکلا تھا اور اپنی بیوی شازیہ سے جھگڑا بھی کر کے آیا تھا۔ حالانکہ اس کی بیوی بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے رات کو ہی اسے بتا دیا تھا کہ گھر میں انڈے، ڈبل روٹی اور دودھ کے پیکٹ ختم ہو گئے ہیں۔ صبح ناشتے کے لیے سامان لے آئیں مگر وہ رات کو کیبل پر انڈین فلم دیکھنے بیٹھ گیا۔ فلم دیکھنے کے بعد سستی کی وجہ سے وہیں سو گیا۔ صبح جب شازیہ سے ناشتا نہ نگا تو اس نے بتایا کچھ نہیں ہے۔ تو وہ بگڑنے لگا۔

''دوسروں کی بیویاں اتنا کام کرتی ہیں اور تم مارکیٹ جا کر ذرا سا سامان نہیں لا سکتیں۔ میں سارا دن گدھوں کی طرح کام کرتا ہوں اور گھر میں ڈھنگ سے کھانے پینے کو بھی نہیں ملتا۔'' شازیہ خاموش رہی۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ آپ نے ہی تو مجھے اکیلی بازار جانے سے منع کیا ہوا ہے۔ اصل میں شازیہ بہت خوبصورت تھی۔ دونوں بازار جاتے تھے تو جاوید نے محسوس کیا کہ دکاندار اور راستہ میں آنے جانے والے بہت توجہ سے اسے دیکھتے ہیں۔ یہ بات اسے بہت ناگوار گزرتی تھی۔ اس لیے اس نے شازیہ کو منع کر دیا کہ اکیلی بازار جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود ہی سودا سلف اور ضرورت کی چیزیں لے آتا تھا۔ اشد ضرورت کے وقت ہی وہ اسے بازار لے جاتا تھا۔

اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے اور ابھی تک ان کے اولاد نہیں ہوئی تھی۔ جاوید خود عام مردوں جیسا ہی تھا۔ ہر عورت کو گھورنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور بہت بے باکی سے عورتوں کو تکتا تھا۔ ایسے مرد اپنی عورتوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں جو دوسروں کی بیویوں کو تاڑتے ہیں۔ اب وہ غصے سے گھر سے تو نکل آیا تھا مگر اب بھوک سے برا حال تھا۔

جاوید کی مین بازار میں فوٹو کاپی کرنے اور اسٹیشنری کی دوکان تھی۔ بازار دیر سے ہی کھلتا تھا، وہ بہت صبح آ گیا تھا۔ ابھی جمعدار صفائی کر رہا تھا۔ وہ دکان کھول کر چیزیں سیٹ کرنے لگا تو اس کی نظر ایک بھکاری لڑکے پر پڑی۔ پچھلے ایک سال سے وہ لڑکا اس بازار میں بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ پولیو زدہ تھی اور وہ بے ساکھی کے سہارے کھڑا رہتا تھا۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹانگ لٹکتی رہتی تھی۔ وہ شام تک وہیں رہتا اور بھیک مانگتا۔ نہ جانے کیوں جاوید کو پہلے دن سے ہی وہ بہت برا لگتا تھا۔ اس کی سوکھی ہوئی ٹانگ سے اسے کراہیت آتی تھی۔ جاوید کو دکان کھولتے دیکھ کر وہ ٹھک ٹھک کرتا آگے بڑھ آیا اور کہنے لگا۔

''صاحب! آج ناشتا نہیں کیا۔ کچھ اللہ کے نام پر دے دو۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔''

جاوید کا تو پہلے ہی دماغ گرم ہو رہا تھا اسے دیکھ کر اور کوفت ہونے لگی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''جاؤ معاف کرو۔''

''تمہاری مہربانی ہے صاحب! ایک کپ چائے کا ہی پلادو۔'' وہ لجاجت سے بولا۔ جاوید تو غصے سے پاگل ہوگیا۔ دکان سے نیچے اترا اور اس کے قریب آکر اسے زور سے دھکا دیا۔ بھکاری زمین پر گر پڑا۔

''دماغ کھالیا ہے۔ چل دفع ہو منگتا کہیں کا۔''

وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور شرمسار سا ٹھک ٹھک کرتا دور جاکر کھڑا ہوگیا۔ جاوید کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ پیٹ میں بھوک سے گرہیں پڑ رہی تھیں۔ کھانے پینے کی ساری دکانیں بازار سے باہر سڑک پر تھیں اور جولڑکا اس نے ہیلپ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی دس بجے آتا تھا۔ ایک بار پھر اسے اپنی بیوی پر شدید غصہ آنے لگا۔ کیسی لاپروا عورت ہے خاوند کا کچھ خیال نہیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے کانوں میں گڑوی بجانے کی آواز آئی۔ وہ الرٹ ہوکر دیکھنے لگا۔ وہ گڑوی بجاتی ہوئی قریب آرہی تھی۔ یہ لڑکی کافی دنوں سے آرہی تھی بے حد خوب صورت گوری چٹی اور قیامت خیز سراپے کی مالک تھی۔ دکان دکان جاکر بھیک مانگتی تھی۔ جاوید اسے دیکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ کئی بار اشاروں کنائیوں میں لالچ دے چکا تھا مگر وہ ہاتھ نہیں آتی تھی۔

''اے باؤ! کچھ پیسے دو نا۔ کل تو دھندا نہیں ہوا۔ آج تو ناشتا بھی نہیں کیا۔ کچھ کھانے کو لینا ہے۔ تھوڑے پیسے دو نا۔''

''اندر آجاؤ! میں نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ حلوہ پوری کا ناشتا کراتا ہوں۔'' وہ دکان کے اندر آگئی۔

''اچھا لاؤ پیسے دو۔ بہت بھوک لگی ہے۔''

''تم بیٹھو میں لے کر آتا ہوں۔'' جاوید نے دکان کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں اس نے پردہ لگا کر عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ کئی بار فوٹو اسٹیٹ کروانے کا کام زیادہ ہوتا تو وہ عورتوں کو وہاں بٹھا دیتا تھا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔

''نہیں میں خود لے لوں گی تم پیسے دے دو۔'' بازار ابھی سنسان تھا۔ جمعدار بھی صفائی کرتے کرتے دور نکل گیا تھا۔ جاوید کے اندر کا شیطان جاگ گیا تھا۔ لڑکی کے انکار سے اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''تم بیٹھو میں تمہیں بڑا خوب صورت سوٹ بھی دوں گا۔'' وہ اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بازو چھڑا کر بولی۔

''تم ٹائم ضائع کررہے ہو میرا۔ نہیں دینے پیسے تو نہیں سہی۔'' یہ کہہ کر وہ دکان سے باہر جانے کے لیے مڑی۔

''بیٹھو نا۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''دیتا ہوں پیسے۔''

''نہیں باؤ رہنے دو میں جارہی ہوں۔''

جاوید آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ لڑکی نے زور سے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور میز کو پکڑ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے کرتے بھی نیچے گر پڑا۔

''چل ہٹ دفع دور۔ منگتا کہیں کا۔'' وہ نفرت سے بول کر دوکان سے نکل گئی۔

جاوید جلدی سے اٹھا اور کپڑے جھاڑ کر باہر دیکھنے لگا۔ شرمندگی سے لڑکی کو دل میں گالیاں دینے لگا۔ پھر اس کی نظر دور کھڑے بھکاری لڑکے پر پڑی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ جاوید نے نظریں چرائیں اسے لگا اس بھکاری کی نظریں کہہ رہی ہیں۔

''تم بھی میری طرح منگتے ہو۔''

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نویں منفرد کہانی

جوانی دیوانی

نفیسہ فضل

رشتوں کو پامال کردینے والی جوانی کی رنگین اور سنگین داستان

پاکستان بننے کے بعد کا یہ قصہ ہے۔ جب ہم پرانی انار کلی لاہور میں ایک بلڈنگ میں کرائے پر رہائش پذیر ہوئے۔ میری سسرال کافی بڑی ہے۔ میری ساس، سسر، نانی ساس، ماموں سسر، سات دیور، تین نندیں، میں اور میرے شوہر مل کر کل سولہ افراد بنتے تھے۔ میری عمر اس وقت چودہ سال تھی اتنا بڑا سسرال اور میں کم عمر تھی۔ گھر کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہی تھی۔

جب میں آٹھ سال کی تھی والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ ایک بھائی تھا جس کی عمر صرف ایک سال تھی۔ والد صاحب کے بعد جو جمع پونجی تھی۔ وہ ختم ہوگئی تو والدہ نے سلائی کڑھائی شروع کردی۔ کروشیہ کا کام اور سوئیٹر اماں بہت اچھے بناتی تھیں۔ جس سے چند آنے مل جاتے تھے۔ ہم روکھی سوکھی کھا لیتے خیر وقت گزرتا گیا اگر میں اپنی روداد سنانے بیٹھ گئی تو صفحات بھر جائیں گے مگر میری درد بھری داستان ختم نہ ہوگی۔

ہاں تو اسی دن رات کے چکر میں تین سال گزر گئے۔ ایک دن روٹی پکاتے ہوئے مجھے چکر آئے اور قے ہوگئی سب کہنے لگی کہ آج گرمی بہت ہے اس لیے دلہن کی طبیعت خراب ہوگئی ہے مگر تین چار دن تک یہ ہی سلسلہ چلتا رہا تو نانی ساس نے میری ساس سے کہا۔

''سکینہ دلہن کو نوری دائی کو دکھا۔ مجھے تو خوش خبری کے آثار نظر آرہے ہیں۔ دیکھ تو اس کا رنگ کیسا پیلا پڑ گیا آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں۔''

ساس اماں نے اسی وقت میری چھوٹی نند کو نوری دائی کو بلانے کے لیے دوڑا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نوری دائی ہانپتی کانپتی دوڑی چلی آئیں۔ انہوں نے مجھے چیک کیا اور خوش خبری سنائی۔ ''لو بھئی سکینہ تم دادی بننے والی ہو مٹھائی کھلاؤ۔''

اس طرح نوری دائی کا ہر تیسرے چوتھے روز ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوگیا اس زمانے میں ڈاکٹرز، اسپتالوں کا رواج تو تھا نہیں۔ جب بھی نوری دائی آتیں اماں جان اور نانی جان سے خوب گپ شپ لگاتیں۔ دلی کے قصے کہانیاں اور نوری خالہ ہم انہیں خالہ کہنے لگے تھے۔ خوب محلے کی باتیں کرتی تھیں میں تو کام میں لگی رہتی تھی چھوٹے دیور اور نند اپنے کھیلوں میں جب کہ بڑے اسکول اور کارخانے جاتے تھے۔

ایک دن نوری خالہ آئیں تو میں انہیں چائے دینے کمرے میں گئی۔ نوری خالہ اماں جان سے بڑی رازداری سے کہہ رہی تھیں۔

''سکینہ بڑا ہی برا زمانہ آگیا ہے۔'' اماں جان نے کہا۔

''کیا ہوا؟''

تو نوری خالہ بولیں۔ ''یہاں سے چار گلیاں چھوڑ کر جو اونچا سا مکان ہے اس میں لکھنو سے آئے ہوئے نواب حشمت علی خان، ان کی بیگم شاہجہاں اپنے چار بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تو پھر اماں جان چپ نہ رہ سکیں۔

''ان کی چھوٹی بیٹی اور دوسرے نمبر کا بیٹا دو دن سے لاپتا ہیں بڑی ڈھنڈیا پڑی ہے۔ عزت دار گھرانا ہے ماں اور بہن کا تو رو رو کے برا حال ہے۔ شاہ جہاں بیگم کو تو دورے پڑ رہے ہیں۔ پورا لاہور چھان مارا تھانے میں رپورٹ درج کرادی کہ کسی نے اغوا نہ کرلیا ہو۔

یہ دونوں بہن بھائی بہت پیار کرتے تھے جب کہ چھوٹی راحیلہ سب کی ہی لاڈلی تھی۔ کانسی سی صورت سرخ سفید رنگ نازک گڑیا کانچ کی کٹتی تھی۔ یہ بھائی ہر وقت بہن کے آگے پیچھے پھرتا۔ کبھی چوڑیاں پراندہ کبھی کلپ تو کبھی ہار بندے لیے چلا آتا۔ بڑی بہن کہتی میرے لیے کیا لائے ہو عظمت علی خان؟ تو ہنس کر کہتا۔

''راحیلہ چھوٹی ہے ناں شکیلہ آپا اس لیے اس کے لیے لاتا ہوں۔'' ہوتے ہوتے پوری پرانی انارکلی میں چرچا ہوگیا نجانے نواب حشمت علی خان کے بیٹے، بیٹی کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

☆.....☆

نوری خالہ دس پندرہ دن بعد آئیں تو بڑی خاموش تھیں۔ نانی جان نے کہا۔

''ارے نوری خیر تو ہے آج تُو بہت اداس ہے۔'' یہ سنتے ہی نوری خالہ ایک دم سے رو پڑیں۔ ہم سب پریشان ہوگئے میں جلدی سے پانی کا گلاس صراحی سے بھر لائی جب وہ پانی پی چکیں تو گویا ہوئیں ''آپا غضب ہوگیا آپ کو کچھ پتا نہیں چلا؟''

اماں جان بولیں۔ ''کچھ بتاؤ گی بھی یا پہیلیاں بجھواتی رہو گی؟''

تب نوری خالہ بولیں۔ ''وہ نواب حشمت علی خان کے بیٹے عظمت علی خان اور بیٹی راحیلہ مل گئی تھیں۔''

''تھیں سے کیا مطلب کب ملی کہاں سے ملی؟'' اماں جان نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

''آپا سکینہ ایک ہفتے قبل نواب حشمت علی خان کو تھانے بلایا کہ تمہارے بچے مل گئے ہیں۔ جب یہ لوگ تھانے پہنچے تو ان سے کہا کہ آپ کو ہمارے ساتھ سیالکوٹ کے ایک گاؤں چلنا ہوگا۔ آپ کے بچے وہاں ہیں آپ چل کر پہچان لیں کہ وہ آپ کے ہی بچے ہیں۔ نواب صاحب اپنے بڑے بیٹے شوکت علی خان کے ہمراہ پولیس کی گاڑی میں گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں گاؤں کی مسجد میں امام صاحب کے پاس چند افراد کے ساتھ عظمت علی اور چادر میں لپٹی راحیلہ بیٹھی تھی۔

اپنے والد اور بھائی کے ساتھ پولیس کو دیکھ کر ان کی جان ہی نکل گئی رنگ سفید پڑ گیا۔ تب ہی امام صاحب نے نواب صاحب سے پوچھا۔ ''آپ جانتے ہیں ان بچوں کو؟''

''ہاں کیوں نہیں یہ میرا بیٹا عظمت اور بیٹی راحیلہ ہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟'' نواب صاحب نے پوچھا۔

''یہ آج صبح میرے حجرے میں تشریف لائے تھے کہ ان کا نکاح ان صاحبزادی کے ساتھ پڑھا دیا جائے۔ میں نے یہ تین چار بندے جمع کیے نکاح کے لیے جب دونوں کے والد صاحب کا نام معلوم کیا تو دونوں نے ایک ہی نام بتایا تو ہم چونک گئے۔ اسی گھبراہٹ میں بیٹی کے چہرے سے چادر سرک گئی میں چونک اٹھا دونوں کی شکل اس قدر ملتی ہے کہ میں نکاح نہ پڑھا سکا کہ کوئی گڑبڑ ہے انہیں ہم نے روک کر سیالکوٹ تھانے خبر کی.....'' عظمت کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا جب کہ راحیلہ زار و قطار رو رہی تھی۔ حشمت علی خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ وہیں بیٹھتے چلے گئے۔ پھر نجانے کس طرح یہ لوگ اپنے گھر واپس آئے۔

راحیلہ نے اپنی ماں کو بتایا کہ ''جب اسے پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو ڈر کے مارے ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ لاہور سے باہر کسی گاؤں میں جا کر ہم نکاح کر لیتے ہیں کسی کو پتا نہیں چلے گا اور ہم بدنامی سے بچ جائیں گے مگر ہمارے اتنے بڑے گناہ کی سزا تو ہمیں ملنی تھی اور پھر اسی رات نواب حشمت علی نے اپنی بندوق سے اپنے ہی دل کے ٹکڑوں کو گولی مار کے اپنے آپ کو کنپٹی پر گولی مار کے ختم کر دیا۔'' یہ کہہ کر نوری خالہ پھر رونے لگیں اور ہم اس پاکیزہ رشتے کی پاکیزگی کو پامال کرنے والے بہن بھائیوں کو روتے رہے۔

خالہ نوری تو اپنے گھر چلی گئیں میں رات بھر نہ سو سکی۔

جب ایک ہفتہ بعد خالہ نوری آئیں اماں جان نے نواب حشمت علی خان کی فیملی کا پوچھا تو انہوں نے بتایا۔

''وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ ایک ماہ بعد اللہ پاک نے مجھے چاند سا بیٹا عطا کیا جس کا نام دادا نے محمد یوسف رکھا پھر نوری خالہ کا آنا کم ہوگیا اور میری بیٹی فہمیدہ کی پیدائش پر وہ ہی آئی تھیں۔ جب فہمیدہ چھ ماہ کی تھی تو ہم الگ ہوگئے اور مزنگ میں گھر لے لیا۔

مگر آج بھی کبھی کبھی نواب صاحب اور ان کی فیملی یاد آجاتی ہے جن سے میں کبھی نہیں ملی تھی تو دل ڈوب جاتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دسویں منفرد کہانی

دیالو

فلک شیر تابش

اِک ظالم ڈاکو کی رحم دلی کی داستانِ رفتہ، جسے فلک شیر تابش نے زندہ کیا

ڈاکوؤں کے پتھر جیسے دل عام طور پر موم نہیں ہوا کرتے مگر وہ لمحہ پتا نہیں کیسا لطیف تھا جس نے ظالم سنگھ سائیں جیسے ڈاکوؤں کے سردار کا دل بھی پگھلا کر رکھ دیا۔ بات صرف اتنی سی تھی جو بچہ اغوا کر کے اس کے آدمی لائے تھے وہ کل سے رو رو کر بے حال ہو رہا تھا۔ ویسے یہ بھی کوئی نئی بات نہ تھی۔ شروع شروع میں بھی اغوا ہونے والے بچے روتے ہیں لیکن پھر حالات سے سمجھوتا کر لیتے ہیں اور صبر کے ساتھ ساتھ بہتر حالات کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اس سے ڈاکوؤں کو بھی اطمینان ہو جاتا ہے۔ وہ بھی صبر و ضبط سے معاوضہ ملنے کے منتظر رہتے ہیں۔

اس بچے کا معاملہ ذرا پریشان کن تھا۔ اسے آئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو رہے تھے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں وہ ایک پل بھی نہیں سویا تھا۔ مزید یہ کہ وہ رونا بند کرتا تو کسی زخمی پرندے کی طرح زمین پر لوٹنا شروع کر دیتا۔ لوٹتے لوٹتے اس کے گھٹنے اور بازو چھل گئے تھے۔ چہرے پر بھی کتنی ہی خراشیں آ چکی تھیں اور اس کا چہرہ عجیب ڈراؤنا سا ہو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں اس نے کھانا تو درکنار، پانی کی ایک بوند بھی حلق سے نہیں اتاری تھی۔ اسی لیے اس کے ہونٹ سوکھ چکے تھے اور چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس قسم کی باتوں کا ڈاکوؤں اور لٹیروں پر زیادہ اثر نہیں ہوا کرتا۔ بچہ روتا ہے تو روتا رہے کیا لیتا ہے؟

ادھر ڈاکوؤں کے جاسوس خبر لائے کہ ”بچے کی ماں پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ اس کے منہ پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لایا جاتا ہے تو وہ بچے کا نام لے کر پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔“ اغوا ہونے والے بچوں کے گھر میں اس قسم کی پریشانیاں عام طور پر اغوا کاروں کا کام آسان کر دیتی ہیں۔ گھر والے مقررہ وقت پر منہ مانگی رقم لے کر بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جاتے ہیں مگر اس مرتبہ اغوا کیے ہوئے بچے کا تڑپنا، بلکنا، مچلنا اور کھانے پینے سے گریز ڈاکوؤں کے لیے خاصا پریشان کن مسئلہ بن گیا تھا۔

بچے کی پیدا کی ہوئی مصیبت کے ساتھ ہی ایک اور عجیب واقعہ بھی ہو گیا۔ ہوا یوں کہ جس پیڑ کے نیچے بچہ سردار سکندر سائیں کے قدموں تلے پڑا تڑپ رہا تھا۔ اسی درخت کی کسی شاخ پر چڑیوں کا ایک گھونسلہ تھا۔ اس گھونسلے میں کچھ دن سے چڑیوں کے دو ننھے ننھے بچے چوں چوں کیا کرتے تھے۔ شام کے وقت جب نر اور مادہ کے واپس لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ ننھے ننھے بچے اپنے ماں باپ کو دیکھ کر ایسے نہال ہو جاتے کہ اور بھی زور زور سے چہچہانے لگتے۔

معلوم نہیں ظالم سنگھ کا دھیان کیسے چڑیوں کے اس کنبے کی طرف چلا گیا۔ وہ روز شام کے وقت چڑیوں کو اپنے بچوں کو دانہ کھلاتے دیکھتا۔ ان کی محبت اور لگاؤ کا یہ منظر اسے بڑا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچھا لگتا تھا۔ ایک دن ایک چیل کی نظر چڑیوں کے ان معصوم پوٹوں پر پڑ گئی اور وہ ان میں سے ایک کو اپنے پنجوں میں جھپٹ کر اڑا لے گئی۔ اس شام چڑیوں کے جوڑے کی پریشانی اور صدمے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا جب انہوں نے اپنے گھونسلے میں صرف ایک ہی بچہ دیکھا۔ وہ رات گئے تک گھونسلے کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر شور مچاتے رہے۔ اس جوڑے کی درد بھری چیخیں سن سن کر ڈاکوؤں کے سردار کا دل بھر آیا اور وہ ساری رات چین سے نہ سو سکا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے ایک ڈاکو کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ بندوق لے کر اس درخت کا پہرہ دے اور کسی چیل وغیرہ کو اس گھونسلے کے پاس نہ پھٹکنے دے..... اب اسے اتفاق کہیے جس وقت وہ اغوا کیا ہوا بچہ اپنے گھونسلے سے پھسلا اور سردار کی گود میں آ گرا۔ سردار کتنی دیر تک اس ننھی سی جان ہاتھوں میں لے کر تکتا رہا۔ بچہ بار بار اپنی چونچ کھول رہا تھا اور بند کر رہا تھا۔ اپنی ہتھیلی پر چڑیا کے بچے کے جسم کی گرمی سردار کو بڑی راحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ گرمی اس کے جسم میں سرسراتی ہوئی اس کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ رہی ہے۔

اس وقت شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ پرندوں کے لوٹنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ پتا نہیں سردار کے دل میں چڑیوں کے جوڑے کی پریشانی کا درد تھا یا اپنی روح کی تسکین کا جذبہ اس نے ایک نظر سہمے ہوئے چڑیا کے بچے کی طرف دیکھا اور پھر ایک جوان کو حکم دیا کہ وہ درخت پر چڑھ کر بچہ گھونسلے میں پہنچا دے۔ جیسے ہی اس کا آدمی چڑیا کے بچے کو پیڑ پر رکھ کر نیچے اترا اسی دم چڑیوں کا جوڑا لوٹ آیا۔ بچے نے چہچہاتے ہوئے ان کا استقبال کیا تو سردار کو بڑی خوشی ہوئی۔ اسی لمحے اغوا کیا ہوا بچہ جواب تک چڑیا کے بچے کو دیکھ کر بہلا ہوا تھا زور زور سے چلانے لگا۔

سردار نے گھونسلے سے نظریں ہٹا کر اس بچے کی طرف دیکھا جو زمین پر لوٹ لوٹ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں ابھی جو نرمی چڑیا کے بچے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ کچھ اور زور پکڑ گئی۔ اس کا پتھر جیسا دل کچھ اور پگھلا اور اس نے اپنے جوانوں کو مہم پر روانگی کا حکم دینے کے لیے اپنی مخصوص تالی بجائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس گھڑ سوار پوری طرح لیس، گھوڑوں کی لگامیں تھامے اس کے سامنے حاضر ہو گئے۔ وہ سارے کے سارے تھوڑی دیر پہلے چڑیا کے بچے کو گھونسلے میں پہنچانے کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ سردار کا دل پسیج گیا ہے اور وہ یہ بچہ بھی ماں باپ کے پاس واپس چھوڑ آنے کا حکم دینے والا ہے۔ ایک اعتبار سے ان کا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ سردار کا دل واقعی نرم ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر تھی کسی سختی کے آثار نہیں تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے دونوں بازو پیچھے کی طرف باندھے تیز تیز قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ جیسے کوئی اہم فیصلہ کرنے والا ہو۔

پھر ایک دم وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ کر اپنے ماتحت جوانوں کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

''مجھے اس بچے پر بڑا ترس آ رہا ہے۔ میں نے بچے کو ماں سے جدا کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس لیے فوراً جاؤ اور اس کی ماں کو بھی اغوا کر کے لے آؤ تاکہ ماں اور بچہ دونوں ایک ساتھ رہ سکیں اور سیٹھ کو بتا دینا کہ اب معاوضے کی رقم ایک لاکھ کے بجائے سوا لاکھ ہوگی۔ دو جانوں کا معاوضہ کچھ تو زیادہ ہونا چاہیے۔'' یہ حکم دے کر سردار دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ آج اس نے دو نیک کام کیے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گیارہویں منفرد کہانی

ڈنکر

اعجاز احمد فکرال

مختصر نمبر کے لیے ایک حساس اور سوچ کے در وا کر دینے والی المیہ تحریر

الماس کا تعلق کیونکہ تنگدست فیملی سے تھا۔ لہٰذا اس نے جوانی میں قدم رکھتے ہی اپنی مالی حالت بدلنے کی ٹھان لی اور یہاں روزگار نہ ملنے کے باعث اُس نے اپنی تقدیر بدلنے کیلئے سفر وسیلہ ظفر کو بہتر جانا۔ اس نے شخصی ضمانت پر قرضہ لیا اور کچھ جائیداد رہن رکھ کر سود پر رقم حاصل کی۔ پھر اس نے انسانی سمگلنگ کے ایک ماہر فریبی، منجھے ہوئے ایجنٹ سے رابطہ کر کے یورپ پہنچنے کا معاوضہ طے کیا۔ ایک دن الماس زندگی کی ہار جیت کی تمام حدیں توڑ کر غیر قانونی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان کے قافلے میں کل بیس لوگ تھے۔ ان بیس لوگوں کے بیسیوں مسائل تھے۔ ایک دن ایجنٹ نے سب کو کوئٹہ پہنچنے کا رپڈ سگنل دے دیا۔ سب سے پہلے ہومند بارڈر سے ایران غیر قانونی طور پر داخل ہونا تھا۔ پاکستان سے ایران غیر قانونی طور پر داخل ہونے کے لئے یار خان ایجنٹ نے تین تین ہزار روپے لئے اور تہران پہنچا دیا۔ تہران وہ جس جگہ پہنچے، یہاں ایک فیکٹری کے کمرے میں پچھ اور لوگ بھی چھپے بیٹھے تھے۔ کمرے کی چھت ٹین کی بنی ہوئی تھی اور بارش ہونے کی وجہ سے کئی جگہوں سے ٹپک رہی تھی۔ کمرے کے درمیان گیلی لکڑیوں کی آگ جل رہی تھی اور سب کیلئے کھانا تیار کیا جا رہا تھا۔ یہ کھانا شار نامی ایجنٹ کی طرف سے ڈنکروں کیلئے تیار کیا جا رہا تھا۔

صبح کٹھن سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ایجنٹوں نے جھانسہ دیا تھا کہ بسوں پر جائیں گے۔ مگر پہاڑی راستوں سے پیدل لے جایا گیا۔ سب اٹھارہ گھنٹے پیدل چلتے رہے۔ کہیں تپش جیسی دھوپ اور کہیں گہرا اندھیرا۔ یہ راستہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس راستے سے پکڑے جانے کا خطرہ کم تھا۔ تمبوڑی جتنے مچھر انھیں خوراک سمجھ کر کاٹنے لگے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ یہاں حشرات الارض کو بھی کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ مچھروں کے کاٹنے سے کچھ ڈنکروں کو بخار چڑھ گیا۔ یہاں پر پاکستانی اور دوسرے غریب ملکوں کے لوگوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ قدم قدم پر موت نظر آ رہی تھی۔

سب نے سفر جاری رکھا کیونکہ غیر قانونی طور پر پکڑے جانے کے خدشات اور فائرنگ کی صورت میں موت نے سب کے اعصاب شکن اور خون خشک کیا ہوا تھا۔ بھوک پیاس سے نڈھال جسم چلتے رہے۔

اچانک ایک طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ان کے آس پاس گولیاں برسنے لگیں کہ کوسٹ گارڈ نے گھیرا ڈال لیا تھا۔ رات کو لاشیں جلتی ہوئی دیکھ کر الماس نے شار ایجنٹ سے پوچھا۔

''ہم اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے یا سرحدی محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے یا گرفتار ہو کر فولادی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزاریں گے؟''

شار ایجنٹ نے ڈانٹ کر جواب دیا، ''مر کہاں رہے ہیں۔ کوسٹ گارڈ رات کو ڈنکروں اور ایجنٹوں کو خبردار کرنے کے لئے ہوائی فائرنگ کرتی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

الماس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر مجھے گولیاں لگ گئیں تو یورپ میں میرا ڈھیروں روپے کمانے کا خواب ادھورا رہ جائے گا اور میں تو اپنی خاندانی جائیداد رہن رکھ کر آیا ہوں یا پھر میری جمع پونجی انسانی سمگلروں کے ہاتھوں میں ہی رہے گی۔'' ایک دوسرے ڈنکر جس کا نام الیاس تھا نے الماس سے کہا کہ'' دوست مجھے تو یہ خوف ستا رہا ہے جو لوگ دوسرے ملکوں کی جیلوں میں قید ہیں کہیں ہم ان جیسے نہ بن جائیں اور قید کے بعد سزا کا اذیت ناک مرحلہ شروع ہو جائے۔''

الماس نے بے تکے سوال پر بے تکا جواب دیا'' کیا واہیات بک رہے ہو۔''

''کمبخت سزا مکمل ہونے کے بعد بھی رہا نہیں کرتے۔''

الیاس نے گھبراہٹ میں یہ کہہ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

الماس متحیر نظروں سے الیاس کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک پاس بیٹھے گھبرائے ہوئے شخص نے کہا جس کا نام امجد تھا۔'' دوست تم کیا جانو! یورپ تو ہم نوجوانوں کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ میں تو زندگی داؤ پر لگا کر جا رہا ہوں۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔'' یکدم الیاس بیچ میں بول پڑا'' اگر پکڑے جاؤ تو واپس آنے کی سکت ہی نہیں رہتی۔''

شارا ایجنٹ ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور تینوں سے کہا'' یورپ پہنچنے کا راستہ جہنم زار ہے۔ ایک بار پہنچ جاؤ تو سب خواب پورے ہو جاتے ہیں۔''

امجد نے کہا'' ایک ایجنٹ نے مجھ سے کہا تھا، جعلی کاغذات تیار کر کے میں تمہیں یورپ بھجوا دیتا ہوں، مگر میں ایئر پورٹ پر گرفتاری کے خوف سے ڈر گیا اور اوریجنل ویزہ تو ملتا ہی نہیں۔ بائی پلین ایجنٹوں کا ریٹ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج سے دس سال پہلے یہ کام ایک لاکھ روپے میں ہوتا تھا۔ اب دس لاکھ میں بھی نہیں ہوتا۔ اب میرے پاس سرمایہ کم ہے۔ اس لئے یہ غیر قانونی روٹ اختیار کیا ہے۔''

الیاس نے حسرت بھری نظروں سے شارا ایجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' دوست ہم کو کسی بھی طرح ایک بار شمن پہنچا دو، ہم نے ہر قسم کا خطرہ مول لینے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔''

شارا ایجنٹ نے جواب دیا'' ہاں شمن ہی بہتر ہے ایک جگہ خطرہ محسوس ہو تو دوسرے ملک میں نام پتہ بدل کر جایا جا سکتا ہے۔''

''پچھلے سفر میں یونان اور سسلی کے ساحل پر کشتی الٹ گئی تھی میں بچ گیا تھا، اب دوبارہ جا رہا ہوں۔'' الیاس نے سب کو بتایا۔'' یورپ جانے کی خواہش ایسی ہے بندہ مرتا ہے خواہش نہیں مرتی۔'' شارا ایجنٹ نے کہا۔

الماس نے پوچھا'' ایسا کیوں ہے؟''

''اس خواہش کے پیچھے خواہشات کی تکمیل ہے۔'' الیاس نے جواب دیا۔

اب تک شارا ایجنٹ ان کے پاس سے دور جا چکا تھا اور ایک اجنبی شخص ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

الیاس نے اس نوجوان سے پوچھا'' تم کیسے جا رہے ہو؟'' اس شخص نے جواب دیا'' مجھے تو شارا ایجنٹ نے اسپین پہنچا کر رقم لینے کا وعدہ کیا ہے۔ اسپین پہنچ کر میں گھر ٹیلی فون کروں گا پھر شارا ایجنٹ رقم وصول کرے گا۔''

الماس نے پوچھا'' ایسا کیوں؟''

اس شخص نے جواب دیا'' پہلے بھی ایک شخص نے باتوں میں لگا کر مجھ سے رقم بٹور لی تھی۔''

شارا ایجنٹ پھر ان کے پاس واپس آیا اور سب کو قریب بلا کر ان کے آگے کھردری صاف جگہ پر نقشہ پھیلا دیا اور کہا'' دیکھو یہ یورپ جانے کا روٹ ہے۔ روس، ترکی، البانیہ، جنوبی افریقہ مگر تمام راستے بہت کٹھن ہیں، اگر ہم پولینڈ کے راستے جائیں تو سرحدی پولیس کے ہاتھوں مارے جانے کا خدشہ ہے، اگر ترکی سے یونان جائیں تو یونان کی کوسٹ گارڈ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔"

یہ باتیں سن کر کچھ چہرے حیرت زدہ ہوگئے۔

نثار ایجنٹ نے ان سے کہا، "پہلے جانا آسان تھا۔ نائن الیون کے بعد کام بہت خراب ہوگیا ہے۔ اب تمام بارڈر فورسس چوکنا رہتی ہیں، اجنبی کو دیکھتے ہی گولی مار دیتی ہیں۔"

الماس بیچ میں بول پڑا، "مگر میں تو یونان پہنچ کر سیاسی پناہ حاصل کرنے کا خواہش مند ہوں۔" نثار ایجنٹ نے الماس کے تیور دیکھ کر جواب دیا، "یورپ کی حکومتیں کیا کریں، کتنے لوگوں کو نیشنلٹی دیں۔ بحرحال اندھیرا ہوتے ہی ہمیں یہاں سے کوچ کرنا ہے۔ اپنے آپ کو تیار رکھو۔"

شام کے سورج کی سرخی ذرا کم ہوئی تو سب چل پڑے۔ پتھریلے پہاڑوں نے ان کے پاؤں چھیل دیے تھے۔ نثار ایجنٹ ایک ٹھکانے پر پہنچ کر کھڑا ہوگیا اور سب سے کہا، "کچھ دیر آرام کرلو۔"

وہاں کچھ انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے دیکھ کر سب گھبرا گئے۔ ڈھانچے دیکھ کر کچھ آوازیں خوف سے بلند ہوئیں، "یہاں۔"

نثار ایجنٹ نے ڈھانچوں کو دیکھ کر جواب دیا، "گھبراؤ نہیں! ایک بار ہمارے ایک قافلے پر یہاں فائرنگ ہوگئی تھی، کچھ لوگ مارے گئے تھے، یہ ان لوگوں کے ڈھانچے ہیں، تم حوصلے بلند رکھو، اب ایسا نہیں ہے۔"

سب خاموش ہوکر سہم گئے۔

کچھ گھنٹے آرام کے بعد وہ پھر چل پڑے۔ ایران اور ترکی کے بارڈر برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ برفوں پر پیدل چلتے چلتے کچھ لوگوں کے پاؤں گل گئے۔ راستے کی برفباری اور بارش سے وہ ٹھٹھرنے لگے۔ راستے کی سوکھی روٹیاں گیلی ہوگئیں۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کیا۔ پریشانیاں ساتھ ساتھ سفر کرتی رہیں۔ سردی سے بچنے کا ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کالے پانی کے شور نے انھیں علیحدہ تنگ کیے رکھا۔ لوہے کے پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والا پانی پی پی کر ان کی آنتیں خراب ہونے لگیں۔ برف سے ڈھکے پہاڑوں میں برف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہلکی سی سورج کی روشنی نکلنے سے ان کو پتا چلتا تھا، دن چڑھ گیا ہے۔ جن کے پاؤں گل گئے تھے کچھ ڈنکروں نے ان کو وہیں چھوڑا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ لوگ بارڈر فورس کے ہتھے چڑھ کر مارے گئے۔ ایک شخص نے بیماری کی وجہ سے دوائی کیلئے شور مچایا تو ایجنٹ نے اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ ایجنٹوں نے لاش کو وہیں چھوڑا اور آگے بڑھ گئے۔ وہ چلتے رہتے۔ راستے کا اگلا ہر ایجنٹ ان سے اگلی منزل کا کرایہ وصول کرکے آگے پہنچا دیتا تھا۔ مگر نثار ایجنٹ ان کے ساتھ ہی رہا۔ اس طرح ایجنٹ اپنا معاوضہ کھرا کرلیتے۔ اس طرح الماس، الیاس، امجد اور کچھ دیگر ترکی پہنچ گئے۔ یہاں سے ان کو یونان کیلئے روانہ ہونا تھا۔

ترکی داخل ہوکر وہ بذریعہ ٹرین استنبول پہنچ گئے یہاں سے ایک اور خطرناک مرحلہ شروع ہوگیا۔ ترکی سے انھوں نے چھوٹی کشتی کے ذریعے سمندر پار کرنے کی کوشش کی یعنی ڈنکی لگائی۔ ایجنٹ نے انھیں کشتی میں بھیڑ بکریوں کی طرح دھکیل دیا۔ زیادہ وزن ہونے کی وجہ سے کشتی ایک سنگلاخ چٹان سے ٹکرا گئی۔ بعد میں پتا چلا کے ان کو یونانی کوسٹ گارڈ نے دیکھ لیا تھا۔ کشتی شکستہ حالت میں تھی اس کو مرمت کروا کر لایا گیا تھا۔ کشتی تو غرق ہوچکی تھی۔ ایجنٹ نے تمام ڈنکروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور دریا کنارے کھڑا کر کے کہا، "میرا ایک بندہ یہ رسی لے کر دوسرے کنارے پر جارہا ہے۔ پانی بہت کم ہے۔ بعد میں تم ایک ایک رسی پکڑ کر دوسرے کنارے پہنچ جانا۔"

چنانچہ آپریشن شروع ہوگیا۔ یکدم یونانی کوسٹ گارڈ کی گاڑیاں تڑتڑاتی گولیاں برساتی ہوئیں ان کے نزدیک پہنچ گئیں۔ گھبراہٹ میں بہت سے لوگوں سے رسی چھوٹ گئی۔ کچھ تو مارے گئے، کچھ پکڑے گئے۔ جو دریا میں بہہ گئے ان میں ایک الماس بھی تھا۔ الماس کنارے لگا تو سوچنے لگا اب آگے سفر کیسے طے کرے۔ اس وقت اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ وہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسے خیال آیا کہ پاکستان سے یونان، ترکی مغرب کی طرف ہے۔ وہ صبح سورج نکلنے اور غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا تاکہ سورج کی سمت کا تعین ہوسکے۔ یہ سوچ کر اس نے زمین پر کچی جگہ صاف کرکے کچھ لکیریں کھینچیں اور ایک لکڑی گاڑھ دی۔ وہ سارا دن سورج کا جائزہ لیتا رہا۔ اگلے دن مغرب کی طرف چل پڑا اور ایک سڑک تک پہنچ گیا۔ مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا یہ یونان ہے یا ترکی۔

اچانک اس سڑک پر اسے ایک ایجنٹ نظر آیا جو اس کو ہنستا مسکراتا دیکھتا اس کی طرف آرہا تھا۔ الماس کو کچھ دیر کے لیے تسکین حاصل ہوئی۔

ایجنٹ نے اس کے پاس پہنچ کر اس سے ہاتھ ملایا اور کہا، "صرف تم بچے ہو۔"

☆☆.....☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

بارہویں منفرد کہانی

پہنچی وہیں پہ خاک

نسیم سحر

کچھ راستے ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی سمت کا سفر طے کراتے ہیں، اک نوجوان کی عبرت سامانی

میں بھول چکا تھا یا شاید بھول جانا چاہتا تھا کہ میری بنیاد کیا تھی۔ میرا ضمیر کہاں کہاں سے اٹھا تھا۔ میں نے ایک غریب گھر میں آنکھ کھولی تھی۔ جہاں روٹی کی تعداد بچوں کی تعداد سے کم ہی رہی تھی۔ میں یاد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میں آج کیا ہوں۔ شہر کا معروف بزنس مین، کئی شوگر ملز، کئی سیمنٹ فیکٹریاں کون سا ایسا بزنس تھا جس میں میرے شیئرز نہ ہوں۔ میرے گھر اور دفتر میں ملازموں کی فوج تھی۔ میں کیوں پیچھے مڑ کر دیکھوں کہ میرے گھر میں صبح اٹھتے ہی روٹی کا سوال اور رات کو سوتے وقت بھی روٹی کی طلب ہی رہتی تھی۔ میرا غریب مگر شریف

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

باپ اپنی بساط بھر کوشش تو کرتا تھا کہ سب بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلائے مگر ہزار کوشش کے باوجود نا کام ہی رہتا تھا حالانکہ وہ صبح سے رات تک کام کی تلاش میں رہتا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا نہ ہی کوئی ہنر جانتا تھا۔ ہنر میرے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔ ہنر تو میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا تو پھر میرے اور میرے باپ کے حالات میں زمین آسمان جیسا فرق کیوں؟

ہاں مجھے یاد آیا میں جو ہنر جانتا تھا وہ میرا باپ نہیں جانتا تھا۔ ''سر آج دو بجے آپ کی میٹنگ ہے؟'' سیکریٹری کی آواز مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔

''آں ہاں۔'' میں اٹھ گیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ملازم میرے پیچھے دوڑنے لگے۔ ''سر چار بجے قریشی صاحب کے ہاں جانا ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے بس اتنا ہی کہا۔

''اور سر رات کا ڈنر سرینا میں ہے۔''

میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرا تقریباً روز کا یہی معمول تھا۔ گھر میں بہن بھائی کے ساتھ لڑنے والا اجوآج سیٹھ اعزاز بیگ بن چکا تھا۔ مجھے یہاں تک پہنچنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔ صرف آٹھ سے دس سال میں، میں اپنی عمر سے دگنا جی گیا تھا۔ میں ایک ہوشیار لڑکا تھا۔ مجھے آٹھویں جماعت میں ہی وہ نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا جس نے میری زندگی بدل ڈالی۔ آٹھ کلاسیں پھلانگ میں اس لیے پڑھ گیا تھا کہ مجھ سے بڑے دونوں بھائیوں نے ابا کی مدد کے لیے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور مزدوری شروع کر دی تھی۔ وہ مجھے آگے پڑھانا چاہتے تھے مگر مجھے تو بہت جلدی امیر بننا تھا۔ پڑھائی میں کیا رکھا تھا۔ بہت سے پڑھے لکھے نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ جب مجھے دو جمع پانچ کرنے والا تیر بہ ہدف نسخہ ملا تو پھر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میرے لائے ہوئے پیسوں سے جب گھر میں خوش حالی آنے لگی سارے بہن بھائی پیٹ بھر کے کھانا کھانے لگے تو میں بہت خوش ہوتا تھا مگر ابا کو پتا نہیں کیا مسئلہ تھا وہ خوش ہونے کے بجائے فکرمند ہو گیا۔ حالانکہ اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ میں اس کی ذمہ داری اٹھانے لگا ہوں۔ ابا نے کئی بار مجھ سے سوال کیے میں بھی ایک نمبر کا ہوشیار تھا۔

''ابا اسکول میں میرا ایک دوست ہے اس کے ابا کی شہر میں بہت بڑی دکان ہے، وہیں کام کرنے لگا ہوں۔''

میں نے ابا کو مطمئن کیا مگر وہ مطمئن نہ ہوا۔ میرا بے وقوف ابا نہ جانے کس دنیا کا باسی تھا۔ اسے گھر میں خوش حالی آتی اچھی نہ لگی اور اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

میں بھی اپنی دنیا میں ایسا مگن ہوا کہ پلٹنا بھول گیا۔ ویسے بھی ہمارے دھندے میں صرف آنے کا رستہ ہوتا ہے جانے کا نہیں۔

☆.....☆

بچپن کہیں کھو گیا جوانی بھی گزر گئی۔ میں اب ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ میری شادی ہو چکی تھی۔ بچے تھے اور دولت میرے گھر کی باندی مگر کیا چیز تھی جو مجھے اندر سے بے چین رکھتی تھی۔ میں سب کچھ حاصل کر کے ہنسنا بھول گیا۔ میری لمبی سی ڈائننگ ٹیبل پر میں اکیلا بیٹھا ہوتا تھا۔ میری بیوی محفلوں کی دلدادہ تھی۔ وہ رات گئے پارٹیوں میں مصروف رہتی اسے میرے آنے جانے سے کوئی سروکار نہ تھا اور بچوں کی اپنی دنیا تھی۔ میں نے جس محرومی میں اپنا بچپن گزارا تھا اس سے دور رکھنے کی خاطر ہی تو یہ سب کیا تھا۔ بچوں کو ہر آسائش فراہم کی تھی مگر شاید اپنا ساتھ نہ دے پایا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ رات کو جب تک ابا گھر نہیں آجاتا تھا اماں کھانا نہیں کھاتی تھی اور اماں کو بھوکا دیکھ کر ہم بھی نہیں کھاتے تھے اور جیسے ہی ابا گھر میں داخل ہوتا ہم اس سے لڑنے لگ جاتے۔

''ابا تو جلدی گھر آجایا کر۔''

''ارے بھلیے تو کے کیوں بھوکا مارتی ہے بچوں کو دے دیا کر کھانا۔'' ابا ہمارے بجائے ماں کو کہتا۔

''میں تو کہتی ہوں پر یہ مرن جوگے میرے بغیر کھاتے نہیں۔'' ماں لاڈ بھرے غصے سے ہمیں دیکھتی۔

''اور تو.....؟'' ابا کا سوال ہوتا جس کے جواب میں ماں کا سر جھکانا اور شرمیلی مسکان یہی سب تو ہمارا سرمایہ تھا پھر میرے ذہن میں یہ خرافات کیوں سمائی میرے باقی بہن بھائی بھی تو وہی زندگی گزار رہے تھے اور مطمئن تھے۔ میں نے ان کی مدد کی بھی کوشش کی مگر وہ راضی نہ ہوئے وہ ساری زندگی ابا کے ساتھ رہے اور میں..... جو ابا کا لاڈلا تھا وہی ابا کو چھوڑ گیا۔

''صاب گاڑی صاف کردوں؟'' میری گاڑی کے دوازے سے یہ کسی نے ناک کیا۔ میں چونک کے ہوش میں آیا نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتا تھا۔ ہر دم بے چینی، گھبراہٹ اور بے کلی سی رہتی۔ کسی کام میں دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں لگتا۔ اکثر گاڑی لے کے نکل جاتا اور گھنٹوں اِدھر اُدھر گھومتا رہتا جہاں بھی تھوڑی دیر رکتا ہوتا میں ماضی میں گم ہو جاتا۔ اب بھی سگنل بند تھا اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کہیں کھو گیا تھا۔ اس بچے کی آواز مجھے حال میں لے آئی میں نے دیکھا وہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا جو ہاتھ میں اسپنج اور اسپرے بوتل لیے کھڑا تھا۔ یہ بچہ اکثر مجھے اس سگنل پر ملتا تھا۔ ڈرائیور تو اس کو بھگا دیتا تھا لیکن آج میں خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''ایک کام کرو گے؟'' میں نے بچے سے پوچھا۔

''جی۔'' اس نے نا سمجھ آنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''کل مجھے اسی جگہ ملنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆.....☆

دوسرے دن جب میں وہاں پہنچا تو وہ لڑکا موجود تھا۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ بھاگا چلا آیا۔

''جی صاحب۔''

''سنو یہ پیکٹ ہے میں ایک پتا بتاؤں گا وہاں دے آنا میں تمہیں بہت سارے پیسے دوں گا۔'' میں نے بچے کے ہاتھ پر ہزار کا نوٹ رکھا۔

''باقی کل دوں گا۔'' مجھے یقین تھا کہ وہ لڑکا فوراً پیسے رکھے گا اور کام کرنے کی ہامی بھر لے گا۔ وہ ایک غریب لڑکا تھا۔ یہ رقم اس کے لیے بہت زیادہ تھی مگر اس کا جواب میری توقع کے خلاف تھا۔

''نہیں صاحب یہ رکھو۔ ہم کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔'' اس نے ہزار کا نوٹ مجھے واپس کیا۔

''کیا.....؟'' میں حیران ہوا۔

''غلط کام؟ بیٹا یہ غلط کام نہیں ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''اگر یہ غلط کام نہیں ہے تو پھر تم ہم کو اتنے پیسے کیوں دے رہا ہے۔'' لڑکے نے مجھے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ میں بچے کی ذہانت سے متاثر ہوا۔

''نہیں یہ کام کا معاوضہ نہیں ہے میں تو تم کو ویسے ہی دے رہا ہوں۔ تم غریب لگتے ہو۔''

''صاحب ام غریب ضرور ہے مگر بھکاری نہیں۔ ہم صرف اپنی محنت کا کھاتے ہیں۔''

یہ لڑکا تو کافی مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

''اچھا تم یہ پیکٹ تو پہنچا دو گے نا؟'' میں نے ٹھہر کے پوچھا۔ مجھے یہ پیکٹ ہر صورت پہنچانا تھا۔ میرے آدمی نظر میں آ چکے تھے اور مجھے کسی نئے چہرے کی تلاش تھی مگر یہ لڑکا میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

''ابا کہتا ہے محنت سے جو ملے اسے ہی اپنا نصیب سمجھ لو اللہ سے شکوہ مت کرو کیونکہ اللہ جانتا ہے بندے کو کب اور کتنا دینا ہے اگر وہ اپنے کسی بندے کو بھوکا رکھتا ہے تو یہ اس کی مصلحت ہوتی ہے لیکن اگر پیٹ بھرے بندے کی بھوک نہ مٹے تو پھر بہت نقصان ہوتا ہے۔''

اس لڑکے نے مجھے حیران اور شرمندہ کر دیا تھا میں اس کی عمر میں اس سے زیادہ پڑھا ہوا تھا اور شاید حالات بھی بہتر رکھتا تھا پھر میرے اندر قناعت کیوں نہ تھی میرے اندر ہوس کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کی باتوں پر دھیان کیوں نہ دیا وہ لڑکا نوٹ میری گود میں ڈال کر جا چکا تھا مگر مجھے جگا گیا تھا۔

☆.....☆

میرے ذہن کے پردے سرک گئے تھے مجھے اپنی بے چینی کا حل مل گیا تھا مجھے اپنوں میں واپس جانا تھا وہ میری واپسی کے منتظر تھے۔

''تم یہ اچھا نہیں کر رہے تم جانتے ہو ہمارے دھندے میں صرف آنے کا راستہ ہوتا ہے جانے کا نہیں۔'' میرے پارٹنر نے مجھے یاد دلایا۔

''ہاں میں جانتا ہوں مگر میں اب یہ نہیں کر سکتا یہ سب تمہارے حوالے کرنے آیا ہوں۔'' میں نے واپسی کی ٹھان لی تھی کیونکہ میرے اپنوں کی طرف جانے والا راستہ ان آلائشوں سے پاک تھا۔ میں نے جب ابا کو پیغام بھجوایا تھا تو انہوں نے یہ ہی شرط رکھی تھی وہ آج بھی ویسے تھے زمانے کے سرد گرم حالات کی سختیوں نے ان کے ایمان کو ذرا بھر ڈگمگایا نہیں تھا اور آج میں سمجھا تھا کہ وہ مطمئن کیوں ہیں اور میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اتنا بے چین کیوں رہتا ہوں۔ ابا اسپتال میں تھا۔ دو دن پہلے اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو اس کو سرکاری اسپتال لے گئے تھے اور اب میرا رخ اسپتال کی جانب تھا کہ نجانے کتنی دور سے پیچھا کرنے والے دو لڑکے جو بائیک پر تھے آناً فاناً دو گولیاں میرے سینے پر اتار کے غائب ہو گئے تھے۔ شاید قدرت کو میری واپسی پسند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

قوسِ قزح

راوی: چوہدری وسیم

تحریر: رانا حبیب الرحمٰن

جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے فیوڈل سسٹم کے شکار اُس نوجوان کی سرگزشت

جس کے سینے میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا

(آخری حصہ)

''حماد! مجھے معاف کر دو، میں دولت کے لالچ میں اندھا ہو گیا تھا، صرف تمہاری وجہ سے دو ماہ ہوئے میری نوکری چلی گئی ہے۔ مختلف جگہ درخواستیں دے چکا ہوں لیکن ہر جگہ سے جواب نفی میں ہی ملا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا چوہدری کرم دین کی طاقت بھی کام نہیں کر رہی۔''

کہنے لگا۔ ''نہیں، اصل میں مجھے تمہاری وجہ سے ہی چوہدری نے نوکری سے نکلوا دیا تھا کہ تم نے تفتیش ہی غلط کی تھی اور ہادی پہلی پیشی پر ہی عدالت سے رہا ہوا تھا۔ اگر تم نے دل لگا کر تفتیش کی ہوتی تو وہ ابھی جیل میں ہی ہوتا۔ لہٰذا وہ کسی بھی طریقے سے نہیں مان رہا بلکہ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا ہے، اسی کو غنیمت سمجھو، لہٰذا میں دو ماہ سے کئی آفیسروں کے دفتروں کے دھکے کھا کر اب واپس لوٹ آیا ہوں۔ تم کوئی پہنچی ہوئی چیز ہو، تمہارا قتل اور اغوا کے کیس سے صرف پندرہ دن میں رہا ہو جانا کسی وجہ سے ہی ہے ورنہ آج کل تو مجرم منہ کر کے بھی پندرہ یا بیس سال سے پہلے جیل سے بڑی مشکل سے نکل پاتے ہیں۔ اس کے بعد تمہارے گم ہونے پر اتنا واویلا مچا ہوا ہے کہ میں خود حیران ہو گیا ہوں کہ عام آدمی کے لیے اتنی ہڑبونگ بھی نہیں مچتی دیکھی۔ تم عام آدمی بالکل نہیں ہو سکتے۔ یہ میرا پندرہ سالہ پولیس تجربہ کہتا ہے۔''

وہ واقعی اس بات پر سچا تھا کہ میں کوئی عام آدمی نہیں تھا بلکہ بہت زیادہ بھی نہیں تھا لیکن دیکھا جائے تو میں ایک مجاہد تھا اور بس اور تنہا لڑنے پر آ جاتا تو آٹھ یا دس آدمیوں پر بھی بھاری تھا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اکرم! تم گھبراؤ مت میں کچھ کرتا ہوں۔ ابھی تو میں خود سنبھل نہیں پایا۔''

میں اس سے عاتکہ اور چوہدری کی بیوی ثریا کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا لیکن کسی وجہ سے نہیں پوچھ سکا تھا لیکن کسی وجہ سے نہیں پوچھ سکا تھا۔ چند دن میں وہ میرا اچھا دوست بن چکا تھا۔ میں نے اس سے ایک درخواست لکھوائی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ مجھے نوکری دوبارہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ میرا زندگی کا سب سے بڑا مقصد اب صرف ایک ہی تھا کہ چوہدری کرم دین سے اپنے ماں باپ کا انتقام، اس کے علاوہ دوسرا آدمی میرا بڑا دشمن تھا آڑھتی جو دراصل چوہدری کا آدمی تھا۔ میں نے سب سے پہلے منڈی کے آڑھتی کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تکمیل دینا تھا۔ یہ راز تھا۔ اس راز کو میں کسی پر بھی عیاں نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا پی ایس ایس یعنی پاکستان سیکریٹ سروس کا کارڈ ہونا میرے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لیے ضروری ہے۔ دوسرے میں کرنل آفریدی اور چانڈیو صاحب سے ایک بار ضرور ملنا چاہیے۔ پھر یہ راز ہی رکھنا چاہیے کہ میری یادداشت ابھی واپس نہیں آئی۔

اسی ادھیڑ بن میں نے اکرم سے کہا۔ ''تم ایسا کرو اپنا موبائل مجھے دو۔'' اس نے نکال دیا میں نے سب سے پہلے عاتکہ کا نمبر ملایا کہ شاید اس کا موبائل کسی دوسرے کے پاس ہو یا وہ کسی اور جگہ نکل گئی ہو۔ میری توقع کے عین مطابق نمبر بند تھا۔ میں نے دوبارہ سونیا کا نمبر ملایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی۔ دوسرے لمحے ہی اس پر سونیا کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔'' ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''السلام علیکم!'' وہ بولی ''جی، وعلیکم السلام، کون؟''

میں نے کہا۔ ''کیا چانڈیو صاحب گھر پر ہیں۔ ان سے بات ہو سکتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''جی! گھر پر ہی ہیں مگر آپ کون ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں حماد عرف ہادی۔''

اسی وقت اس کے ہاتھوں سے موبائل گرنے کی آواز آئی۔ میں ''ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا اس کے بعد شاید چانڈیو نزدیک ہی تھے۔ فوراً ہی موبائل پر آواز آئی۔ ''جی آپ کون ہیں اور مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''چانڈیو صاحب! میرے خیال میں اب تک یہی ہے کہ چوہدری کرم دین اور ثریا بیگم کے بعد اب آپ ہی ہیں یا آپ کی بیٹی جو مجھے پہچانے ورنہ اور تو کوئی میری نظر میں نہیں ہے۔''

وہ میری آواز پہچان چکے تھے۔ بولے۔ ''حماد بیٹا! کہاں ہو اور اب کیسے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''چانڈیو صاحب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

تو وہ بولے۔ ''بیٹا جلدی بتاؤ کہاں ہو، میں اور سونیا تمہیں لینے کے لیے آ رہے ہیں۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے اکرم کی رہائش کا پتا بتا دیا اور وہ اسی وقت نکلنے کو تیار ہو گئے۔ میں نے موبائل بند کر دیا تھا۔ میرے ایڈریس بتانے پر اکرم نے پوچھا۔ ''ہادی صاحب! آپ کو پتا ہونا چاہیے وہ میرے آفیسر ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے کہا۔ ''بالکل گھبراؤ مت، تم مہمانوں کی میزبانی کے لیے تیاری کرو۔''

اسی وقت انعم اور ہاجرہ بی بی بھی میرے پاس کھڑی ہوگئی تھیں۔ اکرم کہنے لگا۔ ''ایک اور بات تھی کہ تم یہاں طلحہ ہی رہتے تو اچھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اکرم صاحب میں تمہارے آنے سے پہلے ہی تمام گھر والوں کو بتا چکا ہوں کہ میں طلحہ نہیں ہوں۔''

حاجرہ اور اکرم باہر نکل گئے تھے اور انعم میرے قریب تھی، بولی۔ ''کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں کی تھی مگر میری آنکھوں سے اسی وقت آنسو بہنے لگے۔ وہ فوراً ہی تڑپ اٹھی، بولی۔ ''سوری، شاید میری بات نے تمہیں دکھ پہنچایا۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں کوئی بات نہیں۔''

وہ بولی۔ ''اب تم اسی کے پاس چلے جاؤ گے۔ خدا تمہیں سدا سلامت رکھے۔''

میں نے کہا۔ ''انعم! میری محبت میری زندگی مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔''

وہ بولی۔ ''کیسے؟''

میں نے مکان کے جلنے والا واقعہ بتا دیا کہ وہ مکان میں جل گئی تھی۔

انعم کہنے لگی۔ ''مکان جلا کیسے، اس میں کیسے آگ لگی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمام باتیں جاننے سے پہلے ہی میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ پھر میری یادداشت چلی گئی تھی۔''

وہ میری باتیں سن کر بہت افسوس کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ ''تم بھی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ کیونکہ مہمان آنے والے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''لیکن وہ کون لوگ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک آدمی ہوگا جو تمہارے والد کا آفیسر ہے اور دوسری اس کی بیٹی ہوگی بالکل تمہاری عمر کی۔''

وہ باہر چلی گئی۔ تقریباً تین گھنٹے بعد باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اس گاڑی کے بعد اسی وقت ایک اور گاڑی بھی ساتھ آ کر رک گئی۔ اس میں چانڈیو صاحب کے چار گن مین تھے۔ سیکورٹی گارڈ کافی چوکنے نظر آتے تھے۔ سب کو بیٹھک میں بٹھایا پھر دوپہر کا کھانا کھلایا گیا۔ مجھ سے مل کر چانڈیو صاحب بہت خوش تھے۔ اکرم نے ان کے گاڑی سے اترتے ہی ان کو سیلوٹ مارا تھا جس پر وہ کچھ حیران بھی ہوئے تھے۔

سونیا انعم کے ساتھ اندر چلی گئی تھی اور میں وہیں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔ چانڈیو صاحب بالکل علیحدہ طرز کے آدمی تھے، سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتے تھے۔ اب بھی وہ اپنے سیکورٹی گارڈز کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں جانتا تھا باقی میرے لیے نئے تھے۔ میرے خیال میں باقی بھی آرمی کے کمانڈوز تھے۔ میں نے چیک کرنے کے لیے صرف ایک لفظ کہا شروش، اسی وقت دونوں آدمیوں کے منہ سے شروش کا لفظ نکلا تھا۔ یہ ایک طرح سے پی ایس ایس کا خفیہ کوڈ تھا۔ اسی وقت چانڈیو صاحب بولے، وہ ہمارے ساتھ نہیں آئے، ہم سمجھ گئے تھے کہ باقی دوسری یونٹ کے آدمی ہیں۔ چند منٹ بعد میں نے کہا کہ یہ اکرم صاحب ہیں، اپنے پولیس ڈپارٹمنٹ کے ایک سپاہی لیکن چوہدری کرم دین کی وجہ سے آج کل نوکری سے فارغ ہیں۔ چوہدری کے ہاتھ ابھی بھی بہت لمبے ہیں، اوپر کے عہدے داروں سے تعلق بہت زیادہ ہے اسی وجہ سے بے چارے کی نوکری دوبارہ نہیں لگی، انہی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ یہ تھانہ نور پور ملتان میں ہی تھے اور اب دو ماہ سے فارغ تھے۔ کل ہی یہ آئے ہیں۔

چانڈیو صاحب بولے۔ ''ٹھیک ہے اپنی اپیلی کیشن جمع کروا دیں، میں دیکھ لوں گا۔''

اتنی دیر میں دروازے سے چھوٹے عثمان نے جھانکا اور مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ ہی گھر کے اندر آیا تو سونیا اور انعم حاجرہ بی بی کے پاس بیٹھی تھیں۔ سونیا نے اپنے پرس سے میرا موبائل نکال کر دیا جس پر کرنل آفریدی کی کال آ رہی تھی۔ میں نے موبائل کا او کے کا بٹن دبا کر کان سے لگایا اور بولا۔ ''سر! السلام علیکم، آپ کیسے ہیں؟''

کرنل آفریدی زندہ دل انسان تھے۔ بولے۔ ''ہمارا شیر ٹھیک ہو گیا سمجھو ہم بھی اب ٹھیک ہو گئے۔''

کرنل صاحب بہت سی باتیں پوچھنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا۔ ''سر ملنے پر بتاؤں گا۔''

پھر وہ بولے۔ ''ٹھیک ہے۔ ہادی بیٹے! کیا چانڈیو صاحب آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں سر!''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ بولے۔ ''بات کراؤ۔''

میں نے موبائل بیٹھک میں لے جا کر چانڈیو صاحب کو پکڑا دیا اور بولا کرنل صاحب ہیں۔ تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد بولے۔ ''اب ہمیں نکلنا ہوگا کیونکہ رات ہوجائے گی۔ ایک دو ضروری کام کرنا ہیں اور وہ رات کے اندھیرے میں نہیں ہوسکتے۔''

تھوڑی دیر میں میں ان کے ساتھ جا رہا تھا، اکرم کے گھر سے نکلتے ہوئے اکرم کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے اور باقی سب رو رہے تھے اور میں دوبارہ ان سے ملنے کا وعدہ کر کے آ گیا تھا۔ راستے میں سونیا اور چانڈیو صاحب مجھے چچا حشمت اور عظمت اور عاتکہ کے بارے میں حوصلہ دیتے آئے تھے لیکن میری زندگی وہ زندگی نہیں رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ میرے دل میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی۔ آگ لگنے کی وجہ بظاہر شارٹ سرکٹ تھا لیکن مجھے یہ سب جان بوجھ کر کام ہوا لگتا تھا جیسے میرے کسی دشمن نے یہ کام کروایا ہو۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چانڈیو صاحب کی کوٹھی پر جا کر رک گئی تھیں۔ مجھے رہنے کے لیے چانڈیو صاحب نے اپنی ہی کوٹھی کا ایک حصہ دے دیا تھا جو دوسری منزل پر بنا ہوا تھا۔ سونیا کے نزدیک رہنے سے سونیا کی جھجک اب کافی ختم ہوگئی تھی اب وہ مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی اور میرا دل بھی بہلانے پر آمادہ ہوتی لیکن میں اب صرف اور صرف سوچوں میں ہی ہوتا تھا۔ کوئی کام وغیرہ تھا نہیں میرے پاس اس لئے فارغ اوقات میں صرف ورزش ہی کرتا یا پھر ٹیلی ویژن پر لگے ہوئے پروگرام دیکھا کرتا۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا، ایک ماہ بعد دوبارہ مجھے کرنل آفریدی نے بلوایا تھا۔ میں جب خفیہ کیمپ پہنچا تو انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور ایک آرمی کے ڈاکٹر ریاض کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر ریاض صاحب پچھلے بیس سال سے ملک و قوم کی خدمت کر رہے تھے۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھے لہٰذا انہوں نے میرے مختلف ایکسرے اور ٹیسٹ کیے۔ دو دن بعد کرنل صاحب نے میرے پاس آ کر کہا۔

''ہادی! یہ رہا تمہارا کارڈ جو کہ چانڈیو صاحب نے تمہارے اسپتال میں داخلے کے بعد اپنے قبضے میں کر کے مجھے بھیج دیا تھا کہ یہ کسی دوسرے کے ہاتھ نہ لگے۔''

میں نے اپنا کارڈ پکڑ لیا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا تو کرنل صاحب دوبارہ گویا ہوئے۔

''بیٹا ہادی! یہ فائل ڈاکٹر ریاض نے دی ہے، مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہارا ذہن ابھی تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوا۔ صدمے کی وجہ سے ایسی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے کہ ہم دوبارہ تم سے کوئی کام نہیں لے سکتے۔ لہٰذا تمہیں کچھ مراعات کے ساتھ تمہیں باقاعدہ وظیفہ ضرور ملتا رہے گا اور تم سے ضرورت کے تحت ہی کوئی کام لیا جائے گا اس لیے تم میرے پابند نہیں رہے۔ ویسے بھی تم نے ایسے کئی کارنامے بطور رضا کار انجام دیئے ہیں اس لئے آئندہ بھی تمہاری خدمات کو سراہا جائے گا۔ اور یہ گرین کارڈ تمہیں بہت جگہ کام دے گا اور یہ تمہیں ظاہر کرے گا کہ تم آن ڈیوٹی ہو۔''

اس وقت مجھے بے حد افسوس ہوا تھا کہ میں عملی طور پر کچھ نہ کر سکوں گا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ کرنے کی صلاحیت میرے پاس موجود تھی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا تھا۔ چانڈیو صاحب نے جب یہ بات سنی تو کہنے لگے۔

''بیٹا معذوری کو کبھی ذہن پر سوار نہیں ہونا چاہیے۔ تب بھی انسان ایسے کارنامے انجام دے دیتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔''

باتوں باتوں میں میں نے اکرم کانسٹیبل کا پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ''آنے والے ماہ میں یکم تاریخ کو وہ دوبارہ چارج سنبھال لے گا۔ اسے نوٹس بھیج دیا گیا ہے۔'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

سونیا مجھ میں بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع ہوگئی تھی۔ شاید اس دلچسپی کے پیچھے سونیا کے ماں یا باپ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ دولت کے لحاظ سے بھی میرے پاس کمی نہیں تھی۔ ایک دن میں نے سوچا کیوں نہ اپنے دشمنوں کا خاتمہ شروع کردوں۔ یہ سوچ کر میں نے سونیا کی گاڑی نکالی جو زیادہ تر میرے استعمال میں ہی ہوتی تھی۔ یہ گاڑی بغیر آواز کے اچھی کنڈیشن میں تھی۔ میرے لئے اسلحے کی بھی کمی نہیں تھی۔ ایک کال پر اسلحہ کا ٹرک آ سکتا تھا اور دوسری کال پر آرمی سمیت خفیہ آرمی بھی میری مدد کو حاضر ہو جاتی لیکن یہ میرا ذاتی کام تھا لہٰذا اس میں کسی کو بھی شریک نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرسکتا تھا۔ چانڈیو صاحب کے گھر میں بھی ایک جدید ساخت کا ہنگری کا بنا ہوا پستول لیا اور دوسرا میرے پاس ذاتی تھا جو کرنل آفریدی کی جانب سے ملا ہوا تھا۔ بہت سے راؤنڈز بھی لے لیے تھے اور سیدھا اپنے آبائی گاؤں چاند پور جا پہنچا اور پھر گاڑی ایک جگہ پارک کر کے چوہدری کرم دین کی حویلی کی جانب بڑھنے لگا اور حویلی کے چاروں طرف گھوم پھر کر اندازہ لگایا کہ کہاں سے آسانی ہوگی۔ میرا شکار تو آج چوہدری کرم دین خود تھا۔ اس کے بعد دوسرا شکار منڈی کا آڑھتی ہوتا۔ ایک جگہ میرے سامنے آ ہی گئی۔ اندر سے تو بچپن سے ہی ہر کمرے کا پتا تھا لیکن باہر چار دیواری کی لوکیشن نہ معلوم تھی۔ اب مجھے رات ہونے کا انتظار تھا لہٰذا رات کا اندھیرا بڑھنے میں کچھ ہی دیر تھی اس لئے میں اپنے آبائی گھر آ گیا۔ اس طرف آتے ہوئے بھی میں نے دیوار ہی پھاندی تھی کیونکہ دروازہ کھولتے ہوئے کوئی بھی مجھے پہچان سکتا تھا۔ یہاں میرے والدین کی یادیں اور میرے بچپن کی یادیں تھیں۔ انہی یادوں میں رات ہوگئی تھی۔

میں نے فوراً ہی باہر کا قصد کیا اور تھوڑی دیر بعد حویلی کے اس رخ پر جا پہنچا جہاں سے میں نے اسے پار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے میں نے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگادی۔ پھر کچھ دیر رک کر حالات کا جائزہ لیا۔ ظاہر ہے اس وقت کوئی مجھے دیکھ لیتا تو وہ کچھ پوچھنے سے پہلے ہی گولی مار دیتا۔ میں چوکنا انداز میں آگے بڑھنا شروع کیا ابھی میں ثریا بیگم کے کمرے میں دروازے پر تھا کہ مجھے ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا میں فوراً ہی ثریا بیگم کے کمرے میں جا گھسا ثریا بیگم اس وقت سوئی ہوئی تھی میرے اندر جانے پر فوراً ہی بدک کر اٹھ کھڑی ہوئی، لائٹ جل رہی تھی دوسرے لمحے ہی مجھے پہچان کر سنبھل گئی اور آگے بڑھ کر مجھے پیار دیا اور کتنی دیر تک روتی رہی، ثریا سے ہی مجھے پتا چلا تھا کہ عاتکہ کی لاش نہیں ملی۔ ثریا بیگم کہہ رہی تھیں۔

''بیٹا! عاتکہ زندہ ہے، اسے کہیں سے بھی تلاش کرو لیکن ضرر نہ کرو۔''

میں جانتا تھا کہ ثریا بیگم جذبات میں بہک رہی ہیں اور اپنے آپ کو حوصلہ دے رہی ہیں۔ اسی وقت باہر ایسا لگا جیسے کسی نے کوئی چیز صحن میں پھینکی ہے۔ میں چوکنا تھا اور ثریا کے کمرے سے باہر نکل آیا اور چھپ کر چوہدری کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ثریا بیگم نے بھی سوچا تھا کہ میں باہر چلا گیا ہوں اور پھر کبھی ملنے آؤں گا۔ چند لمحوں بعد میں چوہدری کرم دین کی حویلی میں اس کے کمرے میں تھا، ثریا بیگم اور چوہدری کافی عرصے سے الگ الگ سوتے تھے اس لئے مجھے آسانی ہوئی تھی لیکن جب کمرے میں داخل ہوا تھا تو اسی وقت مجھ پر چیتے کی پھرتی سے کسی نے حملہ کر دیا تھا۔ میرے پاس دونوں ریوالوروں پر سائلنسر لگے ہوئے تھے اور اسی وقت میرے ہاتھ سے پستول گر گیا جو کہ دروازے کے پاس ہی گرا تھا۔ وہ اجنبی بہت پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ میں جب تک سنبھلتا وہ مجھے زیر کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ آپ یقین کریں آدھے گھنٹے میں میں اس کے مقابل رہا تھا۔ میں نے ہر وار سوچ سمجھ کر کیا تھا کہ اسے زندہ قابو کروں، دوسری طرف چوہدری سہما ہوا تھا۔ اس کی آواز بھی نہیں نکلی تھی۔ اچانک میں نے ایک ایسا داؤ کھیلا کہ وہ دونوں شانے چت ہوگیا۔ میں نے مکمل تربیت حاصل کی تھی لیکن مدمقابل بھی کسی طور کم نہ تھا۔ میں نے اس کے گرتے ہی اس کے سینے پر پاؤں رکھ دیا اور دباتے ہوئے بولا۔

''بولو! کون ہو تم اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' وہ اب تک خاموش تھا۔ اچانک میں نے اس کے منہ سے نقاب اتار دیا اور اسی وقت مجھے حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ ایک خوبصورت آنکھوں اور چہرے والی لڑکی تھی جس کے نقاب اترتے ہی بال کھل گئے تھے اور چہرے پر پریشانی اور خوف کی ملی جلی کیفیت نے لے لی تھی۔ چوہدری اپنی جگہ پر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن لڑکی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں نہیں آیا تھا۔ پستول دوسرا بھی میرے پاس تھا۔ میں نے اسے نکال کر چوہدری کا نشانہ لیا اور گولی داغ دی۔ پھر ایک اور گولی، انتقام کا جذبہ اتنا گہرا تھا کہ میں نے پورا میگزین اس پر خالی کر دیا تھا۔ باقی معلومات لینے کا وقت ہی نہیں تھا لہٰذا دوسرا پستول بھی قابو کیا اور لڑکی کے سر کا نشانہ لے کر باہر کی طرف بڑھا۔ تمام حویلی خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھا اور چھوٹا گیٹ کھول کر باہر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آ گیا۔ چوکیدار بھی سویا ہوا تھا۔ چلتے چلتے اسے میں اپنے آبائی گھر لے آیا۔ ابھی اندر کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس نے دوبارہ ایک حرکت ایسی کی کہ پستول میرے ہاتھوں سے دور جا چکا تھا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اس لڑکی سے زیادہ کشتی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فوراً ہی ایک بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف کر دیا۔ ایسا کرنے پر اس کے چہرے پر درد کے آثار نمودار ہو چکے تھے جسے وہ بہت زیادہ حوصلے سے برداشت کر رہی تھی۔ میں نے کہا اگر تم ایسی حرکتیں کرو گی تو میں دوستی کے بجائے دشمنی پر اتر آؤں گا اور تم میری دشمنی کی سفاکی اپنی آنکھوں سے قتل کی صورت میں دیکھ چکی ہو۔ آخر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''اب بتاؤ تم کون ہو اور چوہدری کرم دین کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں۔''

وہ بولی۔ ''میں بھی اسے قتل کرنے آئی تھی، اپنا انتقام لینے لیکن تم نے سارا مزا کرکرا کر دیا لیکن تم نے اسے کیوں قتل کر دیا۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو اصل میں تمہیں نقاب میں دیکھ کر نہیں پہچان سکا تھا کہ تم لڑکی ہو۔ جس طرح تم نے فائٹنگ میرے ساتھ کی اور اچانک تمہارا نقاب اترا تو چوہدری اس وقت نیند سے بیدار ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی، پریشانی اور خوف بیک وقت در آیا تھا۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم اسے قتل کرنے کی صورت میں ہی آئی ہو گی۔ لیکن وہ میرا بھی دشمن تھا لہٰذا میں نے تمہارا کام بگاڑنے کے بجائے آسان کر دیا اور تمہیں لے کر یہاں آ گیا ہوں۔ اب بتاؤ کون ہو اور اسے قتل کر کے کون سا انتقام لینا چاہتی تھیں۔''

اس نے کہا۔ ''میرا نام سمیرا حسن ہے اور میں اسی گاؤں کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری عمر اس وقت 17 برس ہو گی۔ میں بہت چھوٹی تھی کہ ایک دن میری والدہ جوان دنوں جوان اور خوبصورت ہوا کرتی تھی، میرا والد بھی اور والدہ بھی چوہدری کی زمینوں پر کام کرتے تھے، لہٰذا ایک دن چوہدری کرم دین زمینوں پر آیا، وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ میری عمر 6 برس تھی۔ میرا والد چوہدری کے ایک کام سے شہر گیا ہوا تھا لہٰذا چوہدری نے میری والدہ کو تنہا دیکھا اور اس کے قریب آ گیا اور بولا بلقیس میری بات مان لو، بہت زیادہ خوش رکھوں گا۔ میری والدہ نے اسی وقت اس کے منہ پر تھوک دیا جس پر چوہدری سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے میری والدہ کو قابو کر لیا اور اس کی عزت تار تار کر دی۔ میں اپنی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ فوراً دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ کر ایک جگہ چھپ گئی۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ جہاں چوہدری کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی لہٰذا چوہدری نے بعد میں میری والدہ بلقیس کا گلا دبا کر مار دیا اور فوراً مجھ پر توجہ دیئے بغیر گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ جب میرا باپ آیا تو میں نے اسے بتا دیا۔ والد نے چپ کر کے خاموشی سے میری والدہ کو دفن کروایا اور پھر ایک رات وہ مجھے لے کر خاموشی سے لاہور میری خالہ کے پاس لے گیا۔ کچھ ماہ بعد والد والدہ کا غم برداشت نہ کر سکے اور ایک رات وہ خدا کے پاس چلے گئے۔ میری خالہ نے ہی مجھے اسکول پڑھایا اور اب تک وہاں اپنی خالہ کے ہمراہ ہی رہتی ہوں لیکن کچھ دنوں سے والد اور والدہ میرے خوابوں میں آ کر رو رہے ہوتے ہیں اور کبھی والدہ اسی طرح چوہدری کے رحم و کرم پر دکھائی دیتی ہے جو آج سے دس سال پہلے رہی تھی۔ اس لئے میں نے انتقام لینے کا سوچا اور اپنے کالج سے ہی مارشل آرٹ کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگی۔ اب تک میں مارشل آرٹ کے کئے مقابلے جیت چکی ہوں لہٰذا جس کام کے لئے میں نے یہ سب کیا وہ صرف اسی لئے تھا کہ چوہدری کو تڑپا تڑپا کر ختم کروں لیکن تم نے ایک ہی وار میں اسے ختم کر دیا۔''

میں اس کی بات سن کر اپنے کئے پر بالکل پچھتاوا نہیں تھا لہٰذا ابھی رات باقی تھی۔ میں سمیرا کے پاس بیٹھا ہی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر صبح ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لہٰذا میں نے سمیرا کو ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ جب اپنی گاڑی کے قریب آیا تو میری چھٹی حس نے مسلسل خطرے کا الارم بجایا۔ میں چوکنا انداز میں آگے بڑھا، پستول میں نے نکال لیا تھا، سمیرا بھی خطرہ محسوس کر چکی تھی۔ اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کسی نے بہت زور سے میرے سر پر کوئی چیز ماری تھی۔ میں اس چوٹ کو برداشت کر گیا تھا لیکن فوراً ہی کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سوچ کر میں گر پڑا تا کہ مارنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو اور مجھے موقع مل جائے۔ انہوں نے فوراً ہی سمیرا کو دبوچا اور ایک گلی کی طرف مڑنے لگے۔ میں نے فوراً ہی اٹھ کر ان کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے میرے جیسا انسان چھوٹی مچھلیوں کی بجائے مگر مچھ کی تلاش میں رہتا تھا۔ میں ان کے انداز سے جان چکا تھا کہ یہ چھوٹی مچھلیاں ہیں، وہ تعداد میں تین تھے لہٰذا میرے نشانے پر تھے۔ میں جب بھی چاہتا ان کو بھون کر رکھ دیتا لیکن میں ان کے بڑے کو پکڑنا چاہتا تھا۔ سمیرا مسلسل ان سے اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی لیکن میں حیران اس لئے تھا کہ سمیرا ایک مارشل آرٹ کی چیمپئن ہونے پر ان لوگوں کے قابو میں اتنی آسانی سے کیسے آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی سمیرا کا جسم جھول گیا تھا جس سے محسوس ہوا کہ وہ اب بے ہوش بھی ہو چکی ہے۔ میں ان کے پیچھے تھا لہٰذا وہ ایک مکان پر رکے۔ گاؤں اب پہلے سے کافی حد تک ترقی کر گیا تھا لہٰذا وہ جس گھر کے سامنے رکے تھے یہ بھی نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ مجھے کسی چکر کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے لہٰذا میں ایک جگہ چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اندر چلے گئے۔ میں اس جگہ سے نکلا اور مکان کے اردگرد منڈلانے لگا۔ جلد ہی مجھے مکان کے اندر جانے کے لئے مکان کی پچھلی جانب ایک کمرے کے پچھلے حصے پر ایک پائپ چڑھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے پائپ کو چیک کیا۔ اس کے کلپ بھی مضبوط تھے۔ یہ کم از کم 6 انچ موٹا پائپ تھا جو چھت تک جا رہا تھا۔ اس کے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ سیکرٹ سروس کی ٹریننگ کام آ رہی تھی۔

پائپ کے ساتھ ساتھ جب میں چھت پر پہنچا اور دوسرے کمرے کے اندر جھانکا، اندر اب پانچ آدمی تھے لیکن دو آدمیوں کو میں نے پہچان لیا تھا، وہ چوہدری کے گرگے تھے، باقی تینوں میرے لئے اجنبی تھے۔ شکل سے وہ مجھے غیر ملکی لگ رہے تھے۔ میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ یہ تمام آدمی یہاں ایک لیبارٹری میں کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر ہیں لیکن یہ گردے، دل، آنکھیں سپلائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اب مجھے سمیرا کو بچانا تھا، ان لوگوں کو چوہدری کے قتل کی خبر ابھی نہیں پہنچی تھی لیکن ہم اس غیر آباد مکان سے نکلے ہوئے ان کی نظروں میں آ گئے تھے لہٰذا وہ مجھے چھوڑ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ میں نے فوراً ہی دوسرے کمرے روشن دانوں کے ذریعے دیکھنے شروع کر دیئے اور مجھ پر حیرت انگیز انکشاف ہوتے گئے۔ وہاں باقاعدہ ایک قسم کا اسپتال بنا ہوا تھا۔ جدید قسم کی مشینیں لگی ہوئی تھیں لیکن گاؤں والے اس سے بے خبر تھے۔ ایک کمرے میں مجھے ایک بیڈ پر سمیرا لیٹی ہوئی نظر آ گئی۔ وہ ہوش میں تھی۔ میں نے روشن دان سے ایک ہلکی سی سسکاری ماری تو وہ فوراً ہی چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے دوبارہ سے سسکاری ماری تو اس کی نظر روشن دان میں میری طرف پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک آ گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا، بس خاموش رہو، میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔ یہاں میں کرنل صاحب کو بھی فون نہیں کرنا چاہتا تھا نہ ہی چانڈیو صاحب کو کیونکہ یہ لوگ چوکنا ہو جاتے اور فرار ہو جاتے۔ اس لئے میں چاہتا تھا کہ پہلے سمیرا کو نکالوں بعد میں کسی کو فون کروں گا۔ کرنل صاحب یا چانڈیو کو اطلاع دینا بھی ضروری تھا ورنہ چوہدری کے قتل کی اطلاع سن کر وہ لوگ چوکنا ہو سکتے تھے۔ اس لئے اب وقت بہت تھوڑا تھا، اسی محدود وقت میں کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اچانک میں نے روشن دان جو کہ سیمنٹ کا بنا ہوا تھا، آہستہ سے ٹھوکر ماری لیکن میرے ہاتھ میں درد ہوا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے مسلسل ہاتھ سے ٹھوکر لگانے سے وہ اکھڑ گیا۔ میرا ہاتھ اب زخمی بھی ہو چکا تھا۔ یہ ایک جذباتی کوشش تھی، مجھے معلوم تھا کہ تعمیراتی کمپنیاں یا راج گیراب اتنا پکا کام نہیں کرتے اور اگر یہ پکا کام کریں تو ہمارے ملک میں ہر چیز دو نمبر ہوتی ہے۔ یہاں بھی سیمنٹ بنانے والی فیکٹری اور روشن دان بنانے والے کاریگر کی دو نمبری میرے کام آ گئی تھی اور روشن دان سے اتنا راستہ ضرور تھا کہ ایک آدمی گزر سکے۔ سمیرا کا جسم ویسے بھی اسمارٹ تھا، اس لئے اسے گزرنے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ سمیرا جس کمرے میں جس بیڈ پر تھی اس کی چادر بہت مضبوط تھی لیکن وہ روشن دان تک نہیں پہنچ سکتی تھی لہٰذا سمیرا کو چادر کے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے گانٹھنے کو کہا تو وہ سمجھ چکی تھی۔ فوراً ہی اس نے چادر کے چار ٹکڑے کر دیئے اور آپس میں کس کر باندھ دیا۔ پھر میری طرف پھینکا، میں نے پکڑ کر اسے اوپر آنے کو کہا۔ وہ اس کی مدد سے آہستہ آہستہ اوپر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد روشن دان سے باہر تھی۔ ہم جلدی سے وہاں سے دوسری طرف آئے جہاں پائپ کے ذریعے سے نیچے اترے اور فوراً ہی گاڑی کی طرف بڑھے۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے وقت میں نے فون نکالا اور فوراً ہی ایک میسج لکھا جس پر صرف دو الفاظ لکھے، ایمرجنسی گاؤں چاند پور۔ نیچے لفظ حملہ لکھ دیا اور کرنل صاحب کے نمبر پر میسج کر دیا اور چانڈیو کا نمبر ملا کر کہا۔ ''سر! فوراً اپنی پولیس کو لے کر چاند پور پہنچیں۔'' چوہدری کرم دین کو کسی نے قتل کر دیا ہے، سمیرا صرف یہ ہی جان سکتی تھی کہ میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے لیکن میں دوسرے گروہ فروشوں کو بھی نہیں بھولا تھا، ساتھ ہی دوسرا میسج میں نے فون کے ساتھ ہی چانڈیو کو کر دیا تھا۔ اب ایک ساتھ دونوں فورسیں برسرِ پیکار تھیں۔ مجھے امید تھی میرا مختصر میسج اپنا کام ضرور دکھائے گا۔ چند منٹ بعد میں چانڈیو صاحب کی کوٹھی میں تھا، سمیرا کو سونیا کے حوالے کیا اور چانڈیو صاحب کے ساتھ چل پڑا، وہ بالکل تیار تھے۔ کرنل صاحب کی کال بھی آ چکی تھی، وہ چاند پور جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ چاند پور کے نزدیک ہم سب آپس میں مل گئے تھے۔ جلد ہی میری نشاندہی پر پوری عمارت گھیرے میں لے لی گئی، صبح کی اذانیں ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اپنی اپنی زمینوں پر جانے کے لئے تیار تھے۔ جب گاؤں کے ایک بازار سے سب نے فائرنگ کی آوازیں سنیں کیونکہ کسی وجہ سے وہ جان گئے تھے کہ عمارت گھیرے میں لے لی گئی ہے لہٰذا وہ مقابلے کے لئے نکل آئے تھے لیکن کتنی دیر تک مقابلہ چل سکتا تھا۔ کچھ کمانڈوز نے ان میں سے تین کو زندہ زخمی کر کے پکڑ لیا اور باقی چھ آدمی مارے گئے تھے۔ گاؤں والے سب اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو چکے تھے۔ تمام مشینیں ناکارہ کرنے کے بجائے ملتان کے ایک سرکاری اسپتال کو دے دی گئیں اور تینوں آدمیوں میں سے دو غیر ملکی تھے جو نام بدل کر یہاں رہ رہے تھے۔ وہ دونوں زہریلے کیپسول جو وہ منہ میں چھپا کر رکھتے تھے نگل لئے جس سے موت واقع ہو گئی تھی۔ اب صرف ایک آدمی زندہ بچا تھا لیکن یہ مقامی آدمی تھا جو چوہدری کی حویلی میں صرف چوہدری کے احکامات مانتا تھا۔ اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ گاؤں کے علاوہ کئی علاقوں سے دو گروہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ کئی جوانوں کو بھی اغوا کر کے ان کے گردے اور آنکھیں دل وغیرہ نکال کر کچھ آدمیوں کو دیتے تھے جو کہ ظاہر ہے باہر رہتے تھے، وہ لے جاتے تھے۔ جب تک گاؤں والوں کو پتا چلتا ہم سب وہاں سے نکل چکے تھے، صرف موقع پر چند سپاہی نزدیکی تھانے کے رہ گئے تھے۔ خفیہ ایجنسیاں بھی حرکت میں آ گئی تھیں لیکن یہ معلوم کرنے میں بالکل ناکام رہیں کہ اصل میں یہ سب کروانے والے کون ہیں؟ کیونکہ تمام کارروائی پولیس کی بتائی گئی تھی۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات میں بھی پولیس کی کارکردگی کو سراہا گیا تھا۔ ڈی پی او آفیسر ناظم علی چانڈیو صاحب نے بھی اپنے بیان میں یہی کہا تھا کہ پاکستان کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پولیس رشوت کھاتی ہے اور موقع پر پہنچنے میں ہمیشہ دیر کر دیتی ہے لہٰذا ہم ان میں سے یہ سب پولیس ڈیپارٹمنٹ کو کالی بھیڑوں نے پولیس کو بدنام کیا ہوا ہے۔ اس لئے لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میں نے آج تک رشوت نہیں لی اس لئے بہت سے لوگ بھی میرے دشمن ہیں لیکن یہ میرے ہی دشمن نہیں آپ کے بھی ہیں اور اس ملک کے بھی دشمن ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب ان ملک دشمن عناصر کی جڑیں کاٹتے رہیں گے۔ ان کے مقاصد پورے نہیں ہونے دیں گے لیکن ایجنسیاں اس بیان سے مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔

☆.....☆

دوسرے دن کے اخبارات میں چاند پور سے دہشت گردوں کے گروہ اور ان کی کارروائیوں پر مکمل فیچر شائع ہوا تھا۔ پولیس کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا تھا اور چوہدری کرم دین کی بھی خبر تھی جو بڑی خبروں میں محض بہت چھوٹی خبر تھی اور وہ بھی اس نتیجے کا شاخسانہ بتائی جا رہی تھی۔ اب کچھ دیر تک پھر ہم فارغ تھے۔ جب تک را ایجنسی یا موساد ایجنسی دوبارہ پاکستان میں اپنے سیٹ اپ بناتی اس وقت تک فارغ تھے۔ لہٰذا میں ویسے بھی ملک کی خدمت کے لئے رضا کارانہ خدمات پیش کر رہا تھا، مجھ پر کسی قسم کی پابندی بھی نہیں تھی نہ ہی میں کوئی ایسا کام کر سکتا تھا جو سرکاری طور پر کئے جاتے ہیں۔ ویسے میں حقیقت میں ایک عام آدمی تھا۔ انہیں دنوں ملتان کے ایک سینما میں ایک فلم شروع ہو رہی تھی اور اس کی پہلے شو کے لئے ہر جگہ پوسٹر چسپاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کئے جارہے تھے۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا شوق بالکل نہیں تھا اس لئے کبھی غور بھی نہ کیا تھا لیکن اب اچانک ایک پوسٹر پر میری نگاہ پڑی تو میں حیرت سے اپنی جگہ جم گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوچکی تھی کیونکہ جس فلم کا پوسٹر تھا اس پوسٹر پر عاتکہ کی تصویر جگمگا رہی تھی اور وہ اس فلم میں مشہور ہیرو شاہ رخ خان کے ساتھ عینیکے نام سے ہیروئن جلوہ گر تھی۔ فلم کا نام تھا ''نکلے تیری تلاش میں''۔ میں فوراً ہی سنیما چلا گیا اور اس کے مالک سے فلم ''نکلے تیری تلاش میں'' کے متعلق پوری تفصیلات سن لی تھیں اور اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ہوسکتا ہے چند ماہ پہلے اکرم نامی سپاہی کے گھر جو چکر میرے ساتھ چلا تھا وہی چکر اب میرے ساتھ دوبارہ چل رہا ہو یعنی عاتکہ کی ہم شکل لڑکی ہو اور اس کا نام واقعی ہی اینی ہو۔ لیکن اپنے جذبات کو چھپا نہ سکتا تھا۔ میں مطمئن نہ تھا لہٰذا فوراً ہی کرنل آفریدی کو کال کر کے کہا۔

''جناب آج ابھی کال کر کے میرے لئے پلین میں ایک سیٹ بک کروادیں ممبئی کے لئے۔ میں آج ہی ممبئی جانے کے لئے نکلوں گا۔'' انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' لہٰذا انہوں نے یہ بھی کام کر دیا اور کال کر کے کہا تمہاری شام چار بجے والی فلائٹ میں سیٹ کنفرم کردی ہے لہٰذا میں شام کو ممبئی جانے کے لئے تیار ہوگیا، شام کو ایئرپورٹ پر پاسپورٹ اور ویزہ کی مکمل جانچ پڑتال کروا کر میں جب جہاز میں بیٹھا تو مختلف اندیشے سر اٹھانے لگے کہ عاتکہ وہاں پہنچی کیسے، کیا وہ آگ میں جلنے سے پہلے ہی کسی نہ کسی طریقے سے نکل گئی تھی۔ یا کسی نے نکالا تھا لیکن کسی کو پتا کیوں نہ چلا۔ اب میں اپنا شک دور کرنے کے لئے اس عینی کو ملنا چاہتا تھا۔ انہی سوچوں میں ایک خوبصورت سی ایئر ہوسٹس میرے قریب آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''سر! آپ پریشان کیوں ہیں۔ اگر آپ کو میری ضرورت ہو تو بتائیں، آپ کی پریشانی دور کردوں گی۔'' میں نے شکریہ کے ساتھ اسے وہاں سے بھیج دیا تھا۔ جب ہم ممبئی ایئرپورٹ پر پہنچے تو دوبارہ امیگریشن کے لئے تیار ہونا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہمیں کسٹم والوں نے فارغ کردیا تو میں نے وہاں سے ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے اچھے سے ہوٹل میں چلنے کا کہا۔ ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے ایک اچھے سے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ ہوٹل میں ایک کمرا کرائے پر لے کر میں نے اپنا مختصر سا سامان کمرے میں رکھا اور ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور اس کا موبائل نمبر لے لیا تاکہ جب بھی ضرورت پڑے اسے کال کر کے بلوا لیا کروں۔ ڈرائیور اچھا آدمی معلوم ہوا تھا۔ دوسرے دن ناشتا کر کے میں نے ٹیکسی والے کو بلوالیا اور اس کے ساتھ بالی ووڈ کے ایک سنیما میں گیا۔ وہاں سے میں نے فلم ''نکلے تیری تلاش میں'' کے پروڈیوسر اور ہدایت کار سے ملنے کی درخواست کی تو اس نے مجھے ایک دوسرے پروڈیوسر تلاش ناتھ کے پاس بھیج دیا۔ تلاش ناتھ فلم انڈسٹری کے ایک مانے ہوئے مشہور پروڈیوسر تھے لہٰذا انہوں نے مجھے تمام کام چھوڑ کر ملنے کے لئے وقت دے دیا۔ میں نے اپنی درخواست میں یہ بتایا کہ جناب میں عینی ہیروئن سے ملنا چاہتا ہوں، مہربانی کر کے مجھے ان سے ضرور ملوادیں۔ انہیں کہیں کہ پاکستان سے ہادی نامی آدمی آیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اگر عاتکہ ہوئی تو جلد ہی مجھے ملے گی۔ ہوا بھی یہی۔ ایک جگہ شوٹنگ چل رہی تھی، پروڈیوسر صاحب مجھے وہاں لے گئے اور شوٹنگ ختم ہونے کے قریب تھی۔ لہٰذا تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد جب شوٹنگ ختم ہوئی تو عینی ہماری طرف آگئی۔ لیکن میرے قریب آتے ہی وہ فوراً ہی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ پھر میں نے بھی کوشش کی اور کہا۔

''کیا تم عاتکہ ہو؟'' یہ نام سنتے ہی وہ فوراً میری طرف بڑھی اور کسی کی موجودگی کا خیال کئے بغیر میرے گلے لگ کر رونا شروع کردیا۔ اس سین کو پروڈیوسر نے فوراً فلمانا شروع کردیا اور جب ہم علیحدہ ہوئے تو بولا۔ ''یہ سین اس فلم میں بہت پسند کیا جائے گا۔ جو بھی فلم ''نکلے تیری تلاش میں'' دیکھے گا ضرور مجھے داد دے گا۔'' تھوڑی دیر بعد ہم ایک اور ہوٹل میں آگئے جہاں پروڈیوسر صاحب نے کمرے بک کروا رکھے تھے۔ وہاں میں نے عاتکہ عرف عینی سے پوچھا۔ ''تم کیسے یہاں پہنچیں اور پاکستان میں کیا ہوا تھا؟'' تو عاتکہ بولی۔

''جب میں نے تمہیں میسج کئے تھے تو اس وقت تمہارا موبائل بند تھا۔ میں نے سوچا جب تم اسے آن کرو گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس وقت پڑھ لو گے۔ اس کے بعد میرے کپڑوں میں بھی آگ لگنا شروع ہوگئی تھی۔ میں اس وقت ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔ نہ جانے اس وقت کسی نے مجھے پکڑا اور آگ سے نکال لیا تھا۔ میرے جسم پر کپڑے جلنے سے کچھ ہلکے زخم ضرور آگئے تھے لیکن میں زندہ بچ گئی تھی۔ بعد میں جب ہوش آیا تو میں یہاں ممبئی کے ایک ہوٹل میں تھی۔ پھر میرے پاس ایک آدمی آیا اور بولا تم بہت خوبصورت ہو، میں کافی دنوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتی ہو، اگر غصہ نہ کرو اور مجھ پر اعتماد کرو تو تمہیں فلموں میں کام مل سکتا ہے۔ لہٰذا میرا کوئی جاننے والا تھا نہ ہی کوئی اور لہٰذا میں قدرتی طور پر اس پر بھروسہ کرنے لگی۔ وہ آدمی مسلمان تو تھا لیکن فلم میں ایک ہیرو کے طور پر جانا پہچانا جاتا تھا لہٰذا چند دن بعد وہ مجھے لے کر پروڈیوسر کے پاس پہنچا اور اسے میرے لئے چانس دینے کو کہا۔ پروڈیوسر پہلے تو مجھے ہوس ناک نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا ٹھیک ہے آپ اسے یہاں چھوڑ جائیں۔ پروڈیوسر کا نام پانڈے تھا۔ اس آدمی نے کہا میری امانت ہے اور اصل میں کسی اور کی امانت ہے۔ یہ اس وقت آنے پر پہنچ جائے گی اس لئے اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہ کرنا ورنہ انجام برا ہوگا۔ چند دن تو ٹھیک گزرے آخر اس کی مجھ پر نیت خراب ہوگئی لیکن مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ آدمی نہ جانے کہاں سے اچانک نکلا اور پانڈے کو دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا، یہاں سے وہ خود فلم کے اداکاروں سے ملا اور اپنا نام بتایا پھر اچانک غائب ہوگیا۔ چند دن بعد اس کے کمرے سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ میں اپنا تمام سیٹ اپ مس عینی کے نام کر رہا ہوں۔ اس وقت سے میں فلم کے لئے کام کرنے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا میں نے ایک رائٹر سے کہانی لکھوائی اور اس کام میں تمام روپیہ پانڈے کا ہی خرچ ہوا تھا لہٰذا میں نے ایک پیغام کے ذریعے شاہ رخ خان سے رابطہ کر کے اسے آفر کردی کہ میرے ساتھ بطور ہیرو آئے لہٰذا تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ مان گیا اور یہاں آگیا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ سال بعد وہ فلم مکمل ہوئی تھی۔ اب ایک کمرشل اشتہارات کی شوٹنگ چل رہی تھی جب تم یہاں آگئے۔ چند ماہ میں میں نے عاتکہ کا بھی پاسپورٹ بنوالیا۔ فلم انڈسٹری سے بالکل دور کردیا تھا پھر اسے لے کر میں پاکستان آگیا۔ یہاں ہمارا استقبال ہونے کے بجائے چند خبریں ہی دردناک ملیں جن میں سرفہرست چانڈیو صاحب اور عاتکہ کی والدہ کی وفات کی خبریں تھیں۔ عاتکہ کی والدہ ثریا بیگم اٹیک ہونے پر وفات پاگئی تھیں اور چانڈیو صاحب ایک معرکے کے دوران جو کہ منڈی کے اسی آڑھتی کے ساتھیوں کے ساتھ ہوا تھا جہاں منڈی میں آڑھتی ناجائز اسلحہ کی اسمگلنگ میں ملوث پایا گیا تھا، مقابلہ میں وہ بھی اپنے چند ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا لیکن چانڈیو جیسے پاکستانی جانثار کی قربانی دینے کے بعد اور یہ مجھ سے صرف پندرہ دن پہلے ہی وہ ایک قبرستان میں جا سوئے تھے۔ چانڈیو کی کوٹھی میں اس کی بیوی یعنی سونیا کی ماں بھی تھیں جو مجھے دیکھنے کے بعد رونا شروع ہوگئی تھیں۔

اس کے بعد میں نے ایک چکر اپنے آبائی گاؤں کا لگایا اور وہاں سے اپنی تمام زمینیں اپنے نام کروائیں اور انہیں فروخت کردیا۔ پھر دوبارہ آکر عاتکہ سے شادی کرلی لیکن کچھ روز بعد مجھے سونیا کی ماں نے کہا۔

''بیٹا تم سونیا سے شادی کرلو'' اس پر عاتکہ نے بھی زور دیا لہٰذا پہلے عاتکہ کے والد چوہدری کرم دین کی زمینیں بھی عاتکہ کے نام لکھوا کر اسے غریبوں میں تقسیم کردیا اور سونیا کے ساتھ شادی بھی کرلی اور اپنی دونوں بیویوں اور سونیا کی والدہ کو لے کر کرنل آفریدی کی مدد سے لندن رہائش اختیار کرلی۔ اب میں وطن سے دور اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ لندن میں رہائش پذیر ہوں۔ دونوں بیویاں آپس میں بہت محبت سے رہتی ہیں۔ دونوں سے میرے چار بچے ہیں۔ اپنی زمینوں کے پیسوں سے یہاں میں نے اپنا کاروبار شروع کردیا تھا جو اب کئی ملکوں میں پھیل گیا ہے۔ پاکستان بھی کبھی کبھی جانا پڑتا ہے۔ ویسے اب میں وسیم کے نام سے ہی رہ رہا ہوں لیکن وطن وطن ہی ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو۔ اب کافی عرصے سے میں پاکستان نہیں جاسکا، لیکن حالات یعنی بگڑتے ہوئے حالات دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

www.paksociety.com

ہوش و خرد سے بیگانہ زمانے کے ان دیوانوں کی داستانیں
جو آج آہنی سلاخوں کے پیچھے خود اپنی ذات کو کھوج رہے ہیں

عشق عالی نصب!

سیدہ تبسم زہرا رضوی

زر کے پیچھے اپنوں کو غلام کرنے والے کبھی خود بھی غلام ہو جایا کرتے ہیں

''دری میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں تمہیں کوئی ہوش ہی نہیں ہے۔'' فواد کی غصے بھری آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کہاں ہو؟''

''یہیں ہوں یونیورسٹی میں۔''

''ابھی نہیں آسکتی۔''

''تمہیں یہ بات پتا ہے کہ تمہیں دیکھے بنا مجھے چین

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

نہیں آتا۔'' فواد کی آواز میں غصہ ہنوز برقرار تھا۔

''مجھے معلوم ہے لیکن ابھی کلاس لینی ہے۔ اگر رپورٹ خراب ہوئی تو بھاؤ مجھے یونیورسٹی سے اٹھالیں گے۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''تم لڑکے سمجھتے ہو کہ ہم بڑے عقل مند ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ ہم لڑکیاں دور کی سوچتی ہیں۔'' دریشہوار نے سنجیدگی سے کہا۔

''جاناں وہ دن کب آئے گا جب یہ دوری یہ انتظار یہ ہجر یہ فراق سب ختم ہو جائے گا۔'' فواد حسن اردو میں ماسٹرز کررہا تھا اور گاڑھی اردو بولنے کی کوشش کرتا تھا۔

''میرا دل چاہتا ہے کلاس میں تم میرے ساتھ ہو، میں پڑھتا رہوں، لکھتا رہوں جب گھر چلیں دونوں ساتھ ہوں۔ پھر شام کو ہمارے گھر محفل موسیقی ہو، میں بھی گٹار بجا کر نغمہ سناؤں لیکن جب تم نے ہی نہیں سنا تو پھر کیا فائدہ تم سلامت رہو مسکراؤ ہنسو میں تمہارے لیے گیت گاتا رہوں۔''

''واؤ، واہ جانی تم تو غضب کا گاتی ہو۔''

یہیں تک ہے یہ گانا، اگر بھائیوں کو پتا چلے گا یونیورسٹی سے اٹھالیں گے۔''

''بس تمہاری بات کا اختتام اسی بات پر ہوتا ہے۔ اچھا اب کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل بند کردیا۔

دری ایک جاگیردار کی بیٹی تھی اور فواد ایک عام انجینئر کا بیٹا۔ تمیزدار، اعلیٰ خاندان، افضل احمد خان کا بیٹا فواد احمد خان کی ماں کشور خانم پڑھی لکھی خاتون تھیں اور مقامی کالج میں پروفیسر تھیں اس کی دو بہنیں تھیں۔ سیما ریما ہنس مکھ خوش مزاج۔ گھر کا ماحول خوشگوار تھا۔ دونوں بہنیں اس سے چھوٹی تھیں۔ صبح گھر میں تالا ہوتا تھا۔ دوپہر سب جمع ہوتے تو بہنیں مما کا ہاتھ بٹاتیں اور کچھ ہی وقت میں ٹیبل لگا دیتیں مزیدار کھانا اس کی کمزوری تھا سو وہ کمزوری مما، سیما اور ریما مل کر پوری کردیتی تھیں۔

جب تنہائی ملتی تو فواد حسن، دریشہوار کے بارے میں سوچتا تو سوچتا چلا جاتا۔ کوئی چیز تھی جو اسے اندر سے پکارتی تھی کہ اس کا دریشہوار کا ملن نامکمل تو نہیں لیکن انتہائی مشکل ضرور تھا۔ میں زمین کا ذرہ اور دریشہوار آسمان کا تارا۔ بھلا اس کا اور میرا کیا جوڑ۔ وہ جاگیردار کی بیٹی اور میں معمولی انجینئر کا بیٹا۔ لیکن میری ماں پروفیسر ہے۔ ہمارا شمار صاحبان علم میں ہوتا ہے۔ معاشرے میں ہماری عزت ہے۔ کون پوچھتا ہے عزت کو؟ بس جو کچھ ہے وہ پیسا ہی ہے۔'' اور ایک سرد آہ اس کے سینے سے خارج ہو جاتی۔

''میں اپنی دری کے بغیر بھلا کیسے رہوں گا۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو جاتے۔

اب وہ اتنا آگے جا چکے تھے کہ واپس پلٹنا مشکل تھا۔ ان کی پسندیدگی پہلے محبت اور پھر عشق کے مراحل میں داخل ہو رہی تھی اس کے دوست اسے مذاق میں قیس میاں کہتے تھے۔ عام لوگ سمجھ بھی نہیں پاتے کہ مجنوں ان کے درمیان گھوم رہا ہے۔ فواد دوستوں میں گھر میں خوب ہنستا بولتا لیکن اسے گھن لگ چکا تھا۔ اندر ہی اندر فکر و پریشانی اسے چاٹ رہی تھی۔ اس کا اندر کسی بڑے خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ تھوڑا بہت ادراک تو دریشہوار کو بھی تھا لیکن وہ فطرتاً کھلنڈری لڑکی تھی۔ رخشی اس کی عزیز از جان دوست تھی۔ وہ اسے سمجھاتی تھی یار اس آگ سے نہ کھیل۔ رخشی کی ماں بچپن میں وفات پا گئی تھیں۔ اسے نانی ماموں نے پالا تھا۔ کہتے ہیں جن بچوں کے والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں بچپن میں وفات پا جاتے ہیں ان کی دو آنکھیں سر کے پچھلے حصے میں نکل آتی ہیں۔ رخشی کا شمار ان ہی لوگوں میں تھا۔ وہ خطرے کی بو سونگھ رہی تھی۔

☆.....☆

اس مرتبہ دری جب گھر گئی تو اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھ کی لڑکیوں کی شادیاں یا تو ہو چکی تھیں یا پھر کہیں طے تھیں یا ہو رہی تھیں۔ ان کے کمدار کی بیٹی اس کی کلاس فیلو تھی۔ غلام صغریٰ کی شادی کل تھی۔ خوب زور و شور سے ڈھول پٹے ہو رہے تھے۔ آواز ان کی حویلی میں بھی آرہی تھی۔ حالانکہ ان کا گھر کافی دور تھا۔ اچانک دریشہوار کو خیال آیا کہ اس نے کبھی اپنی شادی کی بات نہیں سنی، کبھی کبھی اماں نے بابا نے اس کی شادی کا ذکر نہیں کیا۔ خالہ کے دو بیٹے تھے۔ چچا کے تو چار تھے۔ پھوپو کا جواد علی آگے پیچھے پھرتا تھا۔ ادھر ماموں دلنواز کا نبیل کتنی مٹھاس ہوتی تھی اس کی نظروں میں مگر یہ دل بدبخت تو اسی کے نام کی پوجا کرتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا جو اس کے من مندر کا دیوتا تھا۔ فواد حسن کی طرف ذہن مڑا تو پھر کہیں اور کی خبر ہی نہیں رہی۔ پتا نہیں یہ نام کیسا تھا سارے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔

ایک مسرور کیفیت سارے وجود پر چھا جاتی۔ رواں رواں اس کا طلب گار بن جاتا کہیں سے بھی لاؤ مجھے میرا محبوب چاہیے۔ یہ وہ آواز تھی جو روح کی گہرائی سے نکلتی اور تمام وجود پر چھا جاتی۔ پتا نہیں اماں بابا میری شادی فواد سے کریں گے کہ بھی یا نہیں۔ آج تک تو ہمارے خاندان میں کوئی شادی غیروں میں نہیں ہوئی۔ خیر ابھی تو وہ حج کرنے جا رہے ہیں۔ واپس آئیں گے تو میں اماں سے بات کروں گی۔ صبح امی بابا کی روانگی تھی۔

سب مل کر انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے گئے تھے۔ بہت سے عازمین حج ہنستے بولتے عازم سفر تھے۔ ان کے پیارے انہیں الوداع کہنے آئے تھے۔ رخشی کی خالہ بھی جا رہی تھیں۔ ماں کے بعد اگر تھوڑا بہت کچھ خیال کسی نے رکھا تو یہی خالہ جان تھیں سو وہ ان کے گلے مل کر رو رہی تھی۔ دری اس کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اب یہی آنسو اس کا مقدر بن چکے۔

''ارے یار وہ اتنی بڑی جگہ جا رہی ہیں جس سے بڑی کوئی جگہ نہیں روئے زمین پر سب سے متبرک جگہ۔ یہ سعادت تو قسمت والوں کو ملتی ہے اور تم رو رہی ہو۔'' اس نے رخشی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میری بھی تو امی جا رہی ہیں۔ میں ہنستے ہوئے انہیں چھوڑنے آئی ہوں۔ کوئی رو رہی ہوں کیا، سب سے چھوٹی منی ہوں میں اماں کی۔'' اس طرح کہنے پر سب کو ہی ہنسی آ گئی۔

ادھر فلائٹ کا اعلان بھی ہونے لگا پھر سب نے آنسوؤں میں اپنے پیاروں کو الوداع کہا۔ کچھ وہیں بیٹھے رہے اور کچھ واپس ہو لیے۔

''میرے خیال میں ہم بھی پلین فلائی کا انتظار کر لیتے ہیں کہیں بابا اماں کو کوئی پریشانی نہ ہو جائے۔ سامان بھی کافی ہے اور لوڈ سامان کبھی کبھار واپس بھی کر دیتے ہیں۔''

وہ لوگ بیٹھ گئے کچھ دیر بعد بابا کا فون آ گیا۔ ''ہم لوگ جہاز میں بیٹھ چکے ہیں اور چند منٹ میں روانہ ہو جائیں گے۔''

فون سن کر ہم لوگ واپس آ گئے۔

☆.....☆

وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ وقت ملے اور وہ فواد سے بات کرے۔ ایئرپورٹ سے نواب شاہ فاصلہ چھ گھنٹے کے قریب تھا۔ سب کا تھکن سے برا حال تھا۔ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مائی رضیہ سب کو چائے کھانا ان کے کمروں میں پہنچا رہی تھیں۔

اس نے پہلا کام یہ کیا کہ فواد حسن کو کال ملائی۔

''جانو کیسے ہو۔ سارا دن گزر گیا تم سے بات ہی نہیں ہوئی۔''

''شکر ہے تمہیں خیال آ گیا۔ کب سے ٹرائی کر رہا ہوں۔ لیکن تمہارا موبائل بند جا رہا تھا۔''

''اچھا جانو سوری۔'' اماں بابا کے جانے کی پوری کہانی سنا دی۔

پھر عشق و محبت ہجر و فراق شروع ہوا تو نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا اور صبح ہو گئی دریشہوار کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ فواد کی چاہت اس کے رگ و پے میں سرائیت کر چکی تھی۔ صبح دم اس کی آنکھ لگ گئی۔ بارہ بجے کے قریب مائی رضیہ کی دستک پر آنکھ کھلی۔ ''بی بی صاحب آپ کو یاد کرتا ہے۔''

وہ اٹھ گئی۔ لاؤنج میں سب جمع تھے۔ چاروں بھائی کامران بھاؤ، عمران بھائی، عرفان بھائی اور فرقان بھائی۔ کامران بھاؤ کی شوگر مل تھی۔ انہوں نے عمران بھائی کو اس کا جی ایم بنایا ہوا تھا۔ عرفان بھائی زمینداری دیکھتے تھے۔ بابا کی زمینوں پر گنے کی کاشت کرواتے جو شوگر ملز میں کام آتا۔ فصل کے دنوں میں بڑا ہلا گلا ہوتا۔ کچھ جگہ کپاس لگی تھی اس کی فصل ہوتی تو عورتیں زرد لباس پہنتیں۔ کانوں میں چاندی کے جھمکے ہاتھوں میں زرد چوڑیاں کنگن پہنے کپاس چنتی۔ کبھی کبھی وہ بھی فرقان بھیا کے ساتھ زمینوں پر چلی جاتی۔ زرد لباس پہنے ہاری خواتین کے انٹرویو کرتی۔ شہوار بہت مگن رہتی۔

پہلے وہ فرقان بھائی جو ابھی زیر تعلیم تھے انہیں فرقان بھائی کہتی تھی لیکن جب سے فواد زندگی میں آیا تھا۔ ریما، سیما اس کو بھیا کہتی تھیں۔ اسے یہ لفظ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بھی بھیا کہنے لگی تھی۔ کامران بھاؤ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے بہت بڑے تھے۔ ان کی شادی بھی اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہوگئی تھی۔ سنتی تھی کہ بھابی جان زہرا نے اسے امی کے ساتھ مل کر پالا تھا۔ دوسرے نمبر کی بھابی رشیدہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھیں اور بھائی عرفان کی شادی میں تو اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ سب کزنز کے ساتھ مل کر لڈی اس زور وشور سے ڈالی تھی کہ سب عش عش کر اٹھے تھے۔ سب کی اٹھتی ہوئی نظریں مٹھاس اور آس لیے ہوئے ہوتیں۔ کاش یہ کل ہمارا آنگن مہکا دے اور شہوار اس بات سے بے خبر تھی کہ اب وہ وقت آنے والا ہے کہ یہ شعر اس کی زندگی بن جائے گا۔

اے کاش آ کے وہ ہمیں اک بار دیکھ لے
اڑتی ہے کیسے پھول کی مہکار دیکھ لے

فواد حسن کی چاہت اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ تو اس دن کسی سہیلی کا فون آیا ہوا تھا اور وہ خوش ہو کر اسے بتا رہی تھی کہ رضوان معظم کے یوٹیک میں اس قدر خوب صورت شرارے آئے ہوئے ہیں کہ اللہ کی پناہ خوشی تھی کہ رخسار دھکائے دے رہی تھی۔ ماسی رضیہ برتن اٹھانے آئی تھیں اور بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لائن کٹ گئی تھی اس نے ان کی طرف دیکھا تو بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ ''کیا آپ کی بھی شادی ہو گئی؟''

تیر کمال سے نکل چکا تھا۔ انہیں خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا سو جلدی سے باہر کی طرف رخ موڑا۔

''کیوں؟ میری شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''بس بی بی منہ سے نکل گیا معاف کر دو۔'' وہ جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔ لیکن اپنے پیچھے سوال چھوڑ گئی تھیں۔

ان چوہدریوں، وڈیروں، خانوں کے زمینداروں کے ملازموں کے کان دماغ ان کی ساتھ رہ کر بہت تیز ہو جاتے ہیں۔ مائی کے کانوں نے بھی خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ سامنے کوئی وجہ نہیں ہوتی پھر بھی چھٹی حس کچھ کہہ رہی ہوتی تھی۔ مائی کے دل کی دھڑکنوں نے اسے آنے والے طوفان کی خبر دے دی تھی۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک فون نے سب کو ہلا دیا۔

دوران حج اماں بابا کچل گئے تھے۔ بھگدڑ نے دونوں کو کچل ڈالا تھا۔ ڈاکٹر بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر کچھ یوں ہوا کہ پل کی پل میں درِ شہوار بنا ماں باپ کی بیٹی رہ گئی۔

ہزاروں سفارشوں کے بعد لاشیں مل سکیں۔ دری پر سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ لاشیں آ گئیں۔ بابا کی بہنیں بھائی امی کی بہنیں بھائی خود اس کے بھائی بھابی چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اور وہ خود بالکل خاموش! یہ تو ماں کی سب سے لاڈلی تھی۔ پتا نہیں آنسو کہاں چلے گئے تھے وہ تو جب جنازے اٹھ رہے تھے تب بڑی خالہ نے اس کے منہ پر طمانچے مارے۔ ''دیکھ اماں جا رہی ہیں۔''

تب خیال آیا کہ بچپن میں اگر امی جا رہی ہوتیں تو وہ زبردستی ان کے ساتھ ہو جاتی تھی۔ کہیں موت میت میں لوگ بچے نہیں لے جاتے لیکن شہوار اتنی ضد کرتی کہ اماں کو لے کر جانا پڑتا۔ ایک دم خیال آیا کہ کہیں اماں چھوڑ نہ جائیں۔ ہوش آیا تو جنازے اٹھ رہے تھے۔ وہ دوڑ کر ماں کے جنازے سے لپٹ گئی۔

''اماں پیاری اماں میں بھی چلوں گی۔ اماں لے چلو، بابا لے چلو مجھے بھی لے چلو۔'' کاش ایسا ہو جاتا کہ یہ لوگ اسے بھی لے جاتے۔

بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا۔ کل والے دن فواد کا خیال آیا، موبائل دیکھا بہت سی کالز آئی ہوئی تھیں۔ اسی وقت پھر فون آ گیا۔

مرد عورت سے ہر لحظ بدگمان رہتا ہے۔ ''ہیلو فرصت مل گئی جناب کو؟'' فواد کی روٹھی روٹھی آواز سنائی دی۔

''جانو لٹ گئی، برباد ہو گئی۔ امی گئیں، بابا گئے ہمیشہ کے لیے۔''

''کیا.....! اف میرے خدا۔''

''ہاں فواد ہاں۔'' پھر یارا نہ رہا۔ فون منہ سے لگا کر اتنا روئی اتنا روئی کہ دریا بہہ گئے۔

''سفرِ حج سفر آخرت ہو گیا۔'' فواد دلاسہ دے رہا تھا۔ خود اس کا اپنا بھی برا حال تھا۔ بہر حال وقت نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مرہم پٹی والا۔ زخم کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو وقت اسے مندمل کر دیتا ہے لیکن شہوار کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس کے لیے غموں کا کارخانہ کھل گیا ہے۔ اس نے یونیورسٹی سے لمبی چھٹی لے لی تھی۔ بھابیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

امی کی الماری کی تلاشی لے رہی تھیں۔ کروڑ پتی بھائی بھی ان کے دم ساز تھے۔ چالیسواں بھی نہیں ہوا تھا کہ وکیل کی آمد نے سب کو ہلا دیا۔ کاغذات کی رو سے اماں بابا اپنے حصے کا بہت کچھ دری کو دے گئے تھے اور تو اور یہ حویلی بھی اسی کے نام کر گئے تھے۔ جب وکیل صاحب نے وصیت نامے کی ڈپلیکیٹ کاپی کامران بھاؤ کو دکھائی تو ان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے وکیل صاحب کو خریدنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔ ادھر فواد چند دوستوں اور رخشی کو لے کر حویلی تعزیت کے لیے آ گیا اور بھائیوں کی نظروں نے معاملہ تاڑ لیا اور فکر دو چند ہو گئی۔ درِ شہوار کو پتا چل چکا تھا کہ جائیداد اس کے نام ہے۔ دری کو کبھی پیسے کی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو پیسے کی قدر بھی نہیں تھی۔ جیب خرچ تو اب بھی مل رہا تھا۔

لیکن بھائیوں کی نظریں بدلتی جا رہی تھیں۔ چہلم کے بعد جب اس نے یونیورسٹی جانے کا ارادہ کیا تھا تو کامران بھاؤ نے منع کر دیا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بھاؤ میرا آخری سال ہے؟''

''کہہ دیا ناں نہیں۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

دری خاموش ہو گئی۔

بھاؤ کو خوف تھا کہ دری کہیں فواد سے شادی نہ کر لے۔ جب جائیداد کا خیال آتا بھاؤ کمرے میں بند ہو جاتے۔ جام پر جام چڑھائے جاتے، پر فکروں میں کمی نہیں ہوئی۔ اپنے حصے کی دولت وہ شراب کباب شباب میں اڑا چکے تھے۔ شوگر مل گروی تھی۔ سوچا تھا کہ ماں باپ سے روپیہ لے کر شوگر مل چھڑا لوں گا۔ اب قانون کی رو سے سب کچھ دری کے نام کر کے خود الگ ہو جاتا تھا۔ کروڑوں کا اکاؤنٹ زمینیں حویلی۔ اتنا بڑا دل کہاں سے لاتے۔ پھر خود خالی ہو جاتے۔

پھر انہوں نے وہ خوفناک فیصلہ کر لیا جو ان جیسے بہت سے لوگ کر لیتے ہیں۔ دری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کا۔ حالانکہ انہوں نے دری کو اولاد کی طرح پالا تھا۔ ان کی ماہ رخ اور دری میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ وہ دری کو چاہتے بھی بہت تھے مگر برا ہو اس پیسے کا جو کبھی کسی کا نہ ہوا۔

انہوں نے بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اب شہوار کسی قیدی کی زندگی گزار رہی تھی۔ پہلے وہ فواد کو کچھ نہیں بتاتی تھی لیکن ایک دن جب دل بہت دکھا تو سب بتا دیا۔

''تم ان سے کہہ دو کہ سب کچھ لے لیں لیکن تمہیں آزاد کر دیں۔''

''اچھا!''

لیکن دری کو ان سے ڈر لگتا تھا۔ وہ انہیں اپنے دشمنوں سے خوفناک سلوک کرتے دیکھ چکی تھی۔ حویلی کے تہہ خانے کے بارے میں باعلم تھی۔ آخر فواد نے خود بھائی سے بات کی ٹھان لی اور بات کر کے وہ کہا جو شہوار نہیں کہہ سکتی تھی۔

''بابا تمہارے لیے خاموشی بہتر ہے۔''

پھر دوسری صبح جب وہ یونیورسٹی جا رہا تھا گاڑی پر ایسی فائرنگ ہوئی پورا برسٹ پڑا۔ وہ شدید زخمی ہو گیا۔ فائرنگ کرنے والے سمجھے کہ کام ہو گیا لیکن اسے نہ صرف ہوش آ گیا بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوش آ گیا۔

پاپا خفا ہو رہے تھے انہیں اس کے دری سے عشق کا پتا چل گیا تھا۔ وہ تقریباً اچھا ہو گیا تھا۔ ادھر دری کو کھانے میں پینے میں مستقل ایسی دوائیں دی جا رہی تھیں جنہیں استعمال کر کے دری ذہنی مریضہ بن چکی تھی۔ موبائل تو اس سے کب کا لیا جا چکا تھا۔ ادھر فواد کو پاپا نے کینیڈا بھجوا دیا۔

لیکن عشق کی آگ سرد نہ ہوئی۔

اب وہ پہلے سے مضبوط ہو چکا تھا۔ اس نے کسی طرح سے دری کو پیغام بھجوا دیا کہ ''تم بالکل پاگل کا ڈھونگ رچاؤ اور ان کی دوائیں چپکے سے پھینک دینا۔''

دری نے یہی کیا اور خاندان والوں نے اس کو پاگل خانے بھجوانے پر غور شروع کر دیا۔ دری نے وہ اچھل کود مچائی کہ اللہ کی پناہ۔ مائی رضیہ کی چوٹی پکڑ لی۔ ماہ رخ کو چانٹے مارے، بھابیوں کو مارا اور تو اور سارے فساد کی جڑ کامران بھاؤ کو گلدان کھینچ مارا۔ چوٹ لگنے سے ان کی پیشانی سے خون بہہ نکلا۔ اور انہوں نے غصے سے مغلظات بکتے ہوئے پاگل خانے کا رخ کیا۔ کمدار کو ساتھ لے کر انہوں نے شہوار کو ذہنی امراض کے ادارے میں داخل کرا دیا۔ وہاں بالکل پاگل بنی ہوئی دری نے کسی سے موبائل مانگ کر فواد کو فون کر دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''گڈ وہاں کا ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ اب تم آرام سے رہو۔ اپنے کھانے کا خیال رکھو۔ صحت بہت بناؤ۔ پاگل پن کی ایکٹنگ جاری رکھنا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

پھر فواد نے منصوبہ دوست کے سامنے رکھا۔

''نہیں نہیں یار یہ خطرناک گیم ہے۔ اس کھیل میں میں تمہاری مدد نہیں کرسکوں گا۔''

فواد کا خیال یہ تھا کہ ''ایدھی سینٹر سے رابطے میں رہو اور شہوار کے گھر اطلاع کردو کہ اس نے خودسوزی یعنی اپنے آپ کو آگ لگالی ہے اور ایدھی سے جلی ہوئی لاش ورثاء کے حوالے کردو۔''

''نہیں اس میں خطرہ ہے۔''

''اس کے علاوہ ایک حل یہ ہے کہ رسی سے فرار کرادوں گا لیکن اس کا معاوضہ دس لاکھ ہوگا۔''

''دس لاکھ.....! میرے خدا۔''

''یار کام بھی تو دیکھ۔''

''اور پھر بہت کچھ ہوا۔ در شہوار کو رسی مہیا کردی گئی جس میں فاصلے سے گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ رات بہت اندھیری تھی۔

در شہوار نے بیگ میں دو جوڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ جب دری کے موبائل پر بیل آئی۔ دری نے بیگ کو گلے میں لٹکا لیا۔ یہ بھی ڈاکٹر کی طرف سے مہیا ہوا تھا۔ پھر کھڑکی کی طرف کا رخ کیا۔ نیچے رسی لٹک رہی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خوف سے بری حالت تھی۔ وہ بھی اس طرح نہیں کودی پھاندی تھی۔ بہرحال اللہ کا نام لیا اور رسی سے لٹک گئی۔ بہت مشکل سے نیچے اتری۔ کچھ دور چلی پھر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی۔ تین مرتبہ سگنل دیا اور شہوار اس طرف چل دی درمیان میں ریل کی پٹڑی تھی۔ شہوار عبور کرکے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلانے والا خاموش تھا لیکن اس کی شکل خوفناک تھی۔ یہ کراچی ہی کا علاقہ تھا جلد ہی وہ ایئرپورٹ پہنچ گئی۔ دو گھنٹے بعد وہ نقلی نام سے کینیڈا کے لیے پرواز کرگئی۔ یہ تمام وقت اس نے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اور تمام انتظامات اسے ڈاکٹر شہزاد نے دس لاکھ کے عوض فراہم کیے تھے۔

صبح ڈاکٹر نے کامران بھاؤ کو فون کرکے شہوار کے غائب ہونے کا بتایا۔ وہ اپنی مصیبت میں گرفتار تھے۔ روشنی بائی کے کوٹھے سے آتے ہوئے ان کی گاڑی نے ایک بندے کو کچل دیا تھا۔ یہ نشے میں گالیاں بک رہے تھے۔ ایسے میں شہوار کی گمشدگی کی اطلاع ملی۔ گالیوں میں مزید نکھار آگیا جس دن سے اس کو داخل کیا تھا۔ کوئی پلٹ کر اس کو دیکھنے تک نہیں گیا تھا سب کی اپنی مصروفیات تھیں۔ پاگل کو کون پوچھتا۔ ہاں مائی رضیہ ایک دن آئی تھی اور بہت غم کرتی ہوئی واپس گئی تھی۔ سوئے اتفاق کہ اس کے فرار کے فوراً بعد اسی عمر کی ایک لڑکی کہ جس کا ذہنی توازن خراب تھا ریل کی پٹڑی پر لیٹ گئی۔ اس کی لاش بری طرح کچل گئی تھی۔ کوئی لینے بھی نہیں آیا تھا۔ قد بھی دری سے مشابہ تھا۔ سو دری سمجھ کے دفنا دیا گیا۔ اس کی موت پر سوائے مائی رضیہ کے کوئی رویا تک نہیں۔

برے کام کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔ کامران بھاؤ پر قتل کا کیس بن گیا تھا۔ وہ بندہ بااثر سیاسی پارٹی کا بندہ تھا اس کے ورثاء نے اس کی لاش لے کر شاہراہ بلاک کردی تھی۔ اس کے قتل کے جرم میں کامران جیسے فرعون کو کوئی ہزار کوشش کے بعد بھی نہ بچا سکا۔ ان کو سزائے موت ہوگئی۔ تختہ دار پر ان کی جھولتی ہوئی لاش ان کے بھائیوں کے لیے اطمینان کا باعث تھی۔ کیونکہ اللہ کی عدالت میں فیصلے ہمیشہ انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔

شہوار، فواد حسن کی بیوی تھی قانونی و شرعی۔ فواد تو منع کرتا تھا لیکن اس نے وکیل سے رابطہ کیا۔ اصل کاغذات پر مقدمہ کیا اور جیت گئے۔ باقی بھائی ان حالات میں ڈر گئے تھے سو پراپرٹی مل گئی۔ گاؤں میں ان کا شاندار استقبال ہوا، سارے گاؤں میں جشن منایا گیا۔ باقی بھائیوں نے گلے لگالیا تھا لیکن شہوار کو اب کسی پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اسے تو اپنے منے کو بھی ان کو دیتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ سو واپسی کا ارادہ کیا۔ ساس سسر کو ساتھ لیا اور کینیڈا کا رخ کیا۔ سیما ریما کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ شہوار بہت اچھی بہو ثابت ہوئی۔ میاں جی تو پہلے ہی دیوانے تھے اب عاشق پروانے بھی ہوگئے تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

اپنی طرز کی 15 پُر اثر، سخن ور حکایتیں

مختصر بحر کی وہ حکایتیں

جن کی سادگی ہی اِن کا حسن ہے

کانٹوں بھری سیج

نازیہ بتول رضا

اس کم سن دوشیزہ کا زندگی نامہ، جس نے عمر بھر کے لیے کانٹوں بھری سیج کا انتخاب کرلیا تھا

اس وقت سہ پہر کے تین بج چکے تھے اور آصفہ اسکول سے اب تک نہیں لوٹی تھی۔ جہاں آراء دروازے کے سیکڑوں چکر لگا چکی تھیں لیکن آصفہ کا دور دور تک پتا نہ تھا جب کہ اس سے چھوٹی صفیہ کو اسکول سے آئے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ جہاں آراء کے بار بار سوال کا صفیہ کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

''اماں آپی اپنی دوستوں کے ساتھ آتی ہیں اور میں الگ۔ اب مجھے کیا پتا آپی کہاں گئیں؟''

صفیہ اور آصفہ ایک ہی اسکول میں پڑھتی تھیں لیکن صفیہ پرائمری سیکشن میں تھی اور آصفہ سیکنڈری سیکشن میں میٹرک کی طالبہ تھی۔ پڑھائی تو کیا خاک کرتی بس اسکول ایک تفریح تھی اس کے لیے۔ نہ جانے میٹرک تک بھی کیسے کھینچ تان کے پہنچ پائی تھی اور اس کی اماں بھی کون سا اس کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتی تھیں کہ ہانڈی چولہا ہی کرنا ہے تو پڑھائی کا کیا فائدہ۔ اب یہ انہیں کون سمجھاتا کہ پڑھائی الگ چیز ہے اور ہانڈی چولہا الگ۔

اس وقت بھی جہاں آراء پریشانی میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھیں۔

''ارے آگ لگے ایسی پڑھائی کو اس موئی پڑھائی کے بہانے آزادی مل گئی ہے ان لڑکیوں کو۔ مجھے بتائے بنا نہ جانے کس سہیلی کے گھر چلی گئی ہے۔ آج آجائے ذرا یہ کم بخت آگ لگادوں گی اس کے بستے کو بس بہت ہوگئی پڑھائی وڑھائی۔''

☆.....☆

آصفہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ''پر'' نکل آتے ہیں اور وہ خود کو کسی فلم کی ہیروئن سمجھنے لگتی ہیں اور سامنے نظر آنے والا ہر لڑکا ان کا ہیرو ہوتا ہے۔

آصفہ نے بھی جیسے ہی میٹرک کلاس میں قدم رکھا اس کے پر پُرزے نکل آئے وہ خود کو اپسرا سمجھنے لگی۔ صبح اسکول جاتے وقت خوب بناؤ سنگھار کرتی 'فیئر اینڈ لولی'، پاؤڈر اور کاجل خوب تھوپ کر اپنی سانولی رنگت کو چھپانے کی کوشش کرتی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اسکول کے راستے میں اس کے کئی ''ہیرو'' راستے میں اس کے لیے آنکھیں فرش راہ کیے بیٹھے ہوں گے۔ وہ بھی خوب پکی ہو چکی تھی۔ نظروں کا جواب نظروں سے اور مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتی۔

یوں تو اس کے کئی ''ہیرو'' تھے لیکن نکڑ والا کالا نوید تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گیا تھا۔ وہ اسکول جاتی یا ٹیوشن وہ ہمیشہ کونے پر ہی ملتا اور آصفہ کو دیکھتے ہی دانتوں کی نمائش ضروری سمجھتا۔ شروع میں آصفہ نے اتنا نوٹس نہیں لیا۔ وہ تو ایک دن اس کی سہیلی زرینہ نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کروائی۔

زرینہ آصفہ کے پڑوس میں رہتی تھی اور وہ دونوں ساتھ اسکول اور ٹیوشن آتی جاتی تھیں۔ اسی لیے زرینہ کی تیز نظروں سے نوید کی چھچھوری نظریں چھپی نہ رہ سکیں۔ اس نے آصفہ سے کہا۔

''تُو نے کچھ نوٹ کیا ہے؟''

''کیا؟'' آصفہ نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے ایک عاشق میں اضافہ ہوگیا ہے۔'' زرینہ نے چھچھورے انداز میں کہا۔

''اچھا تجھے سب معلوم ہے کون ہے وہ؟'' آصفہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''سامنے دیکھ۔'' زرینہ نے کہا تو آصفہ نے سامنے نظریں اٹھائیں۔ نوید اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی نوید نے آج دانتوں کی نمائش کے ساتھ ساتھ سلام بھی جھاڑ دیا۔ اپنے ''حسن'' کی اتنی پذیرائی پر آصفہ کا دل باغ باغ ہوگیا اور وہ مسکراتی ہوئی نظریں جھکا کر اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ پیچھے سے نوید کی 'ہائے' بھی سننے کو ملی۔

اگلے دن آصفہ کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوید کچھ اور شیر ہوگیا۔ اس نے آصفہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا کاغذ تھما دیا۔ آصفہ کا دل اچھل کے حلق میں آگیا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا کاغذ کا یہ پرزہ زرینہ کی تیز نظروں سے نہ چھپا رہ سکا۔ زرینہ نے آصفہ کے لرزتے ہاتھوں سے وہ خط جھپٹ لیا اور بولی۔

''ٹیوشن جانے سے پہلے میرے گھر آجانا وہیں مل کر دیکھیں گے اس خط کو۔'' اور یہ کہہ کر جھپاک سے اپنے گھر میں گھس گئی اور آصفہ اپنے گھر آگئی ٹیوشن چار بجے جانا ہوتا تھا لیکن آصفہ سے وقت ہی نہیں کٹ رہا تھا جیسے تیسے ساڑھے تین بجے اور آصفہ نے بیگ سنبھالا اماں نے جلدی جانے کا سبب پوچھا تو کہا کہ آج کام بہت ہے۔ جلدی جانا ہے۔ اماں چپ ہوگئیں اور آصفہ روانہ ہوگئی۔

زرینہ اس کی منتظر تھی۔ جلدی سے ہاتھ پکڑ کر پیچھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

والے کمرے میں لے گئی اور خط اسے تھما دیا۔ آصفہ نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا انتہائی غلیظ اردو لکھی ہوئی تھی کیونکہ نوید نے بھی مڈل نجانے کیسے پڑھا تھا۔ اس تھوڑی سی تعلیم سے اس نے شعور کے بجائے عاشقی معشوقی کے گر ہی سیکھے تھے۔ لکھا تھا۔

''پیاری آصفہ جب سے تمہیں دیکھا ہے میں تو تمہارا دیوانہ ہوگیا ہوں دل و جان سے تم پر فدا ہوں دیکھو میرا دل نہ توڑنا مجھے ہاں میں ہی جواب دینا ورنہ میں مرجاؤں گا۔'' تمہارا نوید۔

یہ پڑھنے کی دیر تھی کہ آصفہ صاحبہ بھی کالے نوید کو دل دے بیٹھیں یہ سوچے بغیر کہ نوید نکما نکھٹو ہے۔ سارے دن نکڑ پر بیٹھ کر آتی جاتی لڑکیوں کو چھیڑتا ہے۔ اب یہ الگ بات کہ آصفہ فوراً اس کے دام میں آگئی اور زرینہ سے بولی۔

''ہائے اللہ! اب میں کیا کروں! کیا جواب دوں اسے؟'' زرینہ میں کون سی عقل تھی جو اچھا مشورہ دیتی بولی۔

''کرنا کیا ہے جواب دے دو اس بے چارے کو۔ تُو نے دیکھا نہیں کیسے وہ تیرا دیوانہ ہوگیا ہے۔ تیرے انکار پر کہیں مر مرا ہی نہ جائے۔ ہائے سچے پیار کرنے والے نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں۔ تُو بڑی خوش قسمت ہے۔'' زرینہ کی باتوں نے آصفہ کو آسمانوں کی سیر کروادی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی پارک میں اور کبھی باہر ملاقاتیں ہونے لگیں۔

نوید تو تھا ہی ہوس کا مارا وہ آصفہ سے بھی یہ ہی چاہتا تھا اور اس نے اس معاملے میں ذرا دیر نہیں لگائی کیونکہ لڑکی جب اپنی عزت خود داؤ پر لگانے کو تلی ہو تو سامنے ہر کوئی شکاری ہوتا ہے۔ آصفہ نے بھی نہ اپنی عزت و حرمت کا پاس کیا نہ ہی ماں باپ اور بہن بھائی کا۔ وہ تو بس اپنے نفس کا کہا مانتی چلی گئی اور نوید کی ہر بات پیار کے جھانسے میں مانتی چلی گئی لیکن جب ان ملاقاتوں نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس نے نوید سے شادی کا مطالبہ کر دیا لیکن نوید شادی کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس کے پاس تھا ہی کیا جس کی بنیاد پر وہ شادی کرتا اور خالی ہاتھ پیروں پر وہ اگر اپنے گھر میں شادی کی بات کرتا تو اس کے بڑے دو بھائی اسے مار کر گھر سے نکال دیتے اس نے کہا۔

''میں تم سے ابھی شادی تو نہیں کرسکتا ہاں لیکن ہم گھر سے بھاگ کر شادی کر سکتے ہیں۔ میرے گھر والوں نے اگر تمہیں رکھ لیا تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ انتظام کرلیں گے۔'' آصفہ کے پاس اور کوئی راستہ نہیں بچا تھا سوائے اس کی بات ماننے کے کیونکہ ساری کشتیاں تو اس نے اپنے ہاتھ سے جلائی تھیں۔ زرینہ سے مشورہ کیا تو اس نے بھی اسے بھاگنے کا مشورہ دیا اور اگلے ہی دن اس نے اس پر عمل کر ڈالا اور اسکول سے نوید کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا اور آنکھوں دیکھی مکھی نگل لی۔

کورٹ میرج کر کے وہ شام تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ نوید دوست کی بائیک لایا تھا۔ اب وہ اپنے گھر جانے کی ہمت کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر پر اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ بہرحال گھر تو جانا تھا سو آصفہ کو لے کر گھر چل پڑا۔ گھر جا کر ایک نیا طوفان ان دونوں کا منتظر تھا۔ پہلے اماں ابا نے بے بھاؤ کی سنائیں پھر بڑے بھائی کام سے لوٹ آئے اور انہوں نے یہ سب صورتحال دیکھی تو نوید کو چپلوں سے خوب مارا۔ آصفہ چپ چاپ کانپتی رہی اسے بھی مغلظات سننے کو ملیں۔

بالآخر نوید کی منت سماجت پر اور کام کرنے کی شرط پر اسے اور آصفہ کو گھر میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ گھر کیا تھا دو کمروں اور اسٹور پر مشتمل کوٹھری تھی۔ ظاہر ہے اسٹور میں ہی نوید اور اس کا ٹھکانہ بن گیا۔ گھر والوں کو مفت کی ملازمہ مل گئی تھی اور ان کے نکھٹو بیٹے کی مفت میں شادی بھی ہوگئی تھی اور کیا چاہیے تھا۔

رات تک آصفہ کی اماں کو بھی خبر ہوگئی وہ بھی آگئیں اور آصفہ کو لعن طعن کی اور مارا بھی لیکن آصفہ چپ چاپ سنتی رہی مار بھی کھائی اور سب کے طعنے بھی سنے کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ اس نے کانٹوں بھری راہ کا انتخاب کیا ہے۔ اب اسے یہ سب سہنا ہے ساری زندگی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوسری حکایت

اُدھوری محبت

شازمہ خان

محبت میں بے ایمانی کرنے والے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے، اِک حکایتِ خاص

رشنا نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں سہمی ہوئی اس کی باتوں پر سوچتی قدم بڑھا رہی تھی۔ کالج کی کینٹین کے باہر لان میں بڑی کرسیوں سے دور ہٹ کر وہ گھاس پر آلتی پالتی مارتے بیٹھ گئی اور مجھے بھی اس نے بیٹھنے کا کہا میں تھوڑے فاصلہ پر اس کے سامنے بھیگی بلی بنی بیٹھ گئی۔ ''ہاں تو آپ بتانا پسند فرمائیں گی آپ نے صائم سے فون پر کیا بات کی تھی؟''

''بخدا رشنا میں نے ان سے کوئی فالتو بات نہیں کی بس میتھ کے نوٹس پوچھے تھے!''

''نوٹس تو فوٹو سٹیٹ والی شاپ سے بھی تو مل سکتے تھے نا؟''

''ہاں پوچھا تھا مگر ملے نہیں میرا خیال تھا کہ صائم کے پاس فالتو پڑے ہوں گے۔''

''تو پھر مجھ سے پوچھ لیے ہوتے آخر صائم سے ہی کیوں؟'' میں اُس کے لہجہ کی کاٹ محسوس کر کے پریشان ہو گئی شاید وہ کچھ اور بولتی سامنے سے صائم آتا دکھائی دیا تو رشنا یکدم خوش گوار موڈ میں چہکی۔ ''لو صائم آ گئے میں چلتی ہوں۔'' وہ اُٹھی اور صائم کا ہاتھ تھامتے آگے بڑھ گئی۔

وہ دونوں میری آنکھوں کے سامنے چلتے ہوئے کینٹین کی روش پر گھوم گئے۔ مجھے اپنے اندر کچھ توڑ پھوڑ سی محسوس ہوئی۔ میں کچھ دیر تک دونوں کے پلٹنے کا انتظار کرتی رہی اور آخر کار گھر جانے کے لیے وہاں سے اُٹھ گئی۔ تمام راستے صائم میرے اعصاب پر سوار رہا میں بہت کوشش کرتی کہ اس کے بے جا خیالات کو ذہن سے جھٹک دوں مگر بے سود جتنا اس کو ذہن سے پرے کرتی وہ اتنا ہی مجھے اپنے بس میں کرتا جاتا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔

''سامیہ؟'' عائشہ کی زوردار آواز پر میں بری طرح چونکی۔ گھر میں عائشہ کی کافی دھاک تھی چھوٹی ہونے کے ناتے وہ سب کا پیار دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا؟

''جی آپ کھانا کھائیں گی؟ کیونکہ آپ کو آپ کی مرضی کے خلاف ڈسٹرب کرنا بھی تو گناہ ہے نا۔'' عائشہ نے ناک سکیڑتے میری طرف دیکھا۔ میں ناچاہتے بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ ''جی چھوٹی آپی آج میرا روزہ نہیں اور نہ ہی میں ڈائیٹنگ پر ہوں۔'' میں نے عائشہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں دیکھتے پیار سے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کھانا کھانے کے لیے آ جائیں۔'' عائشہ کہہ کر چلی گئی۔ میرے جذبات میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میں فوراً اُٹھی اور رشنا کو کال کی۔ میری نگاہوں کے سامنے صائم رشنا کو ایک ساتھ جاتے دیکھنا بھول نہیں پا رہا تھا۔ رشنا نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ میری تنہائی بھی میرا ساتھ چھوڑ رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھی۔ یہ رات کیسے گزرے گی؟ میں کیوں ان دونوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں؟ کیوں صائم میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے؟

☆.....☆

اگلے روز جب میں کالج گئی میرے آنے سے پہلے ہی رشنا موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی رشنا مسکراتے چہرے کے ساتھ میرے گلے لگ گئی۔

''ساویہ سوری تمہیں کل میرا انتظار کرنا پڑا۔''

''کوئی بات نہیں رشنا۔ تمہیں صائم کے ساتھ کوئی ضروری کام ہوگا اس لیے تم نہیں آپائی ہوگی۔''

''ساویہ میرے لیے کل کا دن کل تھا۔ میرے اور صائم کے درمیان کی دوریاں ختم ہوگئیں۔''

''دوریاں مطلب! رشنا کیا کہہ رہی ہو تم؟'' میں نے حیرت کی نگاہوں سے پوچھا۔

''چلو آؤ ساویہ ہم لان میں جا کر بات کرتے ہیں۔ رشنا نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ہم دونوں لان میں آ کر بیٹھ گئیں۔ رشنا نے کھلتی مسکراہٹ میں مجھ سے کہا۔

''میں اور صائم کل ریسٹورنٹ میں گئے تھے۔ میں تو بہت زیادہ گھبرائی ہوئی تھی صائم نے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا کہ جیسے زندگی بھر کا ساتھ ہو۔ صائم نے آئس کریم کا کہا۔ یار میں تمہیں کیا بتاؤں؟ میں تو خود اتنی حیران ہوں کہ صائم کتنا زیادہ رومینٹک ہے، میں تو اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ صائم نے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے مجھے اپنے قریب کرلیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد صائم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے بنا بالکل ادھورا ہوں۔ صائم میں بھی تمہیں کبھی بھول نہیں سکتی۔''

میرے چہرے پر خاموشی اور دل ہی دل میں بے رخی تھی، کاش کہ رشنا کی جگہ میں ہوتی اور صائم کے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہوتا۔ ''ساویہ کیا ہوا تمہیں کہاں کھو گئیں۔'' رشنا نے چٹکی بھرتے مجھے جھنجھوڑا۔ ''ساویہ، میں صائم سے بہت پیار کرتی ہوں میں نے محسوس کیا ہے جب بھی صائم میرے پاس ہوتا ہے یا میری یادوں میں تو میں خود کو بہت مضبوط تصور کرتی ہوں۔ رشنا نے دھیمے لہجے میں کہا

''رشنا تم بہت لکی ہو کہ تمہیں صائم جیسا دوست ملا ہے۔'' میری کانپتی ہوئی آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی اور رشنا کی باتیں مجھے اندر ہی اندر گھاؤ لگا رہی تھیں۔

''ساویہ، جب تمہیں بھی کسی سے محبت ہوگی نا تب تجھے میرے جذبات محسوس ہوں گے۔ میں رشنا کی بات پر مسکرائی اور خود سے کہا محبت وہ، جو تنہائی کا ساتھ بھی چھین لیتی ہے، بے بسی سے دو موٹے موٹے آنسو میری پلکوں پر لرز کر رہ گئے۔ ''رشنا آج صائم نہیں آیا کیا؟'' میں نے بات گھماتے ہوئے کہا۔

''نہیں ساویہ، اُسے گھر پر کچھ کام تھا اس لیے نہیں آیا۔ صائم نے صبح ہی مجھے میسج کر دیا تھا۔''

''آؤ رشنا ٹائم ہو چکا ہے لیکچر کا۔'' میں نے گھڑی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''ہاں چلو چلتے ہیں۔'' رشنا نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ میں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رشنا کلاس روم کی طرف بڑھ گئے ابھی ہم دونوں کلاس روم سے باہر ہی تھیں کہ پیچھے سے اچانک مہران نے رشنا کا بازو پکڑ کر روک لیا۔ ''رشنا رکو میں نے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

''سماویہ تم چلو میں مہران کی بات سن کر آتی ہوں۔'' وہ کہتے مہران کے ساتھ دوسری طرف چلی گئی۔

میں بظاہر کلاس روم میں داخل ہوئی مگر فوراً باہر آ کر راہداری کی طرف چل پڑی۔ وہ دونوں برآمدے کے آخری کونے میں دیوار کی دوسری جانب کھڑے باتیں کر رہے تھے میں گھوم کر دوسری سائیڈ کی طرف آ گئی۔ سیمنٹ کی جالیوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوئی اور ان کی باتیں سننے لگی۔

''صائم تم سے پیار نہیں کرتا وہ تم سے فلرٹ کر رہا ہے۔''

''دیکھو مہران اگر آئندہ تم نے صائم کے بارے میں کچھ بھی کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ صائم اور میں صرف اچھے دوست ہیں اور ہاں میں تمہاری عزت کرتی ہوں اسی پر اکتفا کرو ورنہ آئندہ اس سے بھی جاؤ گے۔''

رشنا مہران کو چھوڑ کر کلاس روم کی طرف گھوم گئی اور چلتی ہوئی کلاس روم میں آ گئی۔ لیکچر کے دوران میں نے رشنا سے کہا۔ ''تمہیں مہران نے کیا کہا تھا؟'' رشنا نے غصیلے انداز سے کہا۔

''یار پلیز تم اس مہران کی بات نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ یار وہ صائم کے بارے میں زہر اگل رہا تھا سالا۔ میں نے جھاڑ دیا اُسے۔'' لیکچر ختم ہونے کے بعد میں نے کہا۔

''رشنا مجھے کچھ کام ہے دیر ہو جائے گی اس لیے تم چلی جاؤ۔''

''ارے یار وہ کون سا کام ہے جس کی پروا تمہیں ہے ہم سے۔''

''رشنا ایسی کوئی بات نہیں بس ذاتی نوعیت کے ہیں۔ ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔'' کہتے وہ آگے بڑھ گئی میں رشنا کو گیٹ کے باہر تک جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی۔ میں لان کی جانب بڑھی۔ مہران لان میں بیٹھا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں مہران کی جانب بڑھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، مہران نے گھوم کر میری جانب دیکھا۔ ''سماویہ تم!'' مہران نے فوراً اُٹھ کر پوچھا۔ ''کیا تمہیں رشنا نے بھیجا ہے؟''

''ارے نہیں وہ تو تمہارا نام سننا پسند نہیں کرتی وہ بھلا کیوں بھیجے گی۔ مہران میں تمہارے احساسات سمجھ سکتی ہوں۔ رشنا کے سلسلہ میں میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ ہمیں کچھ ایسا کرنا ہوگا جس سے رشنا تمہیں مل جائے۔'' مہران فون بند کر کے میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''صائم ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا۔'' مہران نے دھیمی آواز میں جواباً کہا۔ کیوں نہیں ہوگا۔

''جب صائم کسی دوسری لڑکی کی بانہوں میں ہوگا تو رشنا کو بھول جائے گا۔'' میں نے اپنے دل کا درد چھپاتے اسے اُکسایا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے مگر لڑکی آئے گی کہاں سے؟ کاش کہ ایسا ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو میں صائم کو مار ڈالوں گا۔ میں اسے رشنا کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔'' مہران نے غصہ سے کہا۔ ''اچھا میں چلتی ہوں۔ اس کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔'' کہتے میں اسے چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ ابھی میں گیٹ سے تھوڑی دور ہی تھی کہ پیچھے سے صائم کی آواز سنائی دی۔ ''سماویہ، اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ رشنا تمہارے ساتھ نہیں ہے؟'' میں نے صائم کی طرف گھوم کر دیکھا اور میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''صائم وہ تو چلی گئی ہے مہران کے ساتھ۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں میرے سامنے اس کے موٹر سائیکل پر گئی ہے!'' میں نے اپنے جھوٹ کا تاثر اس کے چہرے پر دیکھا جہاں بے پناہ پریشانی کی جھلک نمایاں تھی۔ ''آؤ! سماویہ، میں تمہیں گھر تک چھوڑ دیتا ہوں؟'' میں فوراً اُچک کر اس کے پیچھے بیٹھ گئی میرا بازو بے اختیار اس کی کمر کے گرد حائل ہو گیا۔ اس کے جسم کے لمس نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ میرا سر اس کے کندھے پر تھا وہ پل بھر جاتے اور میں اسے اپنی روح میں سمیٹ لیتی مگر افسوس وقت تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس نے گلی کی نکڑ پر مجھے چھوڑتے ایک بار پھر پوچھا کہ رشنا آپ کو کچھ بتا کر نہیں گئی۔''

''کہہ رہی تھی کہ مہران کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں دونوں کے تعلق کا پتہ ہے۔'' میں نے پھر اسے اُکسایا۔ ''کیا آج تک وہ مجھے الو بنائی آ رہی ہے۔'' اس نے ماتھے پر بل ڈالتے کہا۔ ''صائم وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پلیز اس سے نہ کہنا کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتایا ہے۔'' میں نے پریشانی کی ایکٹنگ کرتے اسے پکا کیا۔

''نہیں سماویہ، تم فکر نہ کرو۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے جواباً کہا۔ میں مصنوعی شرماہٹ میں ڈوب گئی۔

''میں آپ کو فون کر سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں جی!'' میرے جذبات میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے میرے اندر خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ میں کمرے میں جا کر بیڈ پر اوندھی لیٹ گئی مسکراہٹ میرے چہرے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پھیلی ہوئی تھی۔ محبت بھی کیا جادو ہے کل رلایا اور آج ہنسایا۔ بیڈ سے اُٹھ کر میں نے فوراً مہران کو کال کی۔

''ہیلو'' مہران ''ہائے'' سماویہ!''

''مہران، میں نے تمہیں اس لیے کال کی ہے کہ تم رشنا کے اور قریب جاؤ۔ آج صائم نے مجھے گھر تک ڈراپ کیا تھا۔ میں نے اس کے دل میں رشنا کے لیے شک پیدا کر دیا ہے۔ اگر محبت سچی ہوئی تو وہ رشنا کو ملے گا نہیں تو.....''

''سماویہ، اب ہمیں رشنا کی طرف سے بھی یہی کرنا ہوگا۔ دونوں بیک وقت ہی ایک دوسرے کو چھوڑیں۔ جو ہم سب کے لیے بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے مہران تم رشنا سے بات کرو اور اُسے یقین دلاؤ کہ وہ صرف تمہارے لیے ہی بنی ہے صائم صرف تمہیں وقتی طور پر محسوس کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''سماویہ شکریہ اگر تم نہ ہوتیں تو مجھے اُمید کی کرن نظر نہ آتی۔''

''کوئی بات نہیں'' مہران! مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے تم رشنا سے سچا پیار کرتے ہو!'' ٹھینک یو'' اب کل بات کریں گے کہتے میں نے بات ختم کر دی۔ اب یہ وقت میں اکیلے گزارنا چاہتی تھی رات کروٹیں بدل کر گزاری۔ اگلے روز میرے کالج آنے سے پہلے ہی رشنا اور صائم باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُن کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی گفتگو محض لڑائی والی گفتگو تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے۔ میں لان میں بیٹھی تھی کہ رشنا میرے پاس آگئی، رشنا اتنے غصے میں تھی میری تو جان ہی نکل گئی جب اس نے میرا نام پکارا سماویہ، ارے رشنا کیا ہوا؟ بہت غصے میں ہو! رشنا کی آنکھوں سے آنسو نکلنا شروع ہوگئے۔ صائم نے مجھ سے کہا کہ میں سب کچھ بھلا دوں جو کچھ ہم دونوں کے بیچ ہوا وہ محض ایک غلطی فہمی تھی۔ اب ہمیں اپنے راستے الگ الگ کرنے ہوں گے۔ اس کے منہ سے یہ بات سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھی تھی۔ میری مراد پوری ہو رہی تھی۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ جو کل تک اپنا لائف پارٹنر بنانے کا وعدہ کرتا رہا وہ آج چھوڑنے اور بھولنے کی باتیں کر رہا ہے۔'' وہ بے اختیار رونے لگی، رشنا چپ ہو جاؤ۔ میں بات کروں گی اس سے۔ رشنا پلیز۔'' میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد رشنا اُٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اسے گیٹ کے باہر تک جاتے ہوئے دیکھا۔

☆.....☆

صائم فون پر گھنٹوں مجھ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ میں نے اسے رشنا کے خلاف کافی بھر دیا تھا۔ میں لائبریری میں تھی کہ صائم میرے پاس آیا اور مجھے لے کر کینٹین آ گیا۔ بیٹھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''سوری سماویہ میں تمہیں نظر انداز کرتا رہا۔''

''صائم صاحب کوئی بات نہیں۔'' میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے چائے کا کپ پکڑ لیا۔

رشنا نے کالج سے ہفتہ بھر کی چھٹیاں لے لیں تھیں۔ اس دوران میں نے صائم کو کافی حد تک اپنے بس میں کر لیا تھا میں اور صائم لان میں بیٹھے تھے کہ رشنا آ کر ہم پر نظر پڑتے ہی پیر پٹختی آگے بڑھ گئی۔

مہران جو کچھ دور موجود تھا میرا اشارہ پا کر وہ اُٹھا اور رشنا کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے صائم کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر اسی طرف چل پڑی جدھر مہران گیا تھا۔ رشنا کا من روم میں کھڑی تھی اور مہران اس کے قریب دونوں کے منہ دوسری جانب تھے۔ ہم تھوڑا پیچھے آ کر رک گئے تھے تا کہ ان کی باتیں سن سکیں۔ ''مہران مجھے صائم پر کوئی گلہ نہیں۔ میں اسے سمجھ ہی نہیں سکی۔'' اس سے آگے میں نے صائم کو کچھ سننے نہ دیا اور لے کر آگے بڑھ گئی۔ میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ رشنا اور صائم دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو گئے تھے یہی میرا پلان تھا اور میں اس میں کامیاب جا رہی تھی۔ صائم میرے پیار میں بری طرح گھائل ہو رہا تھا اور میں جان بوجھ کر اسے اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ وہ جتنا بے چین ہوتا میں اسے اتنا ہی نا اُمید کرتی۔ پہلے رشنا مجھے تڑپاتی تھی اب میں صائم کی توجہ پا کر شیر بن گئی تھی۔

رشنا کے اور میرے درمیان بول چال بند ہو گئی۔ ہر جگہ ہم دونوں ایک ساتھ ہوتے۔ صائم نے اپنی والدہ اور بہن کو ہمارے گھر بھیج دیا۔ ہمارے رشتے پر دونوں گھروں کو کوئی اعتراض نہ تھا دونوں طرف سے بات پکی ہو گئی منگنی کے فوراً بعد شادی کی تاریخ طے پا گئی اِدھر مہران اور رشنا ایک دوسرے کے لیے لازم بن چکے تھے۔ میری زندگی سے رشنا تو چلی گئی مگر صائم میرا ہو کر بھی میرا نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں مگر ادھورا جسے میں ہی محسوس کر سکتی ہوں جب بھی مجھے اپنا کریکٹر دکھائی پڑتا ہے تو میں تڑپ اُٹھتی ہوں میں نے اپنا پیار پانے کے لیے دو دلوں کے درمیان دیوار اُٹھا دی۔ میری کامیابی میں رشنا کے جذبات کا خون شامل ہے۔ جو مجھے اور میرے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جانے مجھے صائم کا پیار ادھورا کیوں لگنے لگتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیسری حکایت

ستم در ستم

مہوش مہر

کچھ لوگوں کے نصیب میں صرف ستم ہی ستم درج ہوتے ہیں

رضوانہ آنٹی پچھلے چار سال سے اپنی بیٹی عارفانہ کے گھر رہ رہی تھیں۔ عارفانہ باجی کا گھر ہمارے گھر کے سامنے تھا۔ ان کے شوہر سرفراز کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا۔ وہ صبح جاتے اور رات کو واپسی ہوتی تھی۔ ان کے پانچ بچے تھے۔

ایک دن عارفانہ باجی نے اپنے گھر میلاد کی محفل کروائی۔ میں بھی گئی اور وہاں ان کی والدہ کے پاس بیٹھ گئی۔ ویسے بھی میں اکثر ان کے گھر جاتی تو رضوانہ آنٹی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی تھی۔ آج بھی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ میلاد کے اختتام پر جب سب لوگ دعا مانگ رہے تھے تو رضوانہ آنٹی دعا کے دوران ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اداس تو وہ اکثر رہتی ہی تھیں مگر آج ان کے آنسو تھے کہ رک نہیں رہے تھے۔

جب کھانے کے بعد سب مہمان رخصت ہو گئے تو میں ان کے پاس آ گئی اور ہمت کر کے ان کی اداسی کی وجہ پوچھی جو میں کافی دنوں سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج جاننے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ میں نے تھوڑی دیر یہاں وہاں کی باتوں کے بعد ان سے ان کی اداسی کے بارے میں دریافت کیا تو ایسے لگا جیسے وہ اسی سوال کے انتظار میں تھیں کہ کسی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیں۔ انہوں نے کچھ دیر رک کر اپنی داستان سنانی شروع کی۔

☆.....☆

میری شادی میرے چچا کے بیٹے عابد حسین سے ہوئی تھی۔ میں گاؤں سے رخصت ہو کر شہر آ گئی۔ ہم بہت خوش حال تھے۔ تعلیم میری زیادہ نہ تھی مگر مدرسے کی تعلیم بچپن ہی سے حاصل کی تھی اور اکثر مدرسے میں جایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد مجھے پتا چلا کہ میرے شوہر نہایت عیاش انسان ہیں۔ شراب و کباب کے رسیا ہیں۔ میں یہ جان کر بہت دکھی ہوئی مگر خاموش رہی کیونکہ ہمارے ہاں بیٹیوں کو رخصتی کے وقت کہہ دیا جاتا ہے کہ اب مر کر ہی سسرال سے نکلنا۔ میں صبر سے سب برداشت کرتی رہی۔

ایک دن مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کا کاروبار درحقیقت سود کا لین دین ہے۔ وہ بھی اس طرح معلوم ہوا کیونکہ گھر میں آئے دن کوئی نہ کوئی پیسے لینے آتا اگر کوئی پیسا لوٹانے میں تاخیر کرتا تو میرے شوہر اپنے چند آدمیوں کے ذریعے انہیں پکڑوا کر خوب مارتے۔ میں یہ سب دیکھتی مگر ایک دن میرا ضبط ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنے شوہر کو سمجھایا کہ آپ یہ کاروبار چھوڑ دیں اور یہ ظلم نہ کریں۔ سود اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔''

میری بات سن کر وہ طیش میں آ گئے اور مجھے خوب مارا۔ یہاں تک کہ میں لہولہان ہو گئی۔ اس کے بعد میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے کچھ نہیں کہا بس کڑھتی رہی، پھر میرے گھر انسان کی پیدائش ہوئی۔ میں اس کی پرورش میں لگ گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے تین بچے عارفانہ، نغمانہ اور ریحان ہوئے۔ بچے بڑے ہوتے گئے مگر شوہر نہ بدلے بلکہ ستم یہ ہوا کہ دونوں لڑکے بھی باپ کی روش پر چلنے لگے۔ عیاشی ان کی گھٹی میں تھی۔ میں بیٹوں کو سمجھاتی مگر وہ بھی اکھڑ پنے سے جواب دیتے۔ ارمان نے اپنی پسند سے شادی کی پھر میرا نے عارفانہ کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے سرفراز سے کردی۔ نغمانہ نے ضد کرکے کالج میں داخلہ لے لیا۔ مجھے اس کے انداز بڑاڈراتے تھے۔ دن رات موبائل پر لگی رہتی اور الٹے سیدھے فیشن کرتی۔

ایک دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ کالج سے بھاگ گئی۔ یہ الزام بھی میرے شوہر نے میرے سر تھوپ دیا کیونکہ میں نے اسے پڑھانے کی اجازت لی تھی۔ مجھے بے تحاشا مار پیٹا، وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ دونوں بیٹے اپنی عیاشیوں میں مست تھے مگر چھوٹا بہت بگڑ گیا تھا۔ اس کے دوست بہت برے تھے۔ ان کے لچھن دیکھ کر روزانہ باپ بیٹے لڑتے تھے۔ وہ جس طرح پیسا اڑا رہا تھا اسے دیکھ کر اسے بے راہ رو ہونے کا اندازہ کوئی بھی کرسکتا تھا۔ اس کے دوست اسے خوب لوٹتے، وہ نشے میں مست سب اڑاتا گیا۔

☆.....☆

ایک رات نہ جانے کس نے فیکٹری میں آگ لگوادی، صبح تک فیکٹری آگ کا ڈھیر بن گئی۔ میرے شوہر کے حواس گم ہوگئے۔ چھوٹے کی عیاشیاں پھر بھی جاری تھیں یہ دیکھ کر شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا اور بچے کھچے کو سنبھالنے لگے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ جو بینک بیلنس تھا وہ آدھا تو چھوٹا اڑا گیا تھا اور باقی بڑے بیٹے نے اپنے نام کروالیا تھا۔ اب میرے شوہر کو دھچکا لگا۔ یہی نہیں پھر کاروبار شروع کرنے کے لیے بنگلا گروی رکھنا پڑا مگر کاروبار نہ اٹھ سکا اور بنگلا بھی ہاتھ سے گیا۔ پھر باقی بچے کھچے سے چھوٹا مکان خرید لیا اور ہم میاں بیوی وہاں شفٹ ہوگئے کیونکہ بڑے بیٹے نے ہمیں اپنے پاس رکھنے سے انکار کردیا تھا۔ وہ خود پوش علاقے میں رہ رہا تھا۔

میرے شوہر اس صدمے کی وجہ سے بیمار پڑ گئے۔ بڑی بیٹی ہماری مدد کرتی رہی۔

ایک دن میرے چھوٹے بیٹے ریحان کی لاش گھر آگئی جسے ڈکیتی کے دوران پکڑے جانے پر پولیس نے گولی ماردی تھی۔ اپنا مال تو وہ لٹا چکا تھا آخر ڈکیتی کرنی پڑی۔ یہ صدمہ میرے شوہر کے لیے جان لیوا ثابت ہوا اور چند دن بعد وہ گزر گئے۔ نغمانہ کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ مجھ سے ملنے آئی۔ اس کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ اس کا شوہر جس کی خاطر وہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھی بہت ظالم تھا مگر اسے گزارہ کرنا تھا، میں نے اسے معاف کردیا، اس لیے کہ وہ دکھی تھی وہ اکثر مجھ سے ملنے آجایا کرتی تھی لیکن میں تنہا تھی۔

ایک دن عارفانہ نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا تو مجھے سکون ملا۔ وہ مکان میں نے کرائے پر چڑھا دیا اور یہاں آگئی۔ آج جو تم نے میرا رونا دیکھا بیٹی یہ اسی حالت کا رونا تھا۔ بیٹی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں وہ کبھی سکھی نہیں رہ سکتے۔ کاش میرے شوہر یہ سمجھ سکتے تو آج یوں میرا آشیانہ نہ بکھرتا۔"

یہ کہہ کر آنٹی پھر سے رونے لگیں۔ میں انہیں تسلی دے کر اٹھ گئی اور یہی سوچتی رہی کہ انسان کتنا ظالم ہے، وقتی آسائشوں کی کا طرا اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہے۔ اپنے رسول کی تعلیمات کو بھلا دیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ یہ سب دیکھ رہا ہے اور اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

چوتھی کہانی

اور قلم ٹوٹ گیا

سیما عروج صدیقی

ایک ایسی مصنفہ کی مختصر داستانِ قلم، جس کا قلم اِک دن اپنی موت آپ مر گیا اور.....

رات کا تیسرا پہر تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز لکھنے میں مصروف تھی۔ اس کا قلم جہازی رفتار سے چل رہا تھا۔ آخری جملہ لکھتے ہی اس نے قلم چھوڑ دیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر لمبا سانس لیا۔ پھر لفافہ نکالا اور لکھے ہوئے صفحات کو بند کر کے ایڈریس لکھا اور پھر لائٹ بند کر کے سونے لیٹ گئی۔ اسے کہانی لکھ کر بے حد سکون ملا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی لمحہ بھر کو ایک خیال سا کوندتا اور وہ آدھے گھنٹے سے کم وقت میں ہی ایک افسانہ لکھ ڈالتی۔ حیرت تو جب ہوتی جب اس کے نام سے اخبار میں سب سے اوپر اس کی کہانی یا افسانہ چھپتا۔ اسے خود یقین نہ آتا کہ وہ اتنا اچھا لکھ لیتی ہے۔

یقین تو اسے تب آیا جب کئی رسائل اور اور جرائد میں اس کی کہانیاں، آپ بیتیاں، افسانے، مزاحیہ آرٹیکل دھڑا دھڑ چھپنے لگے اور وہ غائبانہ طور پر ایک لکھاری کے طور پر پڑھنے والوں کی نظروں میں آنے لگی۔

اب وہ اعتماد سے مقابلہ نویسی، افسانہ نویسی میں بھی حصہ لیا کرتی اور اکثر جیت جاتی۔ ابھی تک وہ ایک ایسا ہیرا تھی جو تراشا نہ گیا تھا۔ ایک ایسی خودرو جھاڑی جو خود بخود پروان چڑھ رہی تھی اور ایک ایسی مرغی جس کی حیثیت گھر میں دال برابر ہوتی ہے۔ ہاں وہ ایسی ہی تھی اس کی گھر بھر میں حیثیت ہی کیا تھی ایک بیٹی جسے دوسرے گھر جانا ہے۔ ایک ایسی بہن جو خدمت گزاری کے لیے تھی اور ایک ایسی بے زبان ہستی جس کی رائے جذبات کی کبھی کسی نے قدر نہ کی تھی۔ اس کی یہ ناقدری ہی تھی جس نے اس کے اندر ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جسے بھرنے کے لیے اس نے قلم کا سہارا لے لیا تھا۔ وہ لکھتی تو لکھتی ہی چلی جاتی۔ اسے اپنے قلم سے عشق ہو چلا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس گھٹن زدہ فرسودہ ماحول سے صرف اس کا قلم ہی اسے نکال سکتا ہے۔ اسے لگتا تھا اس کے قلم میں اتنی طاقت ہے کہ اسے ایک اچھا جیون ساتھی بھی دلا سکتا ہے کیونکہ جوں جوں اس کی نگارشات چھپ رہی تھیں خاندان بھر میں اس کو فخر سے پہچانا جانے لگا تھا۔ گھر والے چونکہ اس وقت جب ایک رسالے نے اس کا انٹرویو نو آموز رائٹر کے طور پر شائع کیا، پہلی بار اس نے امی کو بغور دلچسپی اور خوشی سے اس کا انٹرویو پڑھتے دیکھا۔ بڑے بھیا نے بھی تعریفی خط ارسال کیا کہ وہ بیرون ملک مقیم تھے اور انہوں نے بھی اس کی تصویر اور انٹرویو پڑھا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ”میں تمہارا افسانہ پڑھتے ہوئے کھو گیا تھا۔ میرے پاس بیٹھے دوست نے کہا یار اتنی غور سے کیا پڑھ رہے ہو جب میں نے بتایا یہ میری بہن ہے تو وہ بڑا حیران ہوا اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم اتنا اچھا لکھتی ہو۔“

اسے پہلی بار امی اور بھیا کے رویے سے امید ہوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

کہ شاید اب اس پر اس کی صلاحیت دیکھتے ہوئے میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی راہ نکل آئے۔ اسے اپنے قلم سے مزید پیار ہوگیا۔ وہ ہر سوچ، ہر خیال کو اس خوب صورتی سے لفظوں میں ڈھالتی کہ دلوں پر اثر کیے بنا نہ رہتے۔ اسے مختلف ادبی محافل سے دعوت نامے موصول ہونے لگے مگر اسے گھر سے اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی ادبی محفل میں شرکت کرے۔ اسے اس کی بھی اجازت نہ ملی کہ وہ کسی رسالے کی ممبر شپ بھی قبول کرے۔ لہٰذا ہر ترقی کی راہ جو اس کے قلم نے استوار کی تھی، اس کے اپنوں نے اس کو اپنی تنگ نظری کی نذر کردیا۔ ان کے خیال میں اعلیٰ تعلیم صرف لڑکوں کا حق تھا۔ لڑکیوں کو بہر حال چولہا جھونکنا ہوتا ہے۔ پڑھ لکھ کر کیا تیر ماریں گی۔

اس کے افسانے لہو رنگ ہونے لگے اس کی محرومیاں ان میں جھلکنے لگیں۔ اس کی خواہشیں دفن ہونے لگیں۔ وہ مرنے لگی۔ وہ سسکنے لگی تبھی قلم نے اسے پھر حوصلہ دیا۔

نہیں لکھو شاید یہ قلم اس کو اس تعفن زدہ ماحول سے نکال لے۔ ممکن ہے کوئی اس جیسا منفرد خیالات رکھنے والا شخص اسے اس کے قلم اور اس کے خیالات کو تھام لے وہ ایک انوکھے خیال سے دوبارہ حوصلہ پا کر لکھتی گئی، لکھتی گئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے ایک بھائی نے گھر میں اس کے انٹرویو اور تصویر پر بہت واویلا مچایا تھا۔ اس کے خیال میں اس کی غیرت کا جنازہ نکالنے کے لیے کافی تھا۔ باقی لوگ جسے عزت افزائی سمجھتے تھے۔ وہ اسے شرمندگی خیال کرتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ خاندان کے کسی بڑھئی کسی درزی یا کسی ان پڑھ کو اس کا نصیب بنانے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں کہ کہیں پڑھ لکھ کر یہ لڑکی واقعی خاندان کی عزت کو چار چاند نہ لگا دے۔ اس قدر پابندیوں میں تو اس نے اتنی عزت پالی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ اسے اس کی ناپسندیدگی جانتے ہوئے بھی شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی گھر کے سارے پڑھے لکھے لوگوں نے یہ فیصلہ اس پر مسلط کر دیا کہ باقی کی آئندہ زندگی اسے ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارنی ہے جس کے خیالات، افکار مزاج کچھ بھی تو اس جیسا نہ تھا۔ اس روز وہ بہت ہنسی تھی۔ اس روز اسے احساس ہوا کہ وہ رائٹر ہی نہیں بہترین ایکٹر بھی ہے۔ اس نے خود کو مسکراتے ہوئے مجبوراً سب کی انا اور خوشی پر قربان کر دیا تھا۔ اس کے قلم کی آخری کوشش نے بھی اس کا ساتھ اس روز چھوڑ دیا تھا اس روز اس کا پیارا دوست، اس کا ساتھی، اس کا غم گسار اس سے روٹھ گیا۔ اس کا قلم ٹوٹ گیا اور اس کو ٹوٹے ہوئے آج بائیس برس گزر چکے ہیں۔ اس دوران اس کی ردی نما نگارشات جب جب کسی نے پڑھیں اسے دوبارہ لکھنے کی ترغیب دی وہ زخمی ہنسی ہنس دیتی۔ کیوں؟ کس لیے؟ کس کے لیے؟ وہ خود سے سوال کرتی۔

☆......☆

آج اتنے برس بعد میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے قلم کو ایک بار پھر سمیٹا کرچی کرچی سمیٹ کر رات گئے آخری پہر میں اپنے ٹوٹے دل، شکستہ بوسیدہ قلم کی کہانی قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔ بلاشبہ یہ حوصلہ مجھے صرف اور صرف سچی کہانیوں کے اس خوب صورت رسالے نے دیا جو نہ جانے کتنے دکھ سمیٹ کر ہر ماہ چلا آتا ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پانچویں حکایت

کربِ محرومی

نزہت جبیں ضیاء

اُن لوگوں کی داستان، جو ہمیشہ دوسروں کا دکھ درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں

دوسروں کے دکھ پریشانیوں پر نظر ڈالو تب ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا دکھ تکلیف اور پریشانی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ کیسے حالات کا شکار ہیں؟ زندگی ان کے ساتھ کیسے کیسے کھیل، کھیل رہی ہے؟ وہ کتنے مجبور بے بس اور لاچار ہیں، شاید ہم جیسے سفید پوش لوگ ان لوگوں کو اتنے قریب سے دیکھنے یا جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ہم لوگ بس اپنی جائز کمائی اور دال روٹی کے چکر میں اپنی چادر کے حساب سے پیر پھیلانے کی تگ و دو میں رہتے ہیں مگر جب کسی کی تکلیف کو قریب سے دیکھو تب احساس ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے ہم پر اپنا کتنا کرم کیا ہوا ہے۔

الحمدللہ ہم کتنی اچھی اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔ اس بات کا ادراک مجھے پچھلے دنوں ہوا۔ جب ضیاء کی اچانک انجیو پلاسٹی کی گئی اور پھر مجھے ضیاء کے ساتھ انجیو پلاسٹی کے بعد چیک اپ کے لیے دوبارہ ہاسپٹل جانا پڑا اللہ پاک کسی کو بھی اتنی آزمائش میں نہ ڈالے جتنی آزمائش میں ہاسپٹل میں موجود اس عورت پر ڈالی گئی جس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

منگل کا دن تھا۔ ضیاء کو چیک اپ کے بعد تھوڑی سی ایکسر سائز بھی کروائی جانے والی تھی۔ اس لیے ضیاء کارڈیو کے گرلز نرسنگ ہوسٹل کی عمارت میں موجود ایکسر سائز کے روم میں چلے گئے تو میں ان کو روم میں پہنچا کر باہر کی طرف آ گئی۔ موسم خاصا سرد تھا۔ اس وقت چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ میں کیفے کے پاس چلی آئی جہاں ایسے مریضوں کے ساتھ آنے والوں کے لیے ایریا بنایا گیا تھا جو کراچی سے باہر سے آئے ہوئے ہوں۔ میں وہیں گھاس کی سائیڈ پر بنے ہوئے اینٹوں کے احاطے کے پاس کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی۔ تب ہی ایک چھ سات سال کی بچی میرے قریب آ گئی۔ سردی کے اس موسم میں بچی نے صرف فراک پہن رکھی تھی۔ نیچے ڈھیلا ٹراؤزر اور پیروں میں پھٹی ہوئی ربڑ کی چپل تھی۔ سر پر کاٹن کا پھٹا ہوا دوپٹہ لیے وہ غربت کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی۔ اس قدر ٹھنڈا موسم اور وہ بچی مزے سے وہیں ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گئی اور ہاتھ میں پکڑا پاپا کھانے لگی۔ تب ہی ایک چار پانچ سال کا بچہ آیا اور اس کے ہاتھ سے پاپا چھین لیا۔ بچی لپک کر اس کو مارنے دوڑی تب ہی ایک عورت درمیان میں آ گئی اور پاپا لے کر دو ٹکڑے کیے اور دونوں کو پکڑ دیے۔ میں نے بہ غور اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عورت کو دیکھا، کاٹن کا ملگجا پرانا سا سوٹ پہنے سر پر پھٹی ہوئی چنری اور پیروں میں ٹوٹی ہوئی پرانی گھسی ہوئی چپل تھی۔ وہ بمشکل ستائیس، اٹھائیس سال کی ہوگی۔ پچکے گال، اندر کو دھنسی آنکھیں، پپڑی زدہ ہونٹ، الجھے ہوئے بال اور ویران سا چہرہ اس کی غربت، خستہ حالی اور پریشانی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کی پیلی پیلی نقاہت زدہ آنکھوں میں بے بسی نمایاں تھی۔ میں فطرتاً سوفٹ ہیچر ہوں ایسے لوگوں کو دیکھ کر اداس ہو جاتی ہوں۔ ایک لمحے کے اندر مجھے اس سے دلی ہمدردی ہوگئی۔ میں نے بچی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور پچاس کا نوٹ اسے دے کر کہا۔

''جاؤ تم اور پاپے لے آؤ۔''

''نہیں باجی! ہم مانگنے والے نہیں ہیں۔''

عورت نے جھپٹ کر پچاس کا نوٹ بچی کے ہاتھ سے لے کر مجھے لوٹاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔

''ہاں ہاں میں نے تو ایسے ہی دے دیے تھے اپنی بچی سمجھ کر۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے صفائی دی۔

''حالات نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ ہم ایسے نہ تھے باجی!'' اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''تمہارا کون ہے داخل یہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرا خاوند ہے جی۔'' اس کا لہجہ سرائیکی تھا۔

''کیا ہوا اس کو؟'' میں تجسس سے باز نہیں آرہی تھی۔

''کیا بتاؤں باجی!'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''میرا تو بیٹا بھی داخل ہے بچوں والے اسپتال میں۔''

''ہیں، کیا ہوا اس کو؟'' اس کی بات پر میں نے حیرت سے اس کے اداس چہرے کو دیکھا پھر اس نے جو کہانی سنائی مختصراً بیان کر رہی ہوں۔

میرا نام گلشن ہے اندرن پنجاب کے چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں پندرہ سال کی تھی تب میری اماں مرگئی ابا نے میری شادی چالیس سال کے اپنے دوست سے کردی اور خود بھی شادی کرلی۔ میں غریب تھی اس لیے بس نکاح ہوا اور رخصتی ہوگئی۔ میرا شوہر بیمار رہتا تھا اس کے جوان بچے تھے۔ پہلی بیوی بھی تھی۔ وہ لوگ مجھ کو نوکرانی سمجھتے تھے۔ گھر کے سارے کام کرتی اور سب کی جھڑکیاں بھی کھاتی۔ کبھی کبھی سوکن اور میاں کی مار بھی کھانی پڑتی۔ میرا کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بہن بھائی بھی نہ تھا۔ ابا بھی شادی کر کے مجھے بھول گیا مجھے صورت یہیں رہنا تھا۔ پھر میرے بچے بھی ہو گئے۔ بڑا بیٹا ندیم، پھر بیٹی زینب اور اس سے چھوٹا اکرم۔ میرے شوہر کے پہلے سے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ پھر میرا شوہر بیمار رہنے لگا تو مکمل طور پر میرے حصے میں آ گیا اس کو پہلی بار دل کا دورہ پڑا تو بہت مشکل سے جان بچی تو گھر والوں نے اس کا پیچھا پکڑ لیا کہ جو کچھ جائیداد ہے اس کا حصہ کر ڈالو۔ جائیداد کے نام پر ایک گھر ہی تھا۔ بیٹوں نے زور لگا کر اور دھمکیاں دے کر وہ گھر اپنے نام کروا لیا۔ بچے بھی چھوٹے تھے، بس یہ غنیمت تھا کہ اس گھر میں رہنے کو ٹھکانہ تھا اور میرے بچوں کا خرچہ بھی اٹھانے کو میرا میاں تھا۔ بہت کسمپرسی میں زندگی گزارتی تھی۔ پھر میرے میاں کو شدید دل کا دورہ پڑا میں اور میرا ایک سوتیلا بیٹا اس کو لے کر آئے علاج کروایا وہ ٹھیک ہوا تو واپس گاؤں چلے گئے۔ وہاں جا کر میری سوکن اور میرے سوتیلے بیٹوں نے ہمیں گھر سے نکال دیا کہ ہمیں گھر کی ضرورت ہے۔ شادیاں کرنی ہیں، میرے میاں تو چپ ہو گئے نہ جانے کیا ہو گیا ان کو..... میں نے احتجاج کرنا چاہا تو مجھے خوب مار پڑی اور ہم لوگ کرائے کے گھر آ گئے۔ میرا دس سال کا بیٹا غبارے بیچتا ہے، میں گھروں میں کام کرتی ہوں اس طرح ہم گھر چلاتے، پھر میرے شوہر کو تیسرا اٹیک ہوا ایک بار پھر ان کو لے کر آ گئے۔ یہاں رہ کر علاج کرانا آسان نہیں ہے باجی میں نے اپنے رشتے داروں میں گاؤں والوں سے پیسے لے لے کر یہاں تک سب کچھ کیا کہ پتہ چلا کہ میرے بڑے بیٹے کو بھی کوئی پیٹ کا مرض ہو گیا ہے۔ میں نے جو کچھ جمع کیا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ نہ پیسہ ہے نہ سکون۔ یہاں پر بدتر حالت میں دو چھوٹے بچوں کو لے کر پڑی رہتی ہوں۔ سردی میں جان نکل جاتی ہے۔ میرے خاوند کی تو چھٹی ہو جائے گی۔ بیٹا ابھی داخل ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ بیمار خاوند کو لے کر کہاں جاؤں.....؟ کہاں رہوں؟ آگے کیا ہو گا؟ زندگی میں اور کیا دکھ پریشانیاں ہیں.....!

وہ ابھی بات جاری رکھے ہوئے تھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ اللہ پاک کسی کو اتنی آزمائش میں مت ڈال میرے پروردگار میرے دل سے دعا نکلی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا بولوں.....؟ کیسے تسلی دوں؟ تب ہی سامنے سے ضیاء آتے دکھائی دیے..... دوسری جانب سے بیٹا بھی گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ میں نے پرس سے کچھ پیسے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

''دیکھو گلشن میں تم کو چھوٹی بہن سمجھ کر کچھ دے رہی ہوں اور بس دعا کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔''

اپنے آنسوؤں کو بہ مشکل روکنے کی کوشش کرتے ہوئے میں اس کی جانب دیکھے بنا تیزی سے ضیاء کی طرف بڑھ گئی۔ مڑ کر اس کو دیکھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔

دل بہت بہت اداس ہو گیا۔ میں اس کے دکھ پر بہت روئی بھی اور مسلسل اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ بہت لوگوں نے یہ بھی کہا کہ ''تم پاگل ہو..... تمہاری شکل دیکھ کر اس نے تم کو پاگل بنا دیا اور تم اس کی باتوں میں آ گئیں۔ بہت چالاک اور عیار ہوتی ہیں ایسی خواتین۔ یہ سب ڈرامے بازیاں ہیں۔''

''ارے اماں یار! وہ پیسے مجھے دے دیتیں میں سوٹ ہی لے لیتی۔'' یہ میری بیٹی نے کہا۔

واللہ اعلم مگر مجھے اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر اور اس کے لہجے میں کوئی نہ کوئی بات تو لگی کہ میرا دل اتنا اداس ہو گیا۔

اللہ پاک ہم سب کو دکھ پریشانیوں، آفات اور بیماریوں سے محفوظ رکھے کسی کو کسی کا محتاج نہ بنائے۔ ہمیں صرف اور صرف اپنا محتاج بنانا میرے اللہ کہ جب بھی ہاتھ اٹھائیں تو صرف اور صرف تیرے سامنے دست سوال دراز کریں۔ تجھ سے بھی رحم، کرم اور عطا کی بھیک مانگیں تجھ سے ہی خیریت و عافیت طلب کریں۔ تیری رضا کے آگے راضی ہوں اور تیرے آگے ہی سر جھکا کر اپنی جائز حاجات کی قبولیت کے طالب ہوں۔ (آمین ثم آمین)۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

چھٹی حکایت

رب کے چور

مجید احمد جائی

اُن چوروں کی داستان، جن کو رب نے ہدایت کا راستہ دکھا دیا تھا

شدید دھند چھائی ہوئی تھی اور دسمبر عاشق لوگوں کو تڑپا کر رخصت ہونے کو تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتا فیکٹری آیا تو شور برپا تھا۔ ورکرز چہ مگوئیاں کر رہے تھے اور مالک بھی آج جلدی آچکا تھا۔ مالک کا جلدی آنا کسی طوفان آنے کے مترادف تھا۔ ورنہ وہ دن چڑھے ہی فیکٹری داخل ہوتا تھا۔

فیکٹری سے پلانٹ کی بڑی موٹر غائب تھی اور ہر کوئی چہ مگوئیاں کر رہا تھا کہ یہ کام کون کر سکتا ہے۔ یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں ہے۔ ضرور دو تین لوگ ملے ہوں گے لیکن کون ہو سکتا ہے؟ اسی بات نے سبھی کو پریشان کیا ہوا تھا۔

چور اندر ہی تھا یا ان میں ہی موجود تھا۔ جب بھی کہیں چوری ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی اپنی ضرور کارستانی دکھاتا ہے۔ جسے کھوجی حضرات ''گھر کا بھیدی'' کہتے ہیں۔ اب کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا کہ ''میں چور ہوں۔'' ہاں مگر چہرے کے تاثرات ضرور چغلیاں کھا رہے ہوتے ہیں۔

رفیق سوپ فیکٹری پانچ ایکڑ کے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی جس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں چنوائی گئیں تھیں۔ دیواروں کے اوپر خاردار تاروں کا جال بنایا گیا تھا جن میں کرنٹ ہوتا تھا تاکہ جو بھی دیوار پھلانگنے کی کوشش کرے،

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

سیکورٹی کا یہ عالم تھا کہ دن رات ہائی الرٹ کی کیفیت ہوتی تھی۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا رات کو چوکیدار چوکنے ہو جاتے تھے۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی کہ فیکٹری مالک رات کو کسی بھی پہر چوروں کی طرح آتا تھا، گیٹ سے تھوڑی دور گاڑی کھڑی کر کے دیوار پھلانگتا اور اس جگہ کرنٹ نہیں ہوتا تھا۔ پھر جو سورہا ہوتا تو شامت ہی شامت ہوتی۔ جو ڈیوٹی سے غفلت پڑتے پکڑا جاتا اس کی صبح سویرے لائن حاضری ہوتی، رسوائی جو ہوتی سو ہوتی، نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا یوں اس کے بچے اگلی نوکری تک فاقہ کشی کرتے تھے۔

☆.....☆

اتنے سخت پہرے میں بھی موٹر چوری ہوگئی تھی۔ چور نے کمال مہارت سے کام لیا تھا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی۔ یہ چوری سیکورٹی والوں کے لیے سوالِ نشان تھی۔ چھان بین کی گئی۔ ہر ورکر سے باری باری پوچھ گچھ کی گئی۔ الیکٹریشن شبیے کا فورمین بھی اس میں شامل تھا جسے چوہدری نے بلوایا تھا۔ تمام ورکرز وہاں حاضر تھے۔ پوچھ گچھ کے دوران الیکٹریشن ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا پکڑا گیا۔ دو ایک لوگوں نے شام کو چھٹی سے قبل اسے اس موٹر کے آس پاس دیکھا تھا۔ اس لڑکے کا نام تابش تھا۔ اونچا لمبا قد، مضبوط اعصاب اور طاقتور جسم کا مالک تھا۔ دکھنے میں مڑیل سا تھا۔ بالکل کپاس کی سوکھی لکڑی کی مانند لیکن اس میں پھرتی تھی۔ چست و چالاک تھا۔ پہلے پہل فیکٹری مالک نے زبانی پوچھ گچھ کی لیکن جب تابش کچھ نہ بولا تو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس نے اپنے حربے آزمائے اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے دو اور لوگوں کو پھنسوا دیا۔ وہ اکیلا چوری میں ملوث ہوتا تو بات ختم ہو جاتی تھی لیکن اس نے مراد کا نام بھی لے لیا اور کہا کہ وہ اس واردات میں برابر کا شریک ہے۔ مراد ہی تھا جس نے تابش کو چھٹی سے قبل موٹر کے آس پاس پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔

مراد فیکٹری مالک کا بھروسے کا آدمی تھا لیکن جب شک کی داڑیں پڑ جائیں تو سالوں کی محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔ فیکٹری مالک نے جب یہ سنا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور سوچ میں پڑ گیا کہ مراد..... نامراد کیسے بن گیا؟ میرا ہی نمک کھایا اور نمک حرام بن گیا۔ مراد کو آفس بلوایا گیا۔ پولیس انسپکٹر بھی آیا ہوا تھا جو مرغی کے گوشت سے انصاف کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مراد سے پوچھا گیا تو اس نے بات ہی ختم کر دی۔ ”مالک! میں نے چوری نہیں کی۔ آپ کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرامی میرے خون میں نہیں ہے۔ آج کیا سو سال بعد بھی چوری مجھ پر ثابت ہو جائے تو گردن حاضر کروں گا۔ میں اللہ تعالیٰ کی سزا سے ڈرتا ہوں۔“

انسپکٹر کا نوالہ حلق میں پھنس کر رہ گیا اور وہ فیکٹری مالک کو تکنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کو پریشان کن حالت میں دیکھنے لگے اور مراد ہاتھ باندھے ان کے سامنے مجرم بنا کھڑا تھا۔ جس نے چوری کی ہوتی ہے اس کے چہرے کے تاثرات بتا دیتے ہیں، چور کے چہرے پر اطمینان کی کوئی کرن نہیں ہوتی، چہرہ مرجھایا ہوا ہوتا ہے اور رنگت میں اتار چڑھاؤ ہونے لگتا ہے لیکن مراد پرامید تھا اور اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہیں تھا۔ انسپکٹر کامران اور فیکٹری مالک نے اشاروں کنایوں میں بات کی اور مراد کو آفس سے باہر بھیج دیا اور یوں مراد کی جان بخشی ہوگئی۔

تابش کی پہلے تھانے میں تفتیش ہوتی رہی پھر اس کا چالان کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ تابش اثر و رسوخ والا تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے۔ اس نے اپنے اثر و رسوخ سے عدالت سے ضمانت کرالی اور چند دنوں میں باہر آ گیا اور کیس مدتوں چلتا رہا۔ زندگی کے ماہ و سال گزرتے چلے گئے۔ تابش نے کہا۔ ”اگر میں چور ہوں، گواہ پیش کرو، ثبوت پیش کرو۔ عدالت تو گواہ لیتی ہے، ثبوت مانگتی ہے۔ فیکٹری مالک بھی کوئی گواہ پیش نہ کر سکا تھا۔ اس نے کئی ملازموں کو کہا کہ تم گواہی دے دو کہ تابش چور ہے۔ سب نے انکار کر دیا۔ ایک نے تو کہہ ہی دیا۔ ”صاحب آپ بڑے لوگ ہیں۔ پیسے سے سب کچھ کروا سکتے ہیں لیکن ایک مالک اوپر بھی ہے۔ ہم نے اس کو جان دینی ہے۔ جب میں نے تابش کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو کیسے گواہی دے دوں کہ تابش چور ہے۔“

فیکٹری مالک جابر تھا۔ مزدوروں کو گالیاں دیتا، مارتا پیٹتا تھا جو مزدور اس کی تعریف کرتا اس کی بلے بلے ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی مالک کے سامنے سبھی تعریفوں کے پل باندھتے اور جب وہ چلا جاتا تو من من کی بھاری گالیوں سے نوازنے لگتے۔ یوں گالیوں کی برسات شروع ہو جاتی اور چھٹی تک جاری رہتی۔ مزدور تو مجبور ہوتے ہیں اور اس فیکٹری کے مزدور بھی مجبور تھے۔ پڑھے لکھے تو تھے نہیں کہ اچھی نوکری حاصل کرتے۔ اپنے اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی شخصیت اور عزت گروی رکھ دی تھی۔ گدھے کی طرح دن بھر کام کرتے تھے اور اجرت بہت کم ملتی۔ اجرت دیتے وقت فیکٹری مالک کے ماتھے پر شکن پڑ جاتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فیکٹری مالک نے اپنی عزت اور خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے چند مزدوروں کو خریدنا چاہا، نوٹوں کا لالچ دے کر جھوٹی گواہی دینے کے لیے آمادہ کرنا چاہا لیکن کوئی مزدور نہ مانا اور پھر اگلے دن وہ کام پر بھی نہ آئے۔ اب ان کے گھر فاقے پڑیں یا مہنگائی کے طوفان میں مریں کس کو پڑی ہے کہ خبر گیری کرے۔ تابش جب سے ضمانت پر جیل سے باہر آیا تھا اس نے سارے غلط کام چھوڑ دیے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹی عطا کی تھی۔ کہتے ہیں جس گھر میں بیٹی پیدا ہو جائے وہ دوسروں کی بیٹیوں کو بھی عزت دینے لگتا ہے۔ جس گھر میں رحمت آجائے اسے در در کی ٹھوکریں کیوں ملیں۔ اللہ تعالیٰ نے تابش کو صراط مستقیم والے راستے پر گامزن کر دیا۔ گھر میں رحمت کا نزول ہونے پر تابش نے تمام غلط کام ترک کر دیے اور توبہ کر کے اللہ کی رضا میں راضی ہو گیا اور مٹ کر خاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کایا پلٹ دی اور اس کے گھر میں رزق کی فراوانی ہو گئی۔ اس کا گھر خوشیوں کی خوشبو سے مہکنے لگا اور پھر اللہ تعالیٰ نے خاص کرم کیا اور بیٹی جیسی رحمت آنے کے دو سال بعد اپنے گھر کا دیدار کرانے کے بلوا لیا۔

تابش حج کرنے چلا گیا۔ حج کے ارکان پورے کیے اور اللہ کے گھر کے سامنے بیٹھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ کہتے ہیں صدق دل سے اللہ سے معافی مانگی جائے تو ضرور معافی مل جاتی ہے۔ تابش کی مرادیں پوری ہوئیں۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

تابش مسجد نبوی کے فرش پر بیٹھا حضرت محمد ﷺ کی سفارش اور واسطہ دے کر اپنے رب سے گڑگڑا کر معافی مانگتا رہا اور اللہ سے خوب باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران ایک سفید پوش، سفید داڑھی والے عمر رسیدہ شخص نے اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تابش دعا مانگ چکا تھا اور ابھی تک دعا کے سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس شخص نے جب دوسری بار کندھے تھپتھپائے تو اس نے جھکے سر کو اٹھایا اور نظریں اس شخص پر مرکوز ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے تابش اسے پہچان چکا تھا۔ یہ شخص فیکٹری مالک تھا جس کی فیکٹری سے اس نے کئی سال پہلے موٹر چوری کی تھی۔

☆.....☆

دونوں مسجد کے احاطے سے نکل آئے کیونکہ تابش مسجد کے آداب سے واقف ہو چکا تھا۔ مسجد میں بیٹھ کر دنیاوی باتیں نہیں کرنی چاہیں۔ چلتے چلتے دونوں ایک ہوٹل میں جا بیٹھے۔ چند لمحے خاموش گزر گئے پھر فیکٹری مالک نے سکوت توڑا، اس نے اپنے لبوں کو جنبش دی اور بولنے لگا۔

''تابش! مجھے معاف کر دو، میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم چور نہیں تھے۔ میں نے خواہ مخواہ تجھے گرفتار کروا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے گھر آئے ہوئے ہیں، اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دو۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔ رب نے اپنے گھر بلا کر دونوں کو ملا دیا ہے۔ دیکھو ہمارا مل جانا کتنا عظیم ہے۔ پاک سرزمین پر، وہ زمین جس پر پیارے آقا حضرت محمد ﷺ کے قدم مبارک لگے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔'' اس نے دونوں ہاتھ تابش کے آگے جوڑ دیے۔ آج وہ مغرور فیکٹری مالک نہیں تھا بلکہ اللہ کی رضا میں سر بسجود ہونے والا اللہ کا بندہ تھا۔

تابش اپنی جگہ شرمندہ تھا۔ اصلی چور تو وہی تھا اور قسمت دیکھیے دونوں ہی چور تھے۔ ایک نے سامان چوری کیا تھا اور دوسرے نے حقوق چور کیے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے مجرم تھے۔ وہ پاک دھرتی پر بیٹھے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے۔ دھرتی کوئی بھی ہو، پاک ہے۔ یہ تو ہمارے کرتوت ہیں جو زمین کو ناپاک کر دیتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی ساری زمین پاک ہی تو ہے۔

تابش نے فیکٹری مالک کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ''نہیں چوہدری صاحب! قصوروار تو میں ہوں۔ میں نے ہی چوری کی تھی لیکن اس وقت میں مجبور تھا۔ آپ سے ادھار رقم مانگی تھی۔ اس دن میری بیوی کا آپریشن ہونا تھا اور بغیر پیسوں کے کوئی بھی آپریشن نہیں کرتا۔ آپ نے مجھے گالیاں دے کر آفس سے نکال دیا تھا۔ میری بیوی کا آپریشن تو ہو گیا۔ اللہ والے کام آ گئے تھے اور اللہ نے بندوبست کر دیا۔ مجھے شیطان نے بہکا دیا سو میں نے موٹر چوری کر لی۔ میرے ساتھ اور کوئی بھی شامل نہیں تھا۔ میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر چوری کی تھی اور اتنی بڑی موٹر فیکٹری سے باہر نکال کر لے گیا تھا۔ میں نے موٹر کے ساتھ ساتھ اور بھی چھوٹی چھوٹی چیزیں چوری کی تھیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی تھی اور میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنے کیے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں وہ سامان تو نہیں لوٹا سکتا ہاں جتنے میں فروخت کی تھیں وہ ضرور دے سکتا ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔''

''تابش! میں نے سب بھلا دیا ہے۔ میں تم کو معاف کرتا ہوں اور تم بھی مجھے معاف کر دو۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کر دیا اور اذان عصر گونجی تو دونوں اٹھ کر مسجد نبوی کی طرف چل پڑے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی پاک ذات سے اپنے گناہوں کے معافی مانگ رہے تھے۔ کیونکہ دونوں ہی رب کے چور تھے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ساتویں حکایت

باپ کا گناہ

سیدہ کاظمی

بھٹ شاہ سے ایک بیٹی کی حکایتِ اَلم

عبدالقادر گاؤں کا رہنے والا تھا۔ کھیتی باڑی سے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ وہ تین بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھا۔ جب اس کی عمر بیس سال کی ہوئی تو اس کی شادی چچازاد سے ہوگئی اور یکے بعد دیگرے بچے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ پانچ بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہوگئے۔

بچے جب کچھ بڑے ہوئے تو وہ بھائیوں سے الگ ہوکر رہنے لگا اور صحن کے بیچ ایک چھوٹی سی دیوار بنالی اور ایک کمرا بھی بنالیا تاکہ بچے آرام سے رہ سکیں۔ اس کی بیوی خدیجہ بھی نیک اور سیدھی سادی تھی۔ رشتے داروں کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔

پڑوس میں عبدالقادر کے چچا کے لڑکے کی شادی تھی۔ جو عمر میں کافی بڑا تھا وہ جو دلہن بیاہ کر لایا تھا وہ کم عمر اور بہت خوب صورت تھی۔ ولیمے میں سب رشتے دار شریک ہوئے اور دلہن کی بہت تعریف کررہے تھے۔ قادر کا اس کے چچازاد کے ہاں آنا جانا زیادہ رہتا تھا۔ کام وغیرہ کے سلسلے میں دونوں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اس نے ایک بات نوٹ کی کہ اس کے چچازاد رحیم کی بیوی کچھ چنچل سی تھی۔ ہر کسی سے جلد فری ہوجاتی تھی۔ جب قادر اس کے گھر جاتا تو حسنہ اس سے بہت کھل مل جاتی۔ چائے کھانے کا پوچھتی وہ بھی بھابی سمجھ کر اس کی عزت کرتا تھا۔ کافی وقت گزر گیا اس دوران حسنہ کے دو بچے ہوگئے۔

ایک دن قادر رحیم سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ موجود نہ تھا۔ اندر گیا تو حسنہ بہت خوش ہوئی۔ اسے بیٹھنے کو کہا اور چائے بنا کر لے آئی۔ گھر میں اور کوئی نہیں تھا سوائے ان دونوں کے۔ بچے سو رہے تھے۔ حسنہ نے موقع غنیمت جانا اور اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ قادر اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

''حسنہ تو کیا کہہ رہی ہے پاگل ہوگئی ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے تو میری بھابی ہے۔ تیرے دو بچے ہیں اور میں بھی شادی شدہ ہوں۔''

حسنہ نے کہا۔ ''سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے تمہارے بارے میں۔ اگر تو مجھے نہ ملا تو میں مرجاؤں گی۔''

وہ جلدی سے بہانہ بنا کر گھر سے نکل گیا لیکن وہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی بات کو ٹھکرانا کسی بھی مرد کے لیے بہت مشکل تھا۔ گھر آکر وہ سوچنے لگا۔ میرے بیوی اور بچے..... ان کا کیا قصور ہے۔ میں اگر یہ قدم اٹھاؤں گا تو سب مشکل میں پھنس جائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

گے۔ نہیں نہیں یہ بہت غلط ہو جائے گا۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ اب وہ رحیم کی موجودگی میں جاتا۔

☆.....☆

کافی دن گزر گئے۔ ایک دن کسی ضروری کام سے وہ رحیم کے گھر گیا تو دروازہ حسنہ نے کھولا اور بولی۔ ''رحیم شہر گیا ہے کل آئے گا۔''

وہ واپس جانے لگا تو حسنہ نے اسے روک دیا اور کہا۔ ''بہت دنوں کے بعد آئے ہو۔ مجھے ضروری بات کرنا ہے تم سے اندر آ جاؤ۔''

ادھر ادھر کی باتوں میں رات ہو گئی اور وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

پھر تو جیسے سلسلہ شروع ہو گیا۔ دونوں کے آنکھوں پر جیسے پٹی بندھ گئی۔ انہیں کسی بات کی پروا نہ رہی جب رحیم شہر جاتا وہ اسے بلا لیتی رحیم کو کانوں کان خبر نہ ہوئی لیکن آخر کب تک۔ تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اب رحیم کو کسی نے بتایا تو اس نے آ کر اپنی بیوی کو سمجھایا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا اور الٹا رحیم سے لڑنے لگی کہ مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔

آخر کار جب وہ پیار سے نہ مانی تو اس کے شوہر نے اس پر سختی کرنی شروع کر دی اور اپنی ایک رشتے کی خالہ کو دوسرے گاؤں سے اپنے گھر بلا لیا۔ جو اب حسنہ کے ساتھ گھر میں رہتی اور اس پر نظر رکھتی۔

کچھ دن تو چپ چاپ گزر گئے اور قادر نے بھی آنا جانا بند کر دیا تو حسنہ کا سکھ چین برباد ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو خالہ کا گلا گھونٹ دیتی۔ اس نے کسی بہانے قادر کو کھیتوں میں بلا لیا اور کہا۔ ''میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتی۔ اب رحیم کو شک ہو گیا ہے۔ اس نے مجھ پر سختی شروع کر دی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ قادر سے لپٹ گئی۔

قادر پہلے ہی پریشان تھا اتنے دنوں بعد جو حسنہ ملی تھی۔ دونوں مل کر خوب روئے اور فیصلہ کر لیا۔

قادر نے کہا۔ ''جب میرے لیے تُو اپنا گھر بچے سب چھوڑ آئی ہے تو اب چاہے کچھ بھی ہو جائے ہم گاؤں چھوڑ کر دور چلیں جائیں گے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

صبح فجر سے پہلے وہ اپنے بچوں اور شوہر کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گئی اور دونوں ٹرین میں سوار ہو کر پنجاب کے لیے روانہ ہو گئے۔

صبح بچوں کے رونے کی آواز پر رحیم جاگا تو حسنہ کو آواز دینے لگا اور اس کو نہ پا کر بہت پریشان ہوا اور اس کو ڈھونڈا بہت لیکن وہ ہوتی تو ملتی۔

ادھر قادر بھی اپنے گھر سے غائب تھا بنا بتائے تو سب کا شک اس پر گیا۔ قادر کی بیوی پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی وہ رو رہی تھی۔

''قادر یہ تُو نے کیا کر دیا کچھ دنوں میں تیرے بیٹے اور بیٹی کی شادی ہے تُو نے اتنا بھی خیال نہ کیا۔ ہائے میں کیا کروں۔'' کچھ دن تک جب حسنہ اور قادر کا کچھ پتا نہ چلا تو ایک دن قادر کے گھر رحیم داخل ہوا اور کہا۔

''میں قادر اور حسنہ کو کاروکاری کے الزام میں مار دوں گا۔ قادر نے میری بیوی کو ورغلایا ہے بھگایا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ بہت غصے میں تھا۔

قادر کے بیوی بچے پریشان ہو گئے۔ رو رو کے برا حال ہو گیا ان کا شادی کا گھر تھا۔ رات کو بارات آنی تھی۔ بہرحال معاملہ بہت بڑھ گیا۔ پولیس میں رپورٹ درج ہو گئی اور عین شادی کی رات پولیس قادر کے بیٹوں اور بھائیوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔

قادر کی بیوی پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ جیسے تیسے بیٹی کو رخصت کیا۔ وہ قادر کو بار بار کہہ رہی تھی تم نے کیا نادانی کی کہ دو گھر برباد کر دیے۔ پولیس نے ان لوگوں کو بہت مارا اور قادر کا پتا پوچھتے رہے لیکن جب ان کو معلوم ہی نہیں تھا تو کیا بتاتے۔

اب پولیس ان لوگوں کو چھڑانے کے پیسے مانگ رہی تھی۔ قادر کی بیوی نے مال مویشی بیچ کر اپنے بیٹوں کو چھڑایا لیکن رحیم ان دونوں کے خون کا پیاسا گھوم رہا تھا۔ رائفل ہاتھ میں لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ اگر وہ مل گئے تو گولی مار دوں گا۔

سارا گھر پریشان نہ ان لوگوں کو کھانے کا ہوش رہا نہ پینے کا۔ ایک مہینا گزر گیا۔ تب کہیں سے خبر آئی کہ وہ لوگ پنجاب کے ایک شہر میں رہائش پذیر ہیں۔ آخر کار قادر کا بڑا بھائی، بھابی کے پاس آیا اور کہا۔

''حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ آج ہمیں پتا چلا ہے کل رحیم کو معلوم ہو جائے گا۔ اس سے پہلے اگر ہم پنچایت بٹھا کر فیصلہ کر دیں گے تو سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔ کیونکہ میری قادر سے بات ہوئی ہے وہ حسنہ کو کسی قیمت پر چھوڑنے پر راضی نہیں۔ ادھر رحیم بھی غصہ میں ہے۔ بھابی تم عقلمندی کا مظاہرہ کرو گی تو گھر کو بچا لو گی ورنہ بھائی نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

آخر کار وہی ہوا پنچایت کا فیصلہ سب کو منظور کرنا پڑا جو یہ تھا کہ رحیم بیوی کو طلاق دے گا اور حسنہ کا نکاح قادر سے کرایا جائے گا اور رحیم کا نکاح قادر کی دوسرے نمبر والی بیٹی صائمہ سے کر دیا جائے اور ایسا ہی ہوا۔

لیکن صائمہ اور اس کی ماں کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ کہاں صائمہ اٹھارہ سال کی کہاں رحیم پچاس سال کا۔

لیکن سب نے ان لوگوں کو سمجھایا اگر ایسا نہ ہوا تو بہت خون خرابہ ہو گا اور آخر کار صائمہ کا رشتہ رحیم کو دے کر بڑا مسئلہ حل کر لیا گیا انہوں نے لیکن ایک بیٹی اپنے باپ کے گناہ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جب فیصلہ ہو گیا تو حسنہ اور قادر کو بلایا گیا اور سب کچھ پنچایت کے فیصلے کے مطابق ہوا۔

رحیم نے گھر کو جو گاؤں میں تھا اس کو بیچ دیا اور شہر میں گھر لے لیا اور صائمہ کو لے کر وہاں چلا گیا اور حسنہ نکاح کے بعد بیوی بن کر آج بھی قادر کے گھر اپنے سوتن اور اس کے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

آخر سوچنے کی بات یہ ہے کہ قصور کس کا ہے۔ حسنہ کا قادر کا یا دونوں کا جنہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کسی رشتے کی بھی پروا نہ کی۔ صائمہ کو کیوں یہ سزا ملی۔ وہ کیوں باپ کے گناہ کا شکار ہو گئی۔

.....☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آٹھویں حکایت

غیرت

اعتزاز سلیم وصلی

دوسروں کی عزتوں کے لٹیرے بھلا اپنی عزتوں کو کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں

دو دن سے وہ بھوکی پیاسی اس کمرے میں قید تھی۔ اسے لے کر آنے والا جیسے بھول گیا تھا کہ کوئی اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ بھوک سے نڈھال تھی۔ اس نے ایک بار پھر زور زور سے دروازہ پیٹا مگر حسب معمول کوئی جواب نہ آیا۔ آخر کار تنگ آ کر وہ کمرے پڑی اکلوتی چارپائی پر گر گئی اور آنسو اس کی آنکھ سے رواں ہو گئے۔

☆☆☆

''امی یہ دیکھیں میرے سب سے زیادہ نمبر آئے ہیں'' جو دہ سال کی سمیرا نے اپنا رزلٹ کارڈ ماں کو دکھایا۔ ''اور امی عدیل بھائی کا اس بار بھی سی گریڈ'' ساتھ میں بڑے بھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کی شکایت بھی لگادی۔

''تم چیٹنگ کر کے مارکس لیتی ہو میرا ایمانداری کا سی گریڈ ہے'' عدیل نے اسے چڑایا۔''امی دیکھ لیں ایک تو مارکس کم لیتا ہے اور دوسرا جیلس بھی ہوتا ہے'' سمیرا کی دوسری شکایت بھی حاضر ہوگئی۔ نصرت ان دونوں کی باتیں سن کر مسکراتی رہی اور وہ دونوں لڑائی میں مصروف رہے۔

☆☆☆

سمیرا اور عدیل اپنے ماں باپ کے لاڈلے تھے۔ سعید احمد کی مین مارکیٹ میں تین دکانیں تھی جن سے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ گھر میں کوئی مالی پریشانی نہیں تھی۔ نصرت سادہ سی گھریلو عورت تھی۔ سمیرا آٹھویں میں اور عدیل میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا جب ایک ایکسیڈنٹ میں سعید احمد کا انتقال ہوگیا۔ اس ہنستے بستے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان حالات میں نصرت نے خود کو اور اولاد کو سنبھالا۔ مالی پریشانیوں سے بچنے کے لیے اس نے تینوں دکانیں کرائے پر چڑھادیں۔ عدیل اور سمیرا بھی اپنی پڑھائی پر توجہ دینے لگے۔ رفتہ رفتہ زندگی معمول پر آگئی۔ عدیل نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہ شہر کا مہنگا ترین کالج تھا۔ یہاں صرف امیروں کے بچے پڑھتے تھے مگر نصرت نے اکلوتے بیٹے کی تعلیم کے لیے اخراجات کی پرواہ نہ کی۔ عدیل کی کالج میں چند آوارہ لڑکوں سے دوستی ہوگئی۔ نصرت جیسی سادہ عورت کو دھوکا دینا اس کے لیے کوئی مشکل ثابت نہ ہوا۔ پڑھائی کے اخراجات کے نام پر وہ روزانہ پیسے لیتا اور آوارہ دوستوں پر خرچ کر دیتا۔ تعلیم کو اس نے مکمل نظر انداز کر دیا۔ سال بعد جب رزلٹ آیا تو نصرت کو اس کے کرتوت پتا چلے۔ اس نے عدیل کا کالج بدل دیا مگر عدیل کی صحت پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ وہ ماں کی باتیں ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ رفتہ رفتہ وہ پڑھائیے بالکل بددل ہو گیا اور اس نے کالج چھوڑ دیا۔ اب وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا اور گھر میں آکر بلاوجہ ماں اور بہن پر چیختا چلاتا۔ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر محلے کی لڑکیوں کو چھیڑتا تھا اور شام کو کسی نہ کسی سے لڑ کر گھر آتا۔ محلے کی لڑکیاں اس سے بہت تنگ تھیں۔ اس نے محلے کی اکلوتے اسکول کی ٹیچر کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ صفیہ نامی یہ ٹیچر کیبار عدیل کی شکایت اس کی ماں کو لگا چکی تھی مگر وہ اس کی سنتا کب تھا جو بات مانتا۔ نصرت دن رات اس کے لیے پریشان رہتی۔

☆☆☆

سمیرا نے میٹرک کے بعد کالج میں ایڈمیشن لیا۔ عدیل کی نسبت اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ کالج کے علاوہ وہ ایک اکیڈمی میں بھی پڑھنے جاتی تھی۔ اکیڈمی کا نوجوان ٹیچر مدثر احمد انہیں انگلش پڑھاتا تھا۔ دلکش خدوخال کا مالک مدثر احمد متاثر کن شخصیت رکھتا تھا۔ سمیرا اسے بہت پسند کرتی تھی۔ اس کی یہ پسندیدگی استاد شاگرد کے رشتے سے ہٹ کر تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ مدثر بھی اسے پسند کرتا ہے۔ ایک دن اکیڈمی کی ٹیچر ڈائری سے اس نے مدثر کا نمبر چپکے سے نوٹ کرلیا۔ اب مدثر سے کال پر بات کرلیتی جس کا مدثر نے برا نہ مناتا۔ دونوں میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

صفیہ نے عدیل سے تنگ آکر اپنا ٹرانسفر کروالیا مگر عدیل نے دوسرے اسکول میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ عدیل ان لوگوں میں سے تھا جو ملازمت پیشہ خواتین کو برا سمجھتے اور انہیں تنگ کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اس نے عدیل کی منتیں کی اسے واسطے دیے مگر عدیل ڈھٹائیے اس کا پیچھا کرتا رہتا۔ یہ بات پورے اسکول میں پھیل گئی کیونکہ استانی صفیہ کے لیے ایک لڑکا اسکول کے باہر کھڑا ہوتا ہے۔ اسکول کی پرنسپل نے صفیہ کو بلا کر وارننگ دی کہ اس لڑکے سے جلد جان چھڑا لیں نہیں تو اسکول کی بدنامی ہوگی۔ صفیہ کے گھر میں بوڑھے ماں باپ تھے جو اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے دن صفیہ اپنے ماموں کے گھر گئی۔ اس کے ماموں کا بیٹا بھی ٹیچر تھا اور وہ صفیہ کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے یہ ساری بات اسے بتائی اور مدد کی درخواست کی۔ ماموں زاد نے مدد کا وعدہ کیا مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ دوسرے دن صفیہ کو اسکول سے واپسی پر عدیل اور اس کے ساتھیوں نے اغوا کرلیا۔

☆☆☆

سمیرا مدثر احمد کی دیوانی ہوگئی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب ایسی چیزیں بہت متاثر کرتی۔ وہ کئی گھنٹے موبائل پر اس سے باتیں کرتی۔ مدثر احمد نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ ایک دن مدثر نے اس سے کہا ''سمیرا میں نے امی سے ہمارے رشتے کی بات کی ہے مگر وہ نہیں مانی، وہ کہتی ہیں میرا رشتہ میری پھوپو کی بیٹی سے طے ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اب کیا ہوگا؟'' سمیرا فکرمندی سے بولی۔

''ہم کورٹ میرج کرلیں گے۔'' مدثر نے اسے نئی راہ دکھائی۔

''اگر بھائی کو پتا چلا تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔'' سمیرا کو عدیل کے غصے سے بہت ڈر لگتا تھا۔

''میں ہوں نہ تمہارے ساتھ، ہم بہت دور نکل جائیں گے کوئی ہمیں ڈھونڈ نہیں سکے گا۔'' مدثر کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جو سمیرا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہا تھا۔ جوانی کا نشہ آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

☆☆☆

صفیہ کی زندگی برباد ہوگئی۔ عدیل اس دن اسے اپنے دوست کے فلیٹ پر لے گیا اور بے ہوشی کی حالت میں اس کی ایسی تصویریں بنائیں جنہیں دیکھ کر وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ اب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عدیل کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔ عدیل کئی دن اسے استعمال کرتا رہا اور جب دل بھر گیا تو اس کی تصویریں دوست کے حوالے کردیں۔ صفیہ زندگی سے بالکل مایوس ہوگئی اور اس نے زہر کھالیا۔

☆☆☆

اس شام سمیرا اکیڈمی سے گھر واپس نہ آئی۔ عدیل نے ہر جگہ پتا کیا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ وہ سمیرا کی تمام دوستوں کے گھر گیا مگر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ اس نے تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عدیل اور نصرت کا غم سے برا حال تھا۔ دو دنوں میں پورے محلے کو پتا چل گیا۔ محلے کی عورتیں ان کے گھر آکر طرح طرح کی باتیں کرتیں۔ نصرت کی طبیعت شدید خراب ہوگئی اور اسے اسپتال لے جانا پڑا۔

☆☆☆

تیسرے روز صبح کے وقت دروازہ کھلا اور مدثر اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی اور چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔'' اسے دیکھ کے سمیرا پھٹ پڑی۔

''کھانا کھالو سب بتاتا ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

سمیرا نے اس کے ہاتھ سے کھانے کی ٹرے پکڑی اور چپ چاپ بیٹھ کر کھانے لگی۔ کھانے کے پانچ منٹ بعد اسے اپنے اردگرد سب کچھ گھومتا ہوا دکھائی دیا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ مکمل بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

سمیرا کی گمشدگی کے چند روز بعد عدیل کو ایک لفافہ موصول ہوا۔ اسے کھولتے ہی سمیرا کی کئی برہنہ تصویریں نیچے گر پڑیں اور ساتھ ہی ایک چٹ ملی جس پر لکھا تھا ''صفیہ یاد ہے؟'' تصویریں دیکھ کہ عدیل کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ یہ اس کے برے کاموں کا صلہ تھا اور یہ سزا اسے ساری زندگی بھگتنا تھی۔

☆☆☆

سمیرا کی آنکھ شام کے وقت کھلی۔ وہ چارپائی پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ اس کے جسم پر کپڑے کا ایک چیتھڑا بھی نہ تھا۔ اس نے جلدی سے کمبل اٹھا کے اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسی دوران مدثر علی ہاتھ میں کپڑے پکڑے اندر داخل ہوا آتے ہی بولا ''سوری سمیرا، مجھے تمہارے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر تمہارے غیرت مند بھائی کو سبق سکھانے کے لیے یہ ضروری تھا۔''

''کیا کیا ہے میرے بھائی نے؟'' سمیرا کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

''جانتی ہو آج سے کچھ دن پہلے اس نے ایک بے قصور لڑکی کو اغوا کیا، اس کی تصویریں بنا کے اسے بلیک میل کیا، کیا وہ کسی کی عزت نہیں تھی؟ وہ لڑکی میری منگیتر تھی میری محبت تھی ہماری بہت جلد شادی ہونے والی تھی عدیل کی ضد نے سب کچھ تباہ کردیا۔'' مدثر کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔

''مگر یہ عدیل نے کیا ہے تو میرا اس میں کیا قصور، میں نے تو تم سے سچی محبت کی تھی۔''

مدثر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوا بولا۔ ''تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے ایک انجان شخص کے لیے گھر چھوڑا، اپنی محبت کرنے والی ماں کو چھوڑا، تمہارا قصور تمہاری خود غرض سوچ ہے یہ لو اپنے کپڑے میری طرف سے اب تم آزاد ہو۔ میرے بارے میں عدیل کو سب بتا دینا مگر میں اسے اب نہیں ملوں گا کیونکہ میں یہ ملک ہی چھوڑ کر جارہا ہوں۔'' مدثر نے اس کی جانب کپڑے پھینکے اور خود باہر کی طرف چل دیا۔ سمیرا نے کپڑے اٹھائے اور پہننے لگی اسے ابھی بہت کچھ سہنا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نویس حکایت

قصور وار کون؟

غلام مرتضیٰ علوی

معاشرے کے منافقانہ رویوں سے جڑی ایک حکایتِ خاص

کتابوں کی دکان کے آگے موٹر بائیک کھڑی کر کے عمر رشید نے سچی کہانیاں کا تازہ شمارہ اسٹال سے اٹھایا ہی تھا کہ موبائل فون شور مچانے لگا۔ عمر رشید نے فون جیب سے نکال کر دیکھا تو اس کے کزن کا فون آرہا تھا۔ فون ریس کرنے پر عمر رشید کو اپنے کزن کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔

''عمر بھائی عمر بھائی تایا جان کو دل کی تکلیف ہوئی ہے۔ میں اپنی بائیک پر قریبی کلینک لے کر آیا ہوں تو ابتدائی امداد دینے کے بعد ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ان کو جتنی جلدی ہو سکے الائیڈ اسپتال فیصل آباد لے جاؤ۔ بھائی آپ کدھر ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ عمر کے بھی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کتابوں والے کو سو کا نوٹ تھما کر سچی کہانیاں کا شمارہ بائیک پر لٹکایا اور بقایا لیے بنا ہی بائیک اسٹارٹ کر کے اس کا رخ دل کے اس مقامی کلینک کی طرف کر دیا جو کہ یہاں سے تھوڑی ہی دور تھا۔ کلینک آنے پر اس کو خاندان کے کئی افراد کھڑے بھی دکھائی دیے مگر وہ تیزی سے ایمرجنسی روم کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہاں تایا جان کا اکلوتا لڑکا اور گھر کے دوسرے افراد پریشان کھڑے تھے۔ خالد اس نے فون کرنے والے کزن کو کہا۔

''ایمبولینس کا انتظام ہوا کہ نہیں اور فیصل آباد میرے ابو جان کو فون کیا کہ نہیں کہ وہ الائیڈ اسپتال آجائیں۔''

''جی بھائی سب ہو گیا ہے بس آپ کا انتظار تھا۔ تایا جان کے ساتھ آپ چچا جان امی اور میں جائیں گے۔ فیصل آباد میں آپ کے ابو اور دوسرے عزیز موجود ہوں گے۔'' خالد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مقامی کلینک کا ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ چلیے جن جن احباب کو ساتھ جانا ہے۔ ''ایمبولینس باہر کھڑی ہے۔''

چند ہی منٹ میں عمر رشید خالد چچا جان اور امی جان (جو بے پناہ منع کرنے کے بعد بھی ساتھ چل دی تھیں) تایا جان کے ہمراہ فیصل آباد کی طرف رواں دواں تھے۔

تائی جان وفات پا چکی تھیں اور ان کے اکلوتے لڑکے کی عمر بھی کم تھی اس لیے اس کو ساتھ نہ لے جایا گیا کہ صحت بہتر ہوتے ہی تو ہم نے واپس آجانا ہے مگر عمر کو کیا پتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

فیصل آباد پیپرہ چوک تک تو ان کی گاڑی فراٹے بھرتی رہی مگر پیپرہ روڈ سے چونکہ جھنگ کو جانے والی سڑک بھی ساتھ آملی تھی گوجرہ فیصل آباد روڈ پر تو گاڑی کی رفتار بھی کم بھی زیادہ ہونے لگی۔ تایا جان کو راستے میں دو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بار پانی پلایا گیا۔

''ڈرائیور آپ نے بائی پاس سے سیدھے جھنگ روڈ پر ہی رہنا ہے اور چناب چوک سے ٹرن لے کر جیل روڈ سے ہوتے ہوئے الائیڈ اسپتال جانا ہے۔'' عمر نے ڈرائیور کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''جی اچھا صاحب۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ بائی پاس تک تو وہ اگلے بیس منٹ میں آ گئے۔ بائی پاس چوک سے سیدھے جھنگ روڈ پر ہی رہے اور فیصل آباد جلدی آنے کی دعائیں کرتے رہے کیونکہ تایا جی کی طبیعت اب کچھ بے چین سی نظر آنے لگی تھی۔ بائی پاس چوک سے ابھی وہ چند کلومیٹر ہی آگے ہوں گے کہ ایک جگہ ہنگامہ برپا دیکھا دونوں طرف کی ٹریفک رکی ہوئی تھی۔

''اوہ یہ کیا ہو گیا ہے۔'' یہ کہتا ہوا پہلے خالد اترا پھر عمر بھی اتر آیا۔ امی جان کی تسبیح اور تیز ہو گئی۔ سڑک پر آگے جا کے دیکھا تو مزدوروں کا ایک گروپ اپنے مطالبات اور اجرت بڑھانے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر احتجاج کر رہا تھا اور ٹائروں کو آگ لگائی ہوئی تھی۔ پولیس والے بھی موجود تھے۔ وہ شدت سے لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف تھے۔

خالد نے کہا۔ ''یہ احتجاج تو لگتا ہے کئی گھنٹوں تک ختم نہیں ہو گا۔''

''پھر کیا کریں ہم۔''

عمر رشید نے جواب دیا۔ ''ہم ایمبولینس کو ساتھ والے محلے میں نکال کر احتجاج والوں سے دور لے جا کے مین روڈ پر ڈالتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''

ان کے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی کافی تگ و دو کے بعد بیس منٹ بعد نکال کر ساتھ والے ایک محلے میں ڈال دی۔ محلے میں پان کی ایک دکان سے راستہ پوچھا تو اس نے کہا۔

''صاحب! آپ گاڑی کو لے تو جاؤ مگر تیسری گلی جو کہ آپ کو اس چھوٹی سڑک پر لے جائے گی جو دوبارہ سے جھنگ روڈ پر جائے گی اس تیسری گلی میں سڑک ویسے تو نئی بنی ہے مگر ہلکا مال ڈالنے سے گڑھے بنے ہیں اور آپ دیکھ کر جانا کیوں کہ کئی جگہ نوکیلے سے پتھر بھی سڑک میں باہر نکلے ہیں کہیں ایمبولینس پنکچر نہ ہو جائے۔''

اس نیک دل پان والے کی بات پر عمل کرتے ہوئے جب ایمبولینس تیسری گلی میں داخل ہوئی تو ڈرائیور محتاط ہو کر چلانے لگا۔ گلی اگرچہ تھوڑا عرصہ ہی پرانی لگتی تھی مگر لگتا تھا ٹھیکے دار نے ہلکا مال ڈالا ہوا ہے جس سے سڑک جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی۔ گاڑی میں تایا جان کی طبیعت بھی کافی بے چین سی تھی۔ تیسری گلی کے درمیان میں جا کر گاڑی ایک چھوٹا سا گڑھا عبور کر ہی رہی تھی کہ کڑک کی آواز آئی اور ایک ٹائر سے ہوا تیزی سے نکلنے لگی۔ عمر اور خالد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا تو دیکھا کہ ایک بالکل نوکیلا پتھر جو سڑک کے ٹوٹنے سے باہر آ گیا تھا اس نے ٹائر کو پنکچر کر ڈالا تھا۔ چچا جان گاڑی میں سے اترے اور تیزی سے ڈرائیور کی مدد کرنے لگے مگر پھر بھی پرانا ٹائر اتار کر نیا لگاتے لگاتے کافی وقت لگ گیا۔ ٹائر لگنے کے بعد ایمبولینس تیزی سے جھنگ روڈ کی جانب بڑھی اسی وقت تایا جی کی حالت مزید خراب ہونا شروع ہو گئی۔ چچا جان نے تھوڑا سا پانی بھی پلایا مگر حالت نہ درست ہوئی۔ خدا خدا کر کے وہ اسپتال پہنچے تو مین گیٹ پر سے ہی تایا جی کا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا۔ فوراً ایمرجنسی میں لے جایا گیا مگر ڈاکٹروں کے مطابق اگر بیس منٹ پہلے تک لے آتے تو ہو سکتا تھا ان کا وہ دورہ جو ان کو گاڑی میں پڑا اس سے بچاؤ ہو جاتا۔

سو قارئین کرام! تایا جی جو مزدوروں کے ایک گروہ جو سیاست دانوں کے ہتھے چڑھ کر سڑک بلاک کیے ہوئے تھا کی وجہ سے لیٹ ہوئے اور بعد میں سڑک جس کا ٹھیکے دار ہلکا مال ڈال کر حرام کما چکا تھا۔ اس سڑک کے پتھر نے ایمبولینس خراب کر کے تایا کو مزید لیٹ کر دیا جس کی وجہ سے تایا جی وقت پر اسپتال نہ جا سکے اور جان کی بازی ہار گئے۔ ان کا قاتل کون ہے؟ بلاوجہ ٹریفک بلاک کر کے نت نئے مطالبے کرنے والے لوگ یا وہ ٹھیکے دار جس کے گھٹیا مال سے بنی سڑک کے پتھروں نے ایمبولینس خراب کر دی تھی جو وقت پر اسپتال نہ جا سکی اور تایا جی جان کی بازی ہار گئے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دسویں حکایت

دلدل

افسانہ آفتاب کاوش

اُس شخص کی داستان جو اپنوں پر ظلم کرتے کرتے خود ظلم کی دلدل میں پھنس گیا تھا

''جواد کھانا لگا دیا ہے۔ بیٹا کھالو آ کر۔'' نسیمہ بیگم نے مٹر چھیلتے ہوئے اپنی اکلوتی اولاد سے کہا تھا۔

''دس منٹ امی بہت زبردست ٹاک شو دیکھ رہا ہوں کھالوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔'' جواد نے محبت بھری نظروں سے اپنی پیاری ماں کو دیکھا تھا جو کہ اس کے لیے کل کائنات تھیں۔

''بیٹا! آج تمہارے چھوٹے ابو آئے تھے۔ کرائے دار نے ابھی تک کرایہ نہیں دیا۔ کہہ رہے تھے اگلے ماہ دے گا۔'' نسیمہ بیگم نے جواد سے کہا تھا۔

''اور وہ تمہاری جاب کے متعلق بھی استفسار کر رہے تھے۔'' نسیمہ بیگم نے مٹر کے چھلکوں کو شاپر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا انہیں کہہ دیا کریں کہ ہماری فکر کرنا چھوڑ دیں۔ ہم ان سے مانگنے نہیں جاتے یا ہمارے گھر کا خرچا وہ نہیں چلا رہے ہیں۔ آئندہ وہ آئیں تو ان سے کہہ دیں کہ اپنی حد میں رہیں۔'' جواد نے ریموٹ ٹیبل پر پٹختے ہوئے کہا۔

''بری بات ہے بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ سگے چچا ہیں وہ تمہارے۔ تمہارے ابو کے بعد انہوں نے ہی سہارا دیا ہے ہمیں۔ ورنہ میں اکیلی عورت کیا کرتی۔ کیسے پالتی تمہیں بس ذرا غصے کے تیز ہیں۔ باقی ہیں تو تمہارا سگا خون۔'' نسیمہ بیگم نے سمجھاتے ہوئے اس کا غصہ کم کرنا چاہا تھا۔

''بس رہنے دیجیے امی کتنے مکار انسان ہیں پتا لگ چکا ہے مجھے۔ انہوں نے ہمیں سپورٹ نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہمیں بے وقوف بنا کر اپنا بینک بیلنس بنایا ہے۔ بے حد شاطر انسان ہیں۔ آپ بے حد سادہ اور گھریلو خاتون ہیں۔ آپ نہیں سمجھ سکتیں ان کی چالاکیاں۔'' جواد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہر ماہ ان کا یہ ہی ڈراما ہوتا ہے کرایہ نہیں ملا۔ حالانکہ اختر بھائی سے میری کل ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے کرایہ دے دیا ہے۔'' جواد نے نسیمہ بیگم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''کل میں نماز کے لیے گیا تھا تو مسجد میں ہی ملاقات ہوئی تھی میری۔'' جواد نے اپنی بات مکمل کی۔

اپنے چچا کے ذکر پر اکثر اس کا حلق تک کڑوا ہو جایا کرتا تھا۔ ابا بے چارے جوانی میں ہی داغ فانی سے کوچ کر گئے۔ اماں بھری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اماں کی سادگی کا فائدہ صداقت چچا نے خوب اٹھایا تھا۔ ابا کی زمینوں اور دکانوں کا جو بھی حساب کتاب تھا سب ان کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سپرد تھا۔ ابا انہیں ہی سب کچھ سونپ کر گئے تھے کیونکہ اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں اور جو اداس وقت چھوٹا تھا۔

☆.....☆

''حاشر یہ کچھ کیش ہے۔ انہیں جا کر میرے اکاؤنٹ میں ڈلوا دو۔'' صداقت صاحب نے ایکسر سائز کرتے اپنے اکلوتے بیٹے سے کہا۔

''پپا آپ یہ فضول سے کام سرانجام دینے کے لیے مجھے مت کہا کریں۔ آپ خود چلے جائیں یا اپنے کسی ملازم سے کہہ دیں۔'' حاشر نے ٹاول بیڈ پر اچھالتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ان فضول چیزوں کے لیے ٹائم نہیں ہے۔'' حاشر نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے نخوت سے جواب دیا۔

''تم حد سے زیادہ خودسر اور بدتمیز ہو گئے ہو۔'' صداقت صاحب نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

''سوری پاپا میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ ویسے بھی میرے فرینڈز میرا ویٹ کر رہے ہیں۔'' حاشر کہتے ہی چلتا بنا اور صداقت صاحب اس کے رنگ ڈھنگ دیکھتے رہ گئے۔ بے جا لاڈ پیار اور پیسوں کی زیادتی نے حاشر کو مغرور اور خودسر بنا دیا تھا۔ بنا مانگے اسے ہر سہولت میسر تھی۔ صداقت صاحب اس کی ہر خواہش پوری کرتے رہتے تھے۔ حاشر اپنے آگے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ ڈرنک کرنا، عیاشی کرنا وہ ہر طرح کی برائی میں ملوث تھا۔ اس کی گیدرنگ میں کئی اوباش لڑکے شامل تھے۔ لیٹ نائٹ پارٹیز، ریسنگ اور ڈرنک کرنا اس کی پرانی عادت بن چکی تھی۔ کچھ نیا ایڈونچر کرنے کے چکر میں وہ لوگ کئی بڑی وارداتیں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کر چکے تھے۔ صداقت صاحب اپنی تربیت پر افسوس کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے بھتیجے اور بھائی کا زندگی بھر حق مارا۔ اپنے بھتیجے کو اپنے بیٹے کے آگے کبھی کسی قابل نہیں سمجھا اور اپنی فرشتہ صفت بھائی کو اجڈ، جاہل گنوار سمجھ کر ہمیشہ ان کے ساتھ زیادتی کی مگر اللہ بے شک بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ صداقت صاحب نے ہمیشہ اپنی اولاد کو حرام کھلایا۔ بیوی نے تو ان کے کرتوت دیکھ کر ہی جوانی میں ہی انہیں خیر باد کہہ دیا تھا۔ حاشر پوری ان کی کاپی تھا۔ صداقت صاحب نے بھی اپنی جوانی بڑی رنگین گزاری تھی۔

☆.....☆

''بیٹا آج میں پڑوس میں گئی تھی۔ بہت اچھے لوگ ہیں بیٹا ایاز صاحب کی دو ہی بیٹیاں ہیں۔ ماشاء اللہ بہت ہی نیک اور خاندانی لوگ ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی تو بات طے ہے۔ چھوٹی کے لیے وہ لوگ رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ بڑی ہی پیاری بچی ہے۔ تم کہو تو بات کروں تمہارے لیے۔'' نسیمہ بیگم نے لوکی کاٹتے ہوئے جواد سے کہا تھا۔ جو چھٹی ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔

''امی آپ کی پسند میری پسند ویسے آپ کی ہونے والی بہو کا نام کیا ہے؟'' جواد نے مسکراتے ہوئے اماں سے استفسار کیا تھا۔

''میرا بچہ جگ جگ جیو مجھے پتا تھا۔ میرا بیٹا میرا مان کبھی نہیں توڑے گا بہت پیارا ہے میرا بیٹا۔'' نسیمہ بیگم نے جواد کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

''منتشا نام ہے۔ بڑی مشکلوں سے یاد کیا ہے۔'' نسیمہ بیگم نے سبزی کٹی نوکری اٹھاتے ہوئے جواد کو نام بتایا تھا۔

''نام تو بہت خوب صورت ہے امی۔'' جواد نے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔

''نام کے ساتھ ساتھ بہت ہی گھریلو اور بہت سارے گنوں والی بچی ہے۔ میں نے تو دیکھتے ہی دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ اس چاند کو میں اپنے آنگن میں ہی اتاروں گی۔'' نسیمہ بیگم نے چائے کی ٹرے ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر نسیمہ بیگم جواد کا رشتہ لے کر گئیں اور ان لوگوں نے رسماً سوچنے کے لیے وقت مانگا پھر آناً فاناً بات طے پا گئی اور منتشا اپنے روپ کی چاندنی جواد کی زندگی میں بکھیرنے چلی آئی۔

نسیمہ بیگم اپنے گھر میں منتشا کو لا کر بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ جواد اپنی ماں کو دعائیں دیتے نہیں تھکتا تھا۔ کیونکہ منتشا نے بڑی محبت سے جواد کے گھر اور اس کی ماں کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔

☆.....☆

صداقت صاحب اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا اچانک ان کے موبائل پر کالنگ ٹون بجی ان کی آنکھ کھل گئی۔

''ہیلو۔'' صداقت صاحب نے کال ریسیو کرتے ہی استفسار کیا تھا۔

''جناب میں سول ہاسپٹل سے ڈاکٹر جنید بات کررہا ہوں۔ آپ حاشر صداقت کے والد بات کررہے ہیں؟'' ڈاکٹر جنید نے استفسار کیا۔

''جی جناب خیریت آپ نے اس وقت زحمت کی۔'' صداقت صاحب نے فکر مند لہجے میں استفسار کیا تھا۔ ان کے دل میں عجیب سی بے چینی نے ڈیرے جما لیے تھے۔

''آئم سوری صداقت صاحب آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔ آپ کے بیٹے کی ڈیڈ باڈی ابھی کچھ ہی دیر قبل ہاسپٹل آئی ہے۔ دو تین لاشیں ساتھ آئی ہیں۔ یہ لوگ کہیں ڈکیتی کرتے ہوئے مارے گئے ہیں۔ آپ آکر باڈی لے جائیں۔'' ڈاکٹر جنید نے صداقت صاحب کو اطلاع فراہم کی تھی۔ صداقت صاحب موبائل کان سے لگائے صدمے کی حالت میں ہی بیٹھے رہ گئے۔ صحیح کہتے ہیں قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی اولاد کو حرام کا نوالا کھلایا تو وہ کیسے صراط مستقیم کے راستے پر گامزن رہتی۔ وہ بھول بیٹھے تھے کہ وہ اپنے گناہوں کے دلدل میں دھنستے چلے جارہے تھے۔ دلدل کا کام زندگی دینا نہیں لینا بھی ہوتا ہے۔ دلدل سے انسان نکلتا نہیں بلکہ اس کے اندر دفن ہو جاتا ہے۔

.....☆☆☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گیارہویں حکایت

عورت کا دل

حسین خواجہ

مرد اور عورت کے دل سے جڑی اِک حکایتِ خاص

ایک بیوی شوہر کا ظلم و جبر تو برداشت کر سکتی ہے لیکن اس کی تقسیم قطعی طور پر برداشت نہیں کر سکتی۔

عورت کا دل بہت بڑا ہوتا ہے لیکن اس میں صرف اور صرف ایک ہی مرد کی جگہ ہوتی ہے جو اس کے لیے اول آخر ہوتا ہے جب کہ مرد کے دل میں ہمہ وقت دو چار کی گنجائش رہتی ہی ہے۔ بیوی جنت کی حور ہی کیوں نہ ہو لیکن کچھ مردوں کی نظریں پھر بھی کہیں اور ہی جا کر ٹھہرتی ہیں۔ مگر عورت کسی غیر مرد کی طرف دیکھے تو وہ آوارہ ہے اور اگر مرد کسی غیر محرم کی طرف دیکھے تو یہ اک عام سی بات ہوتی ہے عمل دونوں کا ایک جیسا بدنام صرف ایک عورت آخر کیوں؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

☆☆☆

میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور اس دوران معاشرتی طور پر یہ سیکھا کہ مردوں کی نگاہوں کا مقابلہ کیسے کرنا ہے۔ کبھی کبھی تو اپنے عورت ہونے پر بھی افسوس ہوتا تھا کالج لائف کی احمقانہ یادوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب میں نے کالج نیا نیا جوائن کیا تھا تو روز ایک لوفر میرے راستے میں کھڑا ہوتا تھا اس میں کچھ کہنے کی تو ہمت نا تھی پر مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ بالآخر تنگ آ کر اک روز میں اس کے پاس کھڑی ہو گئی اور اسے بالکل اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ مجھے دیکھ رہا تھا اس دوران میں نے محسوس کیا کے اس بیچارے کو اب پانی نہیں مل رہا کہ وہ ڈوب کر ہی مر جائے خیر اس دن کے بعد وہ نمونہ نظر نہیں آیا اور مجھے بری نگاہوں کا مقابلہ کرنا آ گیا اور میرا یہی فن میری بربادی کا سبب بنا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ آج سے دو سال پہلے میری شادی میرے پھوپی زاد کے ساتھ اس کی پرزور فرمائش پر ہوئی۔ الحمدللہ میرے میاں نوید کی سرکاری ملازمت اچھا گھر ہے گاڑی ہے اور تو اور تمام ضروریات زندگی دستیاب ہیں چاند سا بیٹا اور پیار کرنے والا شوہر پھپی فیملی میرا نہیں خیال کہ زندگی میں کسی چیز کی کمی تھی۔

☆☆☆

ہمارے گھر کے قریب ایک پارک تھا جب میری نئی نئی شادی ہوئی تو میں اور نوید اکثر شام کو پارک جایا کرتے تھے سب ٹھیک چل رہا تھا لیکن اب آ کر مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ اب مجھ پر نوید کی ذات کے وہ پہلو کھل رہے تھے جن سے میں پہلے واقف نہ تھی۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا جب نوید اوروں کی طرف دیکھتا تھا نوید کی اس حرکت کی وجہ سے میں جل جاتی تھی اور کبھی کبھار تو میں نوید سے پوچھ بھی لیتی تھی۔

''نوید کیا وہ مجھ سے زیادہ پیاری ہے''

تو اس پر نوید مجھے اور جلاتا اور کہتا کہ

'اب اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے' اور پھر نوید زور سے قہقہہ لگا دیتا۔

پھر میں موڈ خراب کر لیتی اور نوید مجھے منانے کی غرض سے آئسکریم لے آتا اور میں اتنے میں ہی راضی ہو جاتی۔ نوید میری ضروریات کے علاوہ میری خواہشات کا بھی بہت خیال رکھتا تھا میں یہ بات باخوبی سمجھتی تھی کہ نوید ذاتی طور پر بہت اچھا انسان ہے اور اپنی بیوی کو پیار کرنے والے مردوں میں سے اک ہے۔ میری زندگی کی حسین یادوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اک روز میں دوپہر کے وقت سو رہی تھی کہ میں نے محسوس کیا کے میرا ہاتھ نوید نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے جب میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو نوید نے کہا 'صرف ایک منٹ صبر کرو'

میں نے فوراً آنکھیں کھولی تو میں نے دیکھا کے نوید میرے ہاتھ پر مہندی لگا رہا ہے اب اس سے بڑی کر اور اس کی محبت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے اور جہاں تک دوسری خواتین کو دیکھنے کا سوال ہے تو یہ ہمارے معاشرے میں کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی مرد حضرات خواتین کو پیار بھری نگاہ سے دیکھتے رہتے ہیں۔

ایک روز شام کو میں اور نوید پارک میں واک کر رہے تھے کہ نوید اچانک رک گیا اور مجھے کہنے لگا۔

''شگفتہ! وہ عورت دیکھ رہی ہو جس نے بلیک سوٹ پہنا ہوا ہے۔''

''ہاں!''

پھر نوید نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اس کا نام کرن ہے اور وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی بہت اچھی عورت ہے۔ میں اس کو بہت پسند کرتا تھا لیکن امی نے غیر برادری میں رشتے سے انکار کر دیا اور پھر تم میری زندگی میں آ گئیں۔'' میں نے موڈ بناتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو پھر میں گھر چلتی ہوں آپ اس کا حال احوال پوچھ لو اس کے ساتھ آئسکریم کھا کر آ جا۔''

تو نوید نے شرارتی انداز میں کہا۔

''سچ۔''

خیر پھر میں غصے میں وہاں سے چل پڑی اور نوید بھی میرے پیچھے آ گیا آج گھر پر آ کر بھی میرا موڈ ٹھیک نہیں تھا میں آج نوید پر بہت برہم تھی۔

دوسری عورتوں کو دیکھنے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن میں نوید کے معاشقے نہیں سن سکتی تھی۔ گھر آ کر میں نے نوید سے کہا۔

''نوید پلیز آج کے بعد آپ نے مجھے پارک جانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے لیے فورس نہیں کرتا۔“

میں اندر ہی اندر جل رہی تھی کہ میرے دماغ میں اک شرارت سوجھی اور پھر میں نے دو چار دن بعد نوید کو بڑے رومینٹک انداز میں کہا

”نوید آج پارک چلیں؟“

تو نوید نے شرارتی انداز میں کہا۔

”اب اگر تم اتنا ہی اصرار کر لی ہو تو چلتے ہیں ویسے اس دن والا غصہ کہاں غائب ہو گیا۔“

تو میں نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

”نوید ہر انسان زندگی میں کسی نا کسی کو دل سے ضرور چاہتا ہے لیکن یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ سچا پیار لا حاصل ہی رہتا ہے اب اگر آپ اس کو پسند کرتے تھے تو اتنی سی بات پر مجھے حسد نہیں کرنا چاہیے تھا ویسے بھی یہ کوئی بڑی بات تو تھی نہیں ایسا تو عام طور پر چلتا ہے نا زمانے میں۔“

نوید نے میری بات کا تسلسل توڑتے کہا۔

”میڈم اگر آپ کا لیکچر ختم ہو گیا ہو تو چلیں؟“

اور پھر ہم پارک چلے گئے میرے دماغ میں شرارت یہ تھی کے مجھے جو مرد نوید سے بہتر لگا میں اس کے طرف اشارہ کر کے کہوں گی نوید وہ آدمی دیکھ رہے ہو آپ وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور وہ مجھے بہت پسند کرتا تھا میں بھی کچھ حد تک اسکو پسند کرتی تھی لیکن امی ابو نے آپ کو میرے لیے چنا...... اور پھر میں آج یوں نوید کو جلاؤں گی آج ہم نے معمول سے زیادہ سیر کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو مجھے نوید سے بہتر لگے اور پھر میں نوید کو اپنی فرضی داستانِ عشق سناؤں۔ لیکن ہائے افسوس کہ میری نظر میں کوئی نوید سے بڑھ کر دکھا ہی نہیں اور میں ناکام واپس لوٹ آئی لیکن میرے اندر بدلے کی آگ اب بھی تھی تو میں نے گھر آ کر ایسے ہی فرضی خدوخال پیش کر کے نوید کو اپنی داستانِ محبت سنا دی اور پھر میں تو سو گئی لیکن جب صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے سگریٹ والی ایش ٹرے فل دیکھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نوید ساری رات نہیں سویا میں نے نوید کو گڈ مارننگ کہتے ہوئے اس کے رخسار پر پیار کیا نوید نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے کہا۔

”نوید صاحب یہ عورت کا دل ہی ہوتا ہے جو اپنے شوہر کے معاشقے سن لیتا ہے۔ بھلا مرد میں یہ حوصلہ کہاں۔ میرے کردار پر کبھی شک مت کرنا۔ میری زندگی میں آپ سے پہلے کوئی مرد نہیں آیا۔“ نوید پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ کئی لمحے اسی حیرت و استعجاب میں گزر گئے۔ پھر نوید کے روکھے سوکھے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول ’تاشون‘ کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق و اثرات
سعادت و نحوست کا حساب، حیرت و تجسس پر مبنی ناول

تاشون

تحریر: شازی سعید مغل

برصغیر میں علمِ تسخیر کے بانی حضرت کاش البرنیؒ کی
عاملیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تصوف اور دوسری دنیا
کے تجربات و مشاہدات پر اسراریت کے نت نئے راز کھولتا ایک
سحر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش البرنیؒ ”بنام“

۴۵۰ صفحات

”تاشون“ ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کرا دیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر اپنا آڈر بک کروائیں۔
Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بارہویں حکایت

امتحان

سہیل خان

اُس شخص کی حکایت جسے زندگی کے ہر موڑ پر اِک نئے امتحان سے گزرنا پڑا تھا

میرا نام سہیل ہے۔ میں نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ یہ زندگی بھی میری کیا زندگی ہے جس نے ہر وقت مجھ سے مذاق کیا۔ آنکھ کھولنے کا سال تو یاد نہیں سنا ہے والدہ سے کہ 65ء کی جنگ ہو رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا مگر جب سے ہوش سنبھالا اس زندگی نے مجھے نت نئے رنگ دکھائے اور میرا امتحان لیتی گئی اور اتنے امتحان لیے کہ میں اس امتحان کو پاس کر کر کے تھک سا گیا ہوں۔ جب آنکھ کھولی تو بیمار باپ، ایک ماں اور دادی۔

میرا نمبر پہلا تھا۔ مجھ سے چھوٹی تین بہنیں اور ایک بھائی پھر ایک بہن تھی یہ تھا ہمارا خاندان۔

میرے والد کو ٹی بی جیسے مرض نے جکڑا ہوا تھا۔ یہ 1975ء کی بات ہے جب ٹی بی ایک لاعلاج مرض تھا میں نے دس سال کی عمر سے اسپتال کے چکر لگانا شروع کر دیے کیونکہ میرے والد بھی اپنے والدین کے آخری بیٹے تھے۔ ان کے سب بہن بھائیوں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے میرے والد کے سوا ہمارا کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سرپرست۔ جوان ماں جس کی عمر مشکل سے 26 سال کی ہو گی۔ ہم اپنے والد کا علاج کراتے رہے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ ہم ان کو کسی اچھے اسپتال میں داخل کرا سکتے کیونکہ میں چھوٹی سی عمر میں جو کچھ کما کر لاتا اس سے کھانے کا خرچا ہی پورا ہو جائے تو بڑی بات ہے، اتنی بڑی بیماری کا علاج تو ناممکن تھا۔ اسی لیے سرکاری اسپتال کے چکر لگاتے رہے اور آخر چھ سے سات سال تک والد اور ہم اس بیماری سے لڑتے رہے اور آخر والد صاحب زندگی ہار گئے اور جب مجھے کسی سہارے کی ضرورت تھی میں خود بے سہارا ہو گیا اور یوں اب ان سب کا بوجھ مجھ جیسے چھوٹے بچے کے کاندھوں پر تھا اور میں نے زندگی کا پہلا امتحان پاس کیا حالانکہ یہ ایک سخت پرچا تھا اور اس غم کو قسمت کا لکھا سمجھ کر پھر زندگی کی گاڑی کو آگے کھینچتا چلا گیا۔ جس میں میرا خاندان سوار تھا۔

آہستہ آہستہ میری زندگی جوانی کی طرف رواں دواں ہونے لگی۔

پھر مجھے سرکاری نوکری مل گئی۔ اس دوران میں نے دو بہنوں کی شادی کر دی اور 1986ء میں میری بھی شادی ہو گئی۔ پھر اللہ نے مجھے نازش کی صورت میں ایک بیٹی سے نوازا۔ پھر 1990ء میں میری دوسری بیٹی نایاب کی صورت میں پیدا ہوئی اور میرے گھر میں دو پریاں کھیلنے لگی۔ میری بیوی کی خواہش تھی کہ اللہ ایک بیٹے سے نواز دے تو گھر مکمل ہو جائے مگر اللہ نے مجھے 1992ء میں پھر دو جڑواں بیٹیوں سے نواز دیا اب میرے گھر ماشاء اللہ چار بیٹیاں ہو گئیں۔ میں ان کی پرورش اور اچھے مستقبل میں لگ گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زندگی میرا دوسرا امتحان بھی لے گی۔

میرا اکلوتا بھائی جو 21 سال کا تھا کینسر جیسے مرض میں مبتلا ہوگیا تو میرے اوپر پھر قیامت ٹوٹ گئی۔ جب ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کو کینسر ہے میں اپنا سب کچھ بھول کر اس کے علاج اور تیمارداری میں لگ گیا۔ میری، والدہ، میری بیوی، چھوٹی بہن سب کی توجہ اس کی بیماری کی طرف تھی اور رات دن اتنے بڑے مرض سے میرا پورا گھر لڑتا۔ میرا جوان بھائی جس تکلیف سے گزر رہا تھا وہ اللہ ہی جانتا تھا۔

ایک سال میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی تھی۔ میں نے اور پورے گھر نے رات دن اس کی صحت یابی کے لیے دعا کی مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

عشاء کا وقت تھا۔ میں نے نماز کے دوران جیسے ہی نیت باندھی میرے آنسو نہیں رک رہے تھے اور میں نے نماز کے دوران اللہ سے دعا کی رو رو کر کہ اللہ اس تکلیف سے بہتر ہے میرے بھائی کی تکلیف آسان کردے اور اپنی امانت واپس لے لے۔ میری یہ دعا فوراً قبول ہوگئی اور اللہ کے حضور سربسجود ہوکر جیسے ہی سجدے سے سر اٹھایا تو پتا چلا کہ میرے بھائی کا انتقال ہوگیا ہے اور میں یوں دوسرے پرچے میں بھی کامیاب ہوگیا۔

میں پھر ایک دفعہ پھر زندگی میں مصروف ہوگیا مگر میری زندگی پھیکی اور بے رونق ہوگئی اور میں اپنے گھر والوں اور بچوں کی خاطر اور ان کے مستقبل کی خاطر رات دن کام کرنے لگا۔ اس دوران مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے سے نوازا مگر کچھ دن کے بعد ہی پتا چلا کہ میرا بیٹا ایب نارمل اور معذور ہے۔

میری دادی اپنے جوان پوتے اور پڑپوتے کے غم میں پاگل ہوگئیں اور پھر زندگی نے میرا تیسرا امتحان لیا اسی دوران میں ایک بہن کی شادی کر چکا تھا اور پھر دو تین سال دادی کی تیمارداری اور خدمت میں گزر گئے اور اللہ نے اس پرچے میں بھی کامیاب کردیا اور وہ بھی اس دنیا سے چلی گئیں۔ دادی کے غم میں اپنے بچے پر زیادہ توجہ نہ دے سکا پھر میں نے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے رات دن ایک کردیے یہ میرا چوتھا پرچہ تھا اور شاید آخری پرچا ہو کیونکہ میرا بیٹا نہ تو بول سکتا ہے نہ چل سکتا ہے۔ آج ماشاء اللہ 17 سال کا بیٹا ہے اس کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہوں۔ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر واش روم لے جاتا ہوں۔

میں امتحان دیتے دیتے تھک گیا ہوں کیونکہ میں 50 سال کا ہونے والا ہوں کیونکہ جب میں بچہ تھا تو جوان باپ کو کاندھا دیا اور جب جوان تھا تو جوان بھائی کو کاندھا دیا اور جب بوڑھا ہوں تو جوان بیٹے کا سوچتا ہوں کیونکہ اللہ نے مجھے اپنے بچے کی خدمت کرنے کے لیے مجھے ہمت اور قوت عطا کی ہے۔ میں رات دن اس کی خدمت کرتا ہوں۔ جب مجھے بھی 1 سے 3 سال پہلے ڈینگی وائرس ہوگیا تھا اور میرے جسم میں ٹوٹل چھ ہزار وائٹ سیل رہ گئے تھے مگر اللہ نے مجھے بچے کی خدمت کے لیے دوبارہ زندگی دی ہے پتا نہیں یہ امتحان پاس کرسکوں گا کہ نہیں یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

بس آپ میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ مجھے میرے آخری امتحان میں بھی کامیاب کرے میں اپنے جوان بیٹے کی خدمت کرسکوں اور اللہ کی ذات سے امید ہے یہ امتحان بھی آخری زندگی کا پاس کرادے۔ انشاء اللہ۔

.....☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیرھویں حکایت

فراڈیے

شیخ معظم الٰہی

فیصل آباد کے اُن فراڈیوں کی کہانی جو اکثر اپنی کارستانیوں سے عوام کو لوٹتے رہتے ہیں

فیصل آباد میں ایک مارکیٹ ہے جو لاہور کی لبرٹی مارکیٹ کی طرح ہے وہ ''ڈی مارکیٹ'' کے نام سے مشہور ہے جو عموماً دن کے گیارہ بجے کھلتی ہے اور رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔ وہاں پر کپڑوں کی دکانیں، کھانے پینے کی دکانیں، جنرل اسٹورز اور موبائل وغیرہ کی دکانیں ہیں۔ ہر دکان خوب چلتی ہے۔

ہمارے بہت سے شہروں سے آئے ہوئے لوگ مزدوری تلاش کرنے کے لیے فیصل آباد آتے ہیں اور شہر کی مخصوص جگہ پر صبح کے وقت آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر جسے مزدوری کی ضرورت ہوتی ہے وہ آ کر وہاں سے اپنا مطلوبہ مزدور لے جاتا ہے۔ اس جگہ پر بہت سے لوگ مزدوری کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مزدوروں کو کئی کئی دن تک مزدوری کے بغیر ہی گھر لوٹ جانا پڑتا ہے۔

لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جوان مزدور کو کام کے لیے لے کر جائیں تاکہ اس سے زیادہ مشقت لی جا سکے۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر مزدوروں کو بغیر کام کے ہی واپس لوٹنا پڑتا ہے۔

ایک دن گھنٹا گھر (فیصل آباد) کے پاس فٹ پاتھ پر کچھ مزدور اپنی روزی روٹی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ وہاں پر ایک گاڑی آ کر رکی جس میں دو آدمی سوار تھے۔ ایک آدمی اس گاڑی سے اتر کر ان مزدوروں کے پاس آ کر کام کے بارے میں کہنے لگا کہ مجھے تین مزدوروں کی ضرورت ہے۔ وہاں بیٹھے ہوئے ہر ایک مزدور کی کوشش تھی کہ وہ آدمی اسے کام کے لیے اپنے ساتھ لے جائے مگر اس آدمی نے ان میں سے تین جوان مزدوروں سے اجرت وغیرہ طے کی وہ تینوں مزدور اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس آدمی نے تینوں مزدوروں کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈی مارکیٹ میں لے آیا اور ایک دکان کے سامنے اپنی گاڑی کھڑی کر کے ان مزدوروں کو اتار دیا پھر اس آدمی نے مزدوروں سے کہا کہ یہ دکان کا جو تھڑا ہے اسے آپ لوگ توڑ دو'' وہ موبائل کی دکان تھی۔

تینوں مزدور اس دکان کے تھڑے کو توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ کام صبح آٹھ بجے شروع ہوا۔ جب مزدوروں کو کام کرتے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تو پہلے آدمی (اشرف) نے جو انہیں لے کر آیا تھا اپنے دوسرے ساتھی (جاوید) سے اونچی آواز میں کہا کہ ''بھائی جاوید ذرا دکان کی چابی دینا میں نے دکان کو کھولنا ہے۔''

جاوید نے اپنی جیبوں میں سے چابی کو ڈھونڈنا شروع

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

کر دیا۔ چند منٹ کے بعد جاوید نے اشرف سے کہا کہ ''میں تو چابی گھر بھول آیا ہوں۔''

اس پر اشرف نے کہا۔ ''آپ گاڑی کی چابی مجھے دیں میں گھر سے دکان کی چابی لے آؤں۔''

اس پر جاوید نے کہا۔ ''تم اتنی دور گھر جاؤ گے اور پیٹرول بھی ضائع کرو گے تم ایسا کرو کہ ان مزدوروں سے کہو کہ وہ دکان کے تالے توڑ دیں۔''

لہٰذا اشرف نے مزدوروں سے کہا کہ وہ دکان کے تالے توڑ دیں۔ چنانچہ مزدوروں نے دکان کے تالے توڑ دیئے۔ اس کے بعد مزدور پھر تھڑا توڑنے میں مصروف ہو گئے۔ اشرف نے دکان کو تھوڑا سا کھولا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکل آیا اور دکان کو دوبارہ بند کر دیا۔ مزدور اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو چکے تھے۔ انہوں نے کسی قسم کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

جب مزدوروں کو کام کرتے کچھ اور وقت گزرا تو اشرف نے مزدوروں کو بلا کر پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ رقم مزدوری کے علاوہ ہے۔ آپ لوگ جا کر چائے وغیرہ پی لیں۔''

مزدور پانچ سو روپے لے کر بہت خوش ہوئے اور چائے پینے چلے گئے۔ ان مزدوروں کے جانے کے بعد دونوں بھائیوں نے فوراً اپنی گاڑی کو لا کر دکان کے آگے کھڑا کیا اور دکان کھول کر اندر چلے گئے اور سارے موبائل فون جن کی مالیت لاکھوں روپے تھی گاڑی میں رکھے پھر دکان کو بند کر دیا۔ اشرف وہاں کھڑا رہا اور جاوید گاڑی لے کر رفو چکر ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب مزدور واپس آئے تو اشرف نے ان سے کہا ''اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے جلدی جلدی ختم کرو۔ میں بھی ذرا چائے وغیرہ پی کر ابھی واپس آتا ہوں۔'' مزدور پھر کام میں مصروف ہو گئے اور اشرف بھی آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

اتنے میں وہاں ایک اور آدمی آیا جو غالباً اس دکان کا اصل مالک تھا۔ اس نے جب اپنی دکان کا تھڑا ٹوٹتے دیکھا تو وہ مزدوروں پر برسنے لگا کہ تم لوگوں نے میری دکان کا تھڑا کیوں توڑ دیا ہے اور یہ دکان کے تالے کس نے توڑے ہیں۔''

مزدوروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس آدمی سے کہنے لگے کہ جی! ہمیں اس دکان کے مالک نے کہا تھا کہ یہ تھڑا اور دکان کے تالے توڑ دو۔ چنانچہ ہم نے یہ تھڑا اور دکان کے تالے توڑ دیے۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''اس دکان کا اصل مالک تو میں ہوں۔''

مزدور گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر کہنے لگے کہ پھر وہ دونوں کون تھے؟ جو ہمیں اپنے اڈے سے یہاں لے کر آئے تھے۔''

دکان کے مالک نے دکان کو کھول کر دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ کیونکہ اس کی دکان سے لاکھوں روپے مالیت کے تمام موبائل غائب تھے۔ اس نے فوراً پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس جب آئی تو مالک دکان نے ان تینوں مزدوروں کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

پولیس نے ان تینوں مزدوروں کو گرفتار کر کے لے جا کر تھانے میں بند کر دیا۔ وہاں جب ان سے پوچھ گچھ ہوئی تو مزدوروں نے پولیس کو تمام واقعے سے آگاہ کیا۔ مزدوروں کا کہنا تھا کہ اب ہمیں کیا پتا تھا کہ وہ مالک تھے یا فراڈیے۔ انہوں نے ہمیں چائے پینے کے لیے پانچ سو روپے بھی دیے تھے۔

تھانے دار نے مزدوروں سے ان دونوں آدمیوں کا حلیہ اور گاڑی کا رنگ اور نمبر وغیرہ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ آدمیوں کا حلیہ اور گاڑی کا رنگ آپ کو بتا دیتے ہیں لیکن گاڑی کا نمبر ہمیں نہیں پتا کیونکہ ہم ان پڑھ لوگ ہیں، گاڑی کا نمبر کیا نوٹ کرتے۔ ہمیں تو خیال تک نہیں آیا کہ وہ دونوں بھائی اتنا بڑا فراڈ کریں گے۔ انہوں نے ہماری مزدوری بھی مار لی ہے جناب۔''

تھانے دار نے ان تینوں مزدوروں کا شناختی کارڈ نمبر اور نام پتا نوٹ کیا اور چھوڑ دیا مگر ان کی نگرانی جاری رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی ختم کر دی۔ ان دونوں بھائیوں کی تلاش ابھی تک جاری ہے۔

فیصل آباد کے دور دراز کے اندرونی کچھ علاقے مجرموں کی پناہ گاہیں ہیں جہاں پر فراڈ کرنے والے لوگ پناہ گزیں ہیں۔ وہ کبھی کبھی بڑے شہروں میں جا کر ایسی وارداتیں کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ پتا نہیں کہ وہ وارداتیں کر کے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا آج تک کہیں سراغ نہ مل سکا کہ وہ کہاں چھپ گئے ہیں یا کہاں پناہ لے رکھی ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

چودھویں حکایت

تربیت

نوشابہ نوش

اولاد کی تربیت اپنے اصولوں پر کرنے والوں کے لیے اِک آئینہ حکایت

کراچی سے ٹھٹھہ آنے والی بس دھابے جی روڈ سے نکلی تو اس نے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اچھے کپڑے زیب تن کیے ہوئے شخص سے زیادہ اچھا اس کا گورے رنگ کا بچہ تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' بہت دیر سے بچے کی پیاری باتیں سننے کے بعد وہ آخر کار پوچھ بیٹھا۔

''راجا۔'' بچے نے جواب دیا۔ ''آئی ایم راجا امتیاز علی بلوچ''۔

''آپ کا نام تو بہت پیارا ہے۔''

''آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟'' بچہ بہت ہوشیار تھا اور پھر اچانک بچے نے پوچھا۔ ''انکل میں اچھا ہوں یا میرا نام؟'' بچے کا یہ سوال سن کر وہ پہلے الجھ گیا لیکن پھر کہا۔

''دونوں۔''

''آپ تو چالاکی کر رہے ہیں۔'' بچے نے کہا تو اس کا باپ مسکرانے لگا۔

''یہ آپ کا بیٹا ہے؟''

''ہاں۔'' بیٹھے ہوئے شخص نے جواب دیا۔ ''اس کی عمر زیادہ نہیں لیکن میں نے اس کی تربیت پر زیادہ دھیان دیا ہے اور دیتا ہوں۔'' راجا کا باپ کہتا رہا۔ ''میں نے اس کے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پی اور نہ ہی کوئی خراب لفظ بولا ہے۔''

''یہ تو آپ بہت اچھا کر رہے ہیں۔''

''سرکار! انسان کو مکمل انسان بنانا بہت مشکل کام ہے۔''

''سچ کہا آپ نے۔ بچے کو سلجھا ہوا بنانے کے لیے اکثر گھر والوں اور والدین کو اپنی ہر خوشی ختم کرنی پڑتی ہے۔''

''سرکار! ضرورت بھی تو اسی بات کی ہے کہ یہ ہمارا آئندہ کل ہیں اور اس کے علاوہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ملک کو اچھی نسل دیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ ایک قومی جہاد ہے۔''

''واہ سرکار! خوشامد نہیں تو آپ واقعی وطن سے محبت کرتے ہیں۔'' ہمراہی نے کہا تو اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ بعد میں باتوں باتوں میں پتا چلا کہ بلوچ صاحب ٹھٹھہ کے ایک بینک میں سیکنڈ افسر تھے۔

بس جب گھارو پہنچی تو بہت سے لوگ کباب، چھولے، بوتلیں، شربت کے گلاس اٹھا کر بیچنے کے لیے دوڑتے ہوئے آئے۔ اسی طرح راجا نے اپنے والد کو شربت پینے کے لیے کہا لیکن والد نے منع کر دیا۔

''نہیں بیٹا یہ شربت نہیں رنگین پانی ہے جس میں سکرین ملا کر اسے میٹھا کیا گیا ہے۔''

''لیکن مجھے پیاس لگی ہے۔'' راجا نے بضد ہو کر کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

''یہ گندا پانی ہے۔ اس کے پینے سے نہ صرف تمہارا گلا خراب ہوگا بلکہ بیمار ہونے کا بھی خدشہ ہوگا۔''

''تو پھر مجھے بوتل پلائیں۔''

''یہ بوتلیں بھی سادہ ہیں۔'' بلوچ صاحب نے پھر انکار کیا۔ ''ہم گھر چل کر شربت پئیں گے۔''

''لیکن مجھے بہت پیاس لگی ہے۔'' راجا رونے جیسا ہوگیا۔

بیٹھے ہوئے مسافر سے بچے کا رونا دیکھا نہیں گیا جوس لے کر کھڑے ہوئے ایک بچے کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا اور بلوچ صاحب کو کہا۔

''سائیں یہ معصوم بچہ ہے، ضد کر رہا ہے تو چھوڑیں ناں۔ دو گھونٹ پینے سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔''

لیکن راجا کے والد کو یہ بات اچھی نہیں لگی روکھے لہجے میں کہا۔

''معاف کیجیے سائیں! یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ اس کی عادت خراب نہ کریں۔'' والد شاید بیٹے سے زیادہ ضدی تھا۔

''لیکن بھائی صاحب یہ اتنا چھوٹا بچہ.....''

لیکن بلوچ صاحب نے اس شخص کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''آپ کو پتا نہیں سائیں کہ بچہ مونچھ کے بال کی طرح ہوتا ہے جس کو جس طرف موڑو وہاں مڑتا ہے۔ آج اگر اس کی ضد پوری ہوئی تو کل کوئی بات نہیں مانے گا اس لیے.....''

بلوچ صاحب نے اپنی بات آدھی چھوڑ دی۔ سامنے بیٹھا مسافر شخص خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

''ہم تھوڑی دیر میں ٹھٹھہ پہنچ کر رس کا شربت پئیں گے۔'' بلوچ صاحب نے لاڈ کے ساتھ بیٹے کے گالوں پر پیار میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ناں راجا؟''

لیکن بچے نے جواباً اپنے چھوٹے ہاتھ کو اوپر کیا اور لعنت باپ کو دی تو بلوچ صاحب کا سر شاید اپنی ضد پر ماتم کرنے کے لیے نیچا ہوگیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آزمائش

مہرالنساء

اُس بنتِ حوّا کی حکایت، جس کی زندگی کے کچھ ایام تکلیف دہ ضرور تھے مگر پھر باقی زندگی راحت سے گزری

میرا تعلق کراچی کے ایک متوسط مذہبی گھرانے سے ہے۔ میں نے آنکھ کھولی تو ہمیشہ اچھا کھانا، پہننا ملا۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر ہوں۔ ہم تین بہنیں اور چار بھائی ہیں۔ ہمارے والدین انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ شروع کے حالات ذرا ناگفتہ بہ رہے لیکن والد صاحب کی محنت اور والدہ صاحبہ کے تعاون سے ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے ماشاء اللہ پانچ ریڈ میڈ گارمنٹ کے کارخانے بن گئے اور اسی دوران بڑے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوتی رہیں۔ میں نے کراچی یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور میری شادی ایک پنجابی فیملی میں ہوئی۔ یہاں سے میری کہانی شروع ہوتی ہے۔

میں نے شوہر کے گھر آ کر ملازمت بھی کی۔ میرے شوہر بھی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ زندگی نشیب و فراز کے ساتھ گزر رہی تھی۔ اللہ نے ہمیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ لوگ ہماری زندگی پر رشک کرتے تھے۔ ہم نے جلد ہی اپنا مکان کار وغیرہ خرید لی۔ لیکن کچھ حاسدوں کی ایسی نظر لگی کہ آہستہ آہستہ حالات نے پلٹا کھایا اور آہستہ آہستہ میرے شوہر کا غیر عورتوں میں انٹرسٹ بڑھ گیا اور آخر میرے شوہر نے چھپ کر دوسری شادی کر لی تب مجھے یہ پتا چلا لیکن یہ شادی نہ چل سکی اور بات طلاق پر ختم ہوئی۔ پھر دوست نما دشمنوں نے اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے ان کی شادی کرا دی۔

ایک بار پھر میری دنیا اجڑ گئی۔ میں بلڈ پریشر اور شوگر کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ میرے شوہر نے بچوں اور ذمہ داریوں کو نبھانا کم کر دیا۔ فاصلے بڑھتے گئے۔ لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر

میرے بڑے بیٹے نے میٹرک کے بعد تعلیم نہ جاری رکھی اور جاب کر لی۔ ظاہر ہے میٹرک پاس کی جاب کیا ہوتی ہے۔ بیٹی نے بھی اسکالرشپ پر BBA کر لیا اور اس کا ایک اچھے گھر میں رشتہ ہو گیا۔ چھوٹے بیٹے نے ڈاکٹر بننا تھا۔ لیکن حالات سازگار نہ تھے۔ اس نے مناسب سمجھا کہ پردیس جا کر تعلیم اور روزگار ساتھ ساتھ کرے اور ہم نے پلاٹ پر قرضہ لے کر اس کو باہر بھیج دیا۔ اسی دوران میرے شوہر جو کہ دوسری بیوی کے ساتھ تھے ان کو اچانک پتا چلا کہ انہیں گلے کا کینسر ہے اور وہ ایک سال کے اندر ہی اس بیماری میں فوت ہو گئے۔ اب تو میں سچ مچ اجڑ گئی تھی لیکن میری زندگی کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ میرے بڑے بیٹے کو روزگار مل گیا اور اس کی اچھی جگہ شادی ہو گئی۔ چھوٹا بیٹا شادی کر کے باہر ملک سیٹ ہو گیا اور اسی دوران ایک ایسا شخص جو کہ مجھ سے عمر میں کم تھا اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اس نے مجھے سہارا دیا اور اسی نے آخری وقت میں مجھے حج و عمرہ کرایا اور اس فرشتہ صفت انسان نے میری زندگی میں آ کر میری تمام خواہشات کو پورا کیا۔ میری ہر خوشی کا خیال رکھا اور اب میں ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہوں اور اللہ کا لاکھ شکر کرتی ہوں کہ کچھ وقت کے لیے آزمائش آئی تھی لیکن اب تمام برے وقت کا خاتمہ ہو گیا۔ میرے شوہر مجھ سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ بچے اپنی زندگی میں مگن ہیں جن کو دیکھ کر مجھے راحت ملتی ہے۔ قارئین کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ انسان کی نیت صاف ہو اور حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہو تو خدا ضرور راحت دیتا ہے۔ اللہ بڑا مہربان ہے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1).....مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2).....منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3).....اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عزیز بچو!

اللہ تم سب کو ایمان کی مضبوطی کے ساتھ صحت اور دنیا کی تمام خوشیاں عطا فرمائے..... نماز کی پابندی رکھنا اور درود شریف کے ورد کو اپنی زندگی کا لازمی جز و تصور کرتے رہنا..... دنیا کی زندگی ختم ہونے کے لیے ہے اور موت کے بعد اصل زندگی شروع ہوگی لہٰذا عقلمند وہ ہے جو، اس زندگی کی تیاری کرے جہاں کوئی کسی کا ساتھ نہ دے گا اور فیصلہ صرف اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ رجب کا مہینہ اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس بابرکت ماہ میں اپنے رب کو راضی کریں گے اور پھر رمضان کو اپنے درمیان پائیں گے۔ میں تم سب کو نصیحت کروں گا کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھو اور اس پر عمل بھی کرو..... کہ یہ رحل یا مخمل میں لپیٹ کر رکھنے والی کتاب نہیں ہے بلکہ مکمل ضابطہ حیات ہے..... سورۃ رحمٰن' سورۃ توبہ' سورۃ الم نشرح' سورۃ نور' سورۃ نساء روز پڑھو اور سمجھو کہ ہمارا رب کیا کہہ رہا ہے۔ اپنا رزق وافر رکھنا چاہتے ہو تو جائز ضرورت مندوں کو کھانا ضرور کھلاؤ۔ اپنی بچیوں کی شادی کی خواہش ہے تو دوسروں کی بچیوں کی شادی میں عزت نفس مجروح کیے بنا امداد کرو..... صحت چاہتے ہو تو بیماروں کی مدد کرو..... تمہارا اچھا عمل تمہیں شیطان اور شیطان جیسے لوگوں سے محفوظ رکھے گا..... اللہ تم سب کا حامی و ناصر ہو۔

□ ایم احمد بیگ۔ کراچی

o محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی میں گزشتہ 20 سال سے آپ کے دیے ہوئے وظائف استعمال کرتا رہا ہوں اور اس کے فوائد حاصل کیے ہیں۔ محترم مجھے نوکری کے لیے کوئی آسان سا وظیفہ عطا فرمائیں کہ میری دن کی نوکری ہو آج کل میں Power Eng. کا کورس کر رہا ہوں۔ بابا جی جسمانی کمزوری بھی کافی ہوگئی ہے۔ میں فجر کے بعد سورۃ رحمان کی تلاوت کرتا ہوں اور مغرب کے بعد سورۃ واقعہ کی تلاوت کرتا ہوں۔ رات کے کام کی وجہ سے دن میں سونے کی وجہ سے ظہر کی نماز قضا ہو جاتی ہے۔

☆ بیٹے احمد! اللہ تمہیں کامیابیاں عطا فرمائے۔ تم مجھے یاد ہو مگر شاید تم مجھے بھول گئے رابطے میں رہا کرو۔ جو پڑھ رہے ہو بہترین ہے۔ اللہ تمہیں جلد کامیابی عطا فرمائے گا بس چلتے پھرتے درود شریف بہت پڑھا کرو۔ تم خود بہت جلد مثبت تبدیلی محسوس کرو گے۔ اس کے علاوہ بیٹے صدقہ خیرات ضرور نکالا کرو۔ صدقہ روکنے سے رزق رک جاتا ہے۔

□ نظر علی برمانی۔ دادو

o محترم بابا جی السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے بابا جی میں آپ سے کئی بار رہنمائی لے چکا ہوں۔ آپ کے مجھ پر احسان ہیں۔ ان کے بدلے میں میں آپ کو دعائیں ہی دے سکتا ہوں۔ بابا جی رب العالمین آپ کو صحت و تندرستی اور لمبی عمر عطا فرمائے اور آپ کی ہر مشکل آسان فرمائے آمین۔ بابا جی میں آج بھی ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اس مسئلے کی وجہ سے میں کافی پریشان رہتا ہوں۔ بابا جی مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ طویل عرصے سے ایک تکلیف میں مبتلا ہیں۔ پہلے تو یہ تکلیف کبھی کبھار ہوتی تھی اور کچھ دنوں بعد ختم ہو جاتی تھی مگر اب کافی مہینے ہو گئے ہیں چار یا پانچ مہینے ہو گئے ہیں میری والدہ کی تکلیف ختم نہیں ہو رہی ہے۔

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121 - 35893122

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بابا جی تکلیف یہ ہے کہ میری ماں کے دماغ میں ہر وقت عجیب وغریب قسم کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ والدہ بولتی ہیں کہ انہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کے دماغ میں کوئی جنریٹر چل رہا ہے مطلب یہ کہ ایسی آوازیں ہوتی ہیں کہ جیسے دماغ میں بھونچال مچا ہوا ہے۔ کبھی بتاتی ہیں کہ عجیب و غریب قسم کی پرندوں کی آوازوں کی طرح ہوتی ہیں، کبھی سیٹیوں کی طرح کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ جس کی وجہ سے امی بہت بے سکون ہوگئی ہیں۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ یہ تکلیف بہت پرانی ہے غالباً شادی سے بھی پہلے کی ہے۔ امی نے اس کا بہت علاج کروایا ہے۔ تعویذ وغیرہ بھی بہت جگہوں سے لیے ہیں اور کافی عالموں' مولویوں اور تعویذ وغیرہ دینے والوں کے پاس گئی ہیں اور ہر جگہ سے امی جان کو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ بچپن سے ان کے دماغ پر کسی پری' دیو یا اسی قسم کی مخلوق نے قبضہ جمایا ہوا ہے اور اب یہ مخلوق ان کی جان نہیں چھوڑے گی۔ امی جان جہاں بھی تعویذ وغیرہ کے لیے آج تک گئی ہیں ہر جگہ سے اس کا ایک علاج بتاتے ہیں کہ اگر اس کا علاج ہوگا تو قلندر شہباز کے وسیلے سے ہوگا اور کہیں سے نہیں ہوگا۔ سب قلندر شہباز پر جانے کا مشورہ دیتے ہیں اس لیے اماں جان ایک طویل عرصے سے قلندر شہباز کے مزار پر حاضری دیتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی چار راتیں مسلسل وہاں پر رہتی ہیں اور اب امی جان بتاتی ہیں کہ تقریباً پندرہ سال ہوگئے تھے کہ وہ قلندر شہباز کے مزار پر حاضری دینے نہیں گئی تھیں اور اگر ایک دو بار گئی بھی تھیں تو چار راتیں وہاں پر نہیں رکی تھیں یعنی صبح کو جاتیں اور شام کو واپس آجاتی تھیں تو امی کا خیال ہے کہ اسی وجہ سے یہ تکلیف پھر سے شروع ہوگئی ہے یعنی وہ انجانی مخلوق پھر سے انہیں تنگ کر رہی ہے۔ بابا جی اس کا یہ مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اسی انجانی مخلوق کا مطالبہ ہی ہے کہ امی جان قلندر شہباز کے مزار پر حاضری دیتی رہیں ورنہ وہ مخلوق انہیں برابر اسی طرح تنگ کرتی رہے گی۔ بابا جی ابھی چار پانچ مہینے سے ماں کو یہ تکلیف ہے۔ اور ہم ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو میں انہیں قلندر کے مزار پر لے جاتا ہوں اور رات کو وہیں پر رکتے ہیں اور صبح کو واپس آجاتے ہیں اور کچھ ماہ پہلے امی وہاں پر چار دن تک بھی رکی تھیں۔ بابا جی اس بار یہ تکلیف امی کو بہت پریشان کر رہی ہے اور کافی مہینوں سے اس میں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا۔ اگر کہیں سے کوئی تعویذ لے کر امی کو پہناتے ہیں تو تعویذ پہننے کے فوراً بعد ان کی تکلیف بہت بڑھ جاتی ہے اور جب تعویذ اتارتی ہیں تو تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ یعنی جو مخلوق انہیں تنگ کر رہی ہے وہ چاہتی ہے کہ امی کوئی بھی تعویذ نہ پہنیں۔ اسی لیے امی جان کوئی تعویذ پہننے سے بھی گھبراتی ہیں۔ بابا جی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ امی جان کے ساتھ کیا معاملہ ہے یا انہیں کون سی مخلوق پریشان کر رہی ہے کوئی دیو ہے، پری ہے یا کوئی جن وغیرہ ہے پتا نہیں کیا مسئلہ ہے بابا جی امی کے کانوں میں بھی تکلیف رہتی ہے اور کبھی کبھی ان میں درد ہوتا ہے اور کانوں سے گند وغیرہ بھی بہتا ہے مگر دوا سے کانوں کی تکلیف میں افاقہ ہو جاتا ہے لیکن ان کے دماغ میں آوازیں ختم نہیں ہوتیں۔ امی جان باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز کا اہتمام بھی کرتی ہیں کبھی کبھی امی یہ بھی بتاتی ہیں کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑی ہوتی ہیں تو ان کے دماغ میں آوازیں بہت بڑھ جاتی ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ نماز ادا کرتی ہیں۔ بابا جی کچھ لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ دماغ کے کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ شاید اس کی دوا سے ٹھیک ہو جائے۔ لیکن امی جان سختی سے مشورہ رد کر دیتی ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ان کے دماغ پر کسی مخلوق کا قبضہ ہے اور یہ دوا سے نہیں بلکہ دعا سے ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بابا جی ہم پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ اگر کہیں سے تعویذ لے کر دیتے ہیں تو تکلیف بجائے کم ہونے کے اور بڑھ جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں بابا جی میری امی کی کیسی تکلیف ہے جو انہیں مسلسل پریشان کیے ہوئے ہے۔ ویسے تو امی جان بالکل ٹھیک لگتی ہیں۔ چلتی پھرتی بھی ہیں کام وغیرہ بھی کرتی ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ بستر پر پڑی رہتی ہیں لیکن بابا جی رات کو اس تکلیف کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آتی۔ ان کی بھوک ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ دلی سکون نہیں ہے جب انسان کا دماغ پرسکون ہوتا ہے تو انسان خود بھی پرسکون ہوتا ہے مگر جب دماغ میں بے تحاشا شور مچا ہوا ہو ہر وقت عجیب قسم کی بے ہنگم آوازیں آرہی ہوں تو وہ انسان کیسے پُرسکون اور خوش رہ سکتا ہے۔ اس لیے امی ہر وقت فکر مند رہتی ہیں اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پریشان نظر آتی ہیں اور مجھ سے ان کی یہ پریشانی نہیں دیکھی جاتی اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے رہنمائی لی جائے۔ بابا جی آپ ہی بتائیں کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اس کا کیا حل ہوسکتا ہے۔ میں نے سارے حالات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں کوئی بات مخفی نہیں رکھی اب آپ ہی ہماری رہنمائی کیجیے اور بابا جی امی جان قرآن شریف نہیں پڑھی ہوئی ہیں لیکن ذکر و اذکار کرتی رہتی ہیں۔ بابا جی امید ہے کہ آپ اس کا کوئی حل ہمیں بتائیں گے۔ اس دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کی ہر نیک تمنا پوری کرے آمین۔

☆ بیٹے نظر! تمہاری والدہ پر کوئی آسیب نہیں ہے تمہیں اُن کو نیورو سرجن کو دکھانا ہوگا اور اللہ انہیں مکمل شفا عطا کرے گا۔ میں بلاوجہ کسی کو نہیں کہتا کہ آسیب ہے یا اثر ہے کچھ لوگوں پر ہوتا ہے مگر تمہاری والدہ پر نہیں ہے۔ میری نصیحت مانو بھلا ہوگا۔

□ سکینہ ملک۔ ملتان

o بابا جی! آداب! آج میں پھر سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے تقریباً چھ سال پہلے اپنے گھر کے ایک پورشن میں ایک مڈل اسکول قائم کیا۔ شروع میں خود ہی اکیلی اس کو چلاتی تھی لیکن آہستہ آہستہ میں نے اور ٹیچرز رکھ لیں۔ قاری صاحب کا انتظام بھی کرلیا جو کہ بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں۔ جس علاقے میں میرا گھر ہے وہ لوئر آمدنی والا علاقہ ہے۔ لہٰذا فیس کی مد میں کوئی خاص رقم جمع نہیں ہوتی لیکن میں لالچی نہیں ہوں اس لیے جو آمدنی آتی تھی وہ کافی تھی یعنی ٹیچرز کو تنخواہ دینے کے بعد چھ، سات ہزار بچ جاتے تھے۔ لیکن پھر اچانک سے بچے اسکول سے ہٹنے لگ گئے کہ ہم فیس نہیں بھر سکتے اور آپ PEF کے ذریعے اسکول منظور کروالیں۔ میں نے اس سال کوشش کی لیکن مجھے گائیڈ کسی نے ٹھیک طریقے سے نہیں کیا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ جو اس سال پروجیکٹ آئے اس میں اپلائی کروں۔ آپ کوئی ایسی دعا بتائیں کہ میرا اسکول PEF کے ذریعے منظور ہوجائے۔ PEF کا اسکول منظور ہونے کی صورت میں میں اپنی امی کے گھر جو کہ میرے گھر کے سامنے ہے وہاں شفٹ ہوجاؤں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے اسکول کی تعداد میں اضافہ ہوجائے اور میرا اسکول PEF سے بھی منظور ہوجائے۔ میں اپنے اسکول کے یتیم اور ضرورت مند بچوں کو بغیر فیس کے پڑھاتی ہوں۔ جب سے بچے ہٹے ہیں میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔ بعض دفعہ تو ساری ساری رات جاگتے ہوئے گزر جاتی ہے لیکن نیند نہیں آتی۔ اب اسکول کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔ ذہنی طور پر مریض بن گئی ہوں۔ دل کرتا ہے کہ اسکول بند کردوں۔ آپ کوئی وظیفہ بتائیں جو کہ میں آسانی سے کرسکوں۔ میں چلتے پھرتے استغفراللہ اور الحمدللہ پڑھتی رہتی ہوں اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں فجر کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں لیکن کوئی اور نماز پڑھنے کا دل نہیں کرتا۔ بچوں کو کہتی ہوں وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن میرا دل نہیں کرتا۔ کوئی ایسا اسم بتائیں کہ میں اور میری فیملی پانچ وقت کی نمازی بن جائے۔ اللہ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ بیٹی سکینہ! اللہ تمہیں جلد کامیابی عطا فرمائے گا۔ بکثرت اللہ اکبر اور سبحان اللہ کا ورد کیا کرو۔ ہر نماز کے بعد 7 بار درود شریف ضرور پڑھو' بیٹی نماز کی پابندی کا بہت آسان طریقہ ہے۔ اپنے کام نمازوں کے وقت کے ساتھ طے کرو یعنی فجر کے بعد اسکول ظہر کے بعد کھانا عصر کے بعد بچوں اور تم پر توجہ، مغرب کے بعد شوہر کا انتظار اور تمہاری تیاری عشاء کے بعد تلاوت اور اچھی سی نیند۔ تم خود محسوس کروگی کہ دن کتنا خوبصورت گزرے گا۔

□ سعید احمد۔ گوجرانوالہ

o میں ریٹائر ہوگیا ہوں' اپنی نوکری کے دوران میں تو مکان نہیں بناسکا۔ جو تھا' وہ بھی بک گیا۔ اب بہت پریشان ہوں' قرضہ بھی بہت ہوگیا ہے۔ کوئی ایسا تعویذ دیں جس سے یہ میری پریشانی دور ہوجائے۔ مختلف عمل کرکے ناکام ہوچکا ہوں۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔

☆ بیٹے سعید! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ جو لوگ رزقِ حلال پر تکیہ کرتے ہیں' اُن سب کے حالات کم و بیش تمہارے جیسے ہی ہوتے ہیں لہٰذا فکر مت کرو۔ یہ بہت نصیب والوں کو روزی ملتی ہے۔ تم بکثرت یَا اَرحمُ الراحمین کا ورد کیا کرو اور بروز پیر کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کردیا کرو۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔ تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے آفس فون کرکے معلومات حاصل کرلو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

□ سدرہ۔خانیوال۔

☆ بیٹی سدرہ! کچھ کوتاہی تمہاری جانب سے بھی ہوئی ہے ورنہ حالات ایسا رخ اختیار نہ کرتے۔ زندگی بظاہر جتنی سہل نظر آتی ہے' حقیقتاً ہے نہیں۔ بعض اوقات بہت معمولی غلطیاں زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہیں۔ حالات اللہ کے سپرد کردو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 تسبیح توبہ استغفار کی پڑھ کر اپنے اوپر دم کرواور دُعا کرو۔ یہ عمل لگاتار ایک ماہ کرو۔ مجھے حالات سے باخبر رکھو۔

□ عامر۔لاہور۔

☆ بیٹے عامر! نمازِ فجر کے بعد ۷ بار آیت الکرسی پڑھ کر حصار باندھ لو اور دُعا کرو کہ تمہاری گمشدہ چیزیں مل جائیں۔ اگر یہ عمل فوراً کر لیتے تو نقدی اور انگوٹھی فوراً مل جاتی۔ حصار اس طرح باندھتے ہیں کہ آیت الکرسی پڑھ کر 7 بار سیدھے ہاتھ کی انگلی سے سر کے اوپر دائرے بناؤ۔ اگر اشیاء گھر کے اندر ہی ہیں تو ضرور مل جائیں گی۔

□ فرحت۔آزاد کشمیر۔

○ پیارے بابا جی! میں بہت دکھی عورت ہوں۔ جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ دکھ اور پریشانیوں سے زندگی گزاری اور اولاد کو پال پوس کر جوان کیا۔ میں خود اَن پڑھ عورت ہوں مگر تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھی لہٰذا دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ آج ایک بیٹا ریاض میں بہت اچھی نوکری پر ہے اور دوسرا ٹیکسٹائل انڈسٹری میں خوب نام کما رہا ہے مگر دونوں کے پاس میرے لیے کچھ نہیں۔ انہیں شرم آتی ہے مجھے ماں کہتے ہوئے۔ میں آج بھی اسی طرح محنت مزدوری کرتی ہوں اور انہیں بددعا بھی نہیں دے سکتی۔ مجھے بتایئے کہ میں کیا کروں کہ اب محنت مشقت نہیں ہوتی اور اتنا بھی نہیں کہ کوئی حلق میں دو بوند پانی ڈال دے۔ مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ زندگی میں سوائے چند دنوں کے سُکھ نصیب نہ ہوا؟

☆ عزیزہ فرحت.....! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ تمہاری اولاد کو ہدایت دے ورنہ وہ بہت دکھ اٹھائیں گے۔ آج جو رویہ وہ اپنی ماں سے رکھیں گے' کل ان کی اولاد بھی یہی سب کچھ کرے گی۔ ان کے حق میں دُعا کیا کرو۔ تمہارا خط ان لوگوں کے لیے بھی نصیحت آموز ہے جو لڑکے کی آرزو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ نصیحت کی ہے کہ صالح اور نیک اولاد کی دُعا کرو۔ بہرحال عزیزہ! تمہاری آزمائش کے دن اب پورے ہوئے۔ اب تمہاری اولاد کو بے انتہا سخت زندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ نمازِ فجر اور نمازِ عشاء کے بعد سورۃ مائدہ آیت ۲۔۳' ۴۱۔۴۱ بار پڑھو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ مجھے ۴۱ روز کے بعد مطلع کرو۔

□ عصمت۔گجرات۔

☆ بیٹی عصمت! انسان ہمیشہ اپنی غلطی کا خمیازہ ہی بھگتتا ہے۔ ہم اپنی ہی حرکتوں سے رسوا ہوتے ہیں اور عزت بھی پاتے ہیں۔ تم زندگی کے کچھ اصول بناؤ۔ ہر لڑکیاں تو ویسے بھی بلاوجہ بازاروں میں نہیں گھوما کرتی ہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ گھر کے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھو پھر پوری توجہ اپنی تعلیم کو دو۔ تم جانتے بوجھتے گہری کھائی کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اب کسی صورت میں اس لڑکی کے ساتھ کہیں نہ جاؤ بلکہ ترک تعلق کرلو۔ نمازِ عصر کے بعد سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۵' ۷ بار پڑھو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ عدینہ۔لاہور۔

☆ بیٹی عدینہ.....! تم نے وہ تمام حدود پھلانگ لی ہیں جن کا تصور ایک اچھے گھر کی لڑکی کبھی نہیں کرسکتی ہے۔ کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں ہے مگر اس حد تک آگے بڑھ جانا کہ شرافت اور بے ہودگی کا فرق مٹ جائے' نہایت افسوس ناک ہے۔ تم صرف نماز کی پابندی رکھو اور اپنے گناہ پر پشیمان ہو کیونکہ جو تم چاہتی ہو وہ اب ممکن نہیں۔ تمہیں جواب اس لیے دے رہا ہوں تاکہ دوسری بچیاں سبق حاصل کرسکیں۔

□ اریبہ۔اسلام آباد۔

☆ بیٹی اریبہ! تمہارا مسئلہ طوالت اور مصلحت کے تحت شائع نہیں کیا جارہا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اس مشکل وقت میں تمہاری مدد کرے۔ نمازِ فجر اور عصر کے بعد ۱۲۱۔۱۲۱ بار پڑھو اور حاجت بیان کرو۔

مَاشَاءَ اللّٰہُ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ

جو لوگ اللہ پر بھروسا رکھتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

□ بخت جان۔ پشاور۔

☆ بیٹی! تمہارے گھر کا مسئلہ نہایت سیدھا سادہ ہے۔ جب کوئی والدین اپنی بیٹی کو بمعہ سامان رخصت کرتے ہیں تو وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ جہاں بیٹی جائے' وہاں سامان رکھنے کی کم از کم جگہ تو ہو۔ تم لوگوں کی اگر فی الحال حیثیت نہیں ہے تو لڑکی کے گھر والوں کو صاف صاف بتا دو اور ان کو کہہ دو کہ آپ بھی سوائے بیٹی کے' ہمیں کچھ نہ دیں۔ اس طرح معاملہ افہام و تفہیم سے طے پائے گا۔ گھر لوگوں سے ہوتے ہیں' سامان سے نہیں۔ والدہ سے کہو کہ نمازِ عشاء کے بعد سورۃ الاسراء آیت نمبر ۲۰' ۱۰۱ بار پڑھیں اور حاجت بیان کریں۔ مدت ۲ ماہ ہے۔

□ آمنہ۔ خیر پور

o محترم بابا جی! میں پہلے بھی آپ کو خط لکھ چکی ہوں' اب تو میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے ہر وقت گندگی کا خیال آتا ہے' میں آپ کو بتا نہیں سکتی' میں کتنی اذیت میں ہوں۔ آپ میرا حساب لگائیں اور بتائیں' مجھ پر کیا سایہ ہو گیا ہے؟ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں اپنے آپ کو کسی حصار میں محسوس کرتی ہوں۔ میرے دماغ پر کسی کا قبضہ ہے' میں گند اور غلاظت کے خیال سے تنگ ہوں۔ بابا جی! میں یتیم ہوں اور اب اللہ کے بعد صرف آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ اللہ والے ہیں۔ برائے کرم میری مدد کریں۔ میں گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہوں' گھر سے باہر نہیں نکلا جاتا جبکہ میرے گھر کا ماحول بہت خراب ہے۔ مہربانی کر کے میری پریشانیوں کا حل بتا دیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور نیک کام کا اجر دے۔

☆ بیٹی آمنہ! ہر وقت باوضو رہو۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کیا کرو اور جس قدر ممکن ہو' یَا نُوْرُ کا وِرد کرو۔ انشاء اللہ' ضرور کرم ہو گا۔

□ عائشہ جمال۔ کراچی۔

o بابا جی! السلام علیکم! میری بھانجی کی شادی کو چار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اُس کے سسرال والے امریکا میں رہتے ہیں۔ پہلے بھانجی کے میاں کا پاسپورٹ نہیں بنا تھا' اب ۱ سال کا عرصہ گزر چکا ہے' اسے پاسپورٹ ملے لیکن پھر بھی اس کا ویزا نہیں لگ رہا۔ بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ میری بہن بہت پریشان ہے کہ بیٹی بیاہ کر بھی اسی کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ عزت سے اپنے گھر جائے تو بہن بھی سکون کا سانس لے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ خدا کے لیے کوئی تعویذ دیں کہ یہ جلد سے جلد اپنے میاں کے پاس چلی جائے۔ نہیں اس پر کوئی عمل تو نہیں چل گیا؟ تعویذ ہم جلد منگوانا چاہتے ہیں۔

☆ بیٹی عائشہ.....! خوش رہو۔ بے شک یہ بہت کڑا وقت ہے مگر ہمت رکھو' گزر جائے گا۔ نمازِ فجر کے بعد اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو باجرہ اور دانہ ڈالو۔ جس قدر ممکن ہو' آیت الکرسی ضرور پڑھا کرو اور بعد نمازِ عصر بروز پیر کچھ رقم ضرور خیرات کرو۔ اللہ جلد کرم فرمائے گا۔

تعویذ کیلئے سچی کہانیاں کے آفس فون کر کے معلومات حاصل کرلو۔

□ اقراء۔ چمن۔

o بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضرؑ عطا فرمائے۔ جس طرح آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں' مہربانی کر کے میرے مسائل کا حل بھی بتا دیں جس سے میری کچھ پریشانی کم ہو۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری اکلوتی بیٹی کو دو سال پہلے بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔ اب اس کا علاج جاری ہے۔ اس کے لیے کچھ بتائیں۔ اللہ تعالیٰ اُس کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ مجھ کو بھی بلڈ کی شکایت ہے' میرے بلڈ کے ایک سیل صحیح کام نہیں کرتے کیونکہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں جس کی وجہ سے میں دوسرا بچہ بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسی دُعا بتائیں کہ جس سے بلڈ کے سیل صحیح کام شروع کر دیں۔ بابا جی! ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ ہم پر جادو کرایا ہوا ہے اور بابا جی! میرے شوہر کے لیے بھی دُعا کریں کہ اُن کو بہترین جاب مل جائے کیونکہ ہمارے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔ اللہ ہم کو اپنا گھر بھی عطا کرے۔ بابا جی! مجھے مسوڑھوں کی تکلیف ہے' علاج بھی کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی بھی کوئی دُعا بتائیں کہ دانت نہ خراب ہوں اور مسوڑھے مضبوط ہو جائیں۔ بابا جی! مجھے کوئی تعویذ یا کوئی وِرد بتا دیں جس سے پریشانیوں سے نجات حاصل ہو اور میرے خط کا جواب ضرور دیں۔ بابا جی! ہر کام میں رکاوٹ کا سامنا ہوتا ہے' میری مدد کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

☆ بیٹی اقراء! اللہ تمہیں اور بچی کو مکمل صحت دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔

□ زریں خان۔لندن

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! سدا سلامت رہیں۔ (آمین!) آپ کی خیریت خداوندِ کریم سے نیک چاہتی ہوں۔ بہت عرصے کے بعد آپ سے رابطہ کر رہی ہوں جس کے لیے شرمندہ ہوں۔ بابا جی! بس اپنی پریشانیوں' فکروں میں گھری رہی ہوں۔ پانچ سال پہلے یہاں پر قانونی طور سے اپنے شوہر سے علیحدہ کونسل کے گھر میں شفٹ ہوگئی تھی۔ میری ساس نے میرا اور میرے بچوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ پتا نہیں' کہاں کہاں سے جادو ٹونے کروا کے لاتی تھی؟ مجھ پر جادو کروایا۔ میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا کہ وہ بہتر انصاف والا ہے۔ مجھے گورنمنٹ کا گھر ملا ہوا ہے۔ بینیفٹ پر گزارہ اچھا ہو رہا ہے۔ شوہر اکثر بچوں سے ملنے آتا ہے۔ شوہر کے گھر میں اس کی ماں اور بہنیں رہتی ہیں۔ میں نے سکون کی خاطر اپنا گھر یاران کے حوالے کر دیا' پر اب بھی وہ لوگ مجھے چین سے نہیں رہنے دیتے۔ بابا جی! میں کیا کروں' کہاں جاؤں؟ گھر میں اپنی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں ہیں' کبھی بچے بیمار' کبھی میں بیمار' میں بہت پریشان ہوں' رات کو سکون سے سو نہیں سکتی' جو تھوڑی نیند آتی ہے' بہت ڈراؤنے خواب دیکھتی ہوں۔ اکثر کتوں کو دیکھتی ہوں۔ بابا جی! حال ہی میں مجھے بینیفٹ آفس سے خط آیا ہے کہ میری کسی نے چغلی لگائی ہے کہ میں فراڈ کر رہی ہوں۔ اس وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ ہمارا گزارہ بینیفٹ پر ہو رہا ہے' ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔ بابا جی! برائے مہربانی میرے لیے میرے حق میں دُعا کریں کہ یہ معاملہ میرے حق میں ہو اور استخارہ کر کے مجھے اس کا حل بتائیں تاکہ جس نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے' اس کو بھی پتا چلے کہ وہ غلط ہے۔ مجھے آپ کی دُعاؤں کی بہت ضروری ہے اور آپ کے جواب سے مجھے بہت حوصلہ ہوگا۔

☆ بیٹی زریں! خوش رہو۔ پریشانیاں آتی جاتی ہیں' یہ سب وقتی ہے۔ انشاء اللہ' سارے مسائل حل ہوں گے۔ بس صدقہ خیرات خوب کیا کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔

□ انعمتی۔ملتان۔

○ بابا جی! السلامُ علیکم! میرا مسئلہ وہی ہے جو آج کل بہت عام ہے یعنی ''شادی''۔ عمر کی 32 بہاریں دیکھ چکی ہوں۔ قبول صورت' پڑھی لکھی لڑکی ہوں مگر لوگ خوب صورت کی ڈیمانڈ کرتے ہیں اور پھر یہ کہ ہمارے ہاں برادری سے باہر بھی شادی کا رواج نہیں۔ والدین حیات ہیں۔ اس پر بھی بھائیوں کا رویہ ابھی سے بہتر نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا رب مجھ سے کس بات پر ناراض ہے؟ میں تو اپنے رب سے بہت معافی بھی مانگ چکی ہوں پھر سمجھ نہیں آتا کہ میرا رب اپنی رحمتوں کے دروازے مجھ پر کیوں نہیں کھول رہا؟ الحمدُ للہ' زندگی میں کبھی ایسا کچھ نہیں کیا جس پر پشیمانی ہو۔ بس میں کبھی کبھی اپنی والدہ پر غصہ کر جاتی ہوں' وہ بھی بہت frustrated ہو کر۔ اب بس آپ سے درخواست ہے کہ شادی کے لیے کوئی مؤثر تعویذ روانہ کر دیں۔

☆ بیٹی ترنم! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف پڑھو۔

□ کنول۔ساہیوال۔

○ محترم بزرگ! السلامُ علیکم! محترم! میں بہت پریشانی اور بے بسی کے عالم میں آپ کو مخاطب کر رہی ہوں۔ میں دس سال سے ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں' وہ بھی مجھے بہت پسند کرتا ہے' یہ کوئی وقتی جذبہ نہیں ہے ورنہ ہم ایک دوسرے کے انتظار میں دس سال نہ گزارتے۔ وہ لوگ غریب ہیں مگر لڑکا نہایت شریف اور پنج وقتہ نمازی ہے۔ اس کے والدین اس رشتے پر دل و جان سے راضی تھے مگر میرے والدین رضامند نہیں تھے۔ وہ مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتا رہا مگر میں نے اس کو روکے رکھا کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ میرے والدین مان جائیں گے۔ نماز' روزے کی تو میں شروع سے ہی پابند ہوں۔ میں نے اس مسئلے کے لیے بہت وظائف کیے۔ پانچ سال کے عرصے کے بعد میرے والدین نیم رضامند ہو گئے مگر اچانک اس کی والدہ اور بہن نے انکار کر دیا۔ میں بہت روئی۔ خدا سے پھر امید لگائی۔ وہ لوگ رشتے کی بات کرنے آئے مگر میری والدہ گھر پر نہیں تھیں۔ وہ پھر آنے کا کہہ کر گئے مگر دوبارہ نہیں آئے۔ اب جب سے یہی سلسلہ چل رہا ہے' کبھی میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

والدین راضی ہوتے ہیں تو وہ لوگ نہیں آتے' کبھی وہ لوگ راضی ہوتے ہیں تو میرے والدین رضامند نہیں ہوتے' کبھی اپنے گھر والوں کے راضی ہونے کی دعا کرتی ہوں' کبھی اس کے گھر والوں کی۔ بیچ کا عرصہ جس طرح میں نے گزارا' وہ میں ہی جانتی ہوں۔ کبھی اس کی ترقی کی دعا' کبھی اس کا ساتھ پانے کی دعا۔ بات بن جاتی ہے مگر اچانک ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ خدا کے واسطے اس سلسلے میں میری مدد کریں' ہمیشہ شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی کنول.....! تمہارا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ تم جو چاہ رہی ہو وہ بظاہر ممکن نظر نہیں آ رہا ہے۔ بہرحال نماز پابندی سے ادا کرو اور سورۃ مزمل بہت پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔ فوراً تعویذ کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر سے معلومات حاصل کر کے تعویذ لے لو۔

□ عالم۔ گوجر خان

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ مسئلہ میرے چہرے کے دانوں کا ہے' بہت سی جگہوں پر بھی دکھانے سے افاقہ نہیں ہوا آپ جو چہرے کے دانوں اور داغ دھبوں کی دوا تیار کرتے ہیں' مجھے ارسال کر دیں۔ دوا بھیجنے کا طریقہ کار اور ہدیہ مجھے جوابی لفافے میں بھیج دیں۔

☆ بیٹے عالم! چہرے کے لیے میں دوا تیار کر دوں گا۔ اس کے لیے مجھے جوابی لفافہ مکمل پتے کے ساتھ ارسال کرو۔

□ علی رضا۔ ژوب۔

○ جناب عالی! السلام علیکم! عرض یہ ہے کہ آپ کا لیٹر ملا۔ آپ نے درود شریف پڑھنے کے لیے اور یسار حمن کا ورد کرنے کو کہا۔ آپ نے سوتے وقت ایک گلاس گرم دودھ اور دو کھجور کھانے کو کہا۔ بادام کا حلوہ بھی۔ یہ سب عمل کر رہا ہوں۔ مجھ میں طاقت آ گئی ہے لیکن میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ مجھے دودھ سے متلی ہوتی ہے۔

☆ بیٹے علی! خوش رہو۔ اللہ تمہیں مکمل صحت عطا فرمائے۔ علاج تو جاری رکھو۔ دن میں تھوڑی سی سونف ضرور کھا لیا کرو۔ علاج جاری رکھو۔

□ سونی۔ کھاریاں۔

○ بابا جی! السلام علیکم! پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھوں میں بہت درد اور جلن محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی پانی بھی بہتا ہے۔ آنکھوں کی بینائی بھی کچھ کم ہے۔ آنکھ میں اگر کچھ پڑ جائے تو بے حد تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ نسخہ بتائیے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پیشاب بہت آتا ہے اور جب آتا ہے تو بہت رک رک کر آتا ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا حل نسخوں اور کلام الٰہی کے ذریعے ضرور بتائیے گا۔ آپ کی بہت شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی سونی! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ بیٹی! روزانہ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ رحمن پڑھو اور پانی کی بڑی بوتل پر دم کر لو۔ یہ پانی دن بھر میں پی کر ختم کر لو۔ یہ عمل پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ آنکھوں کے لیے بہت مؤثر علاج تحریر کر رہا ہوں۔ چھوٹی ہڑ رات کو کاٹ کر پانی میں بھگو دو' تقریباً ایک پیالی پانی اور تین چھوٹی ہڑ۔ صبح اٹھ کر روئی اس پانی میں بھگو دو اور اس سے آنکھیں صاف کرو اور دو دو قطرے آنکھوں میں ڈال لو۔ یہ عمل کرتے وقت بسم اللہ ضرور پڑھو۔ انشاء اللہ مکمل شفا ہو گی۔

□ فیصل۔ کراچی۔

☆ بیٹے فیصل! یاد رکھو مذہب میں سختی نہیں ہے۔ اگر بھول چوک ہوئی ہے تو وہ تمہارا رب ہے معاف فرمائے گا۔ اطمینان کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو۔

□ احمد۔ لاہور۔

☆ بیٹے احمد! عمل جاری رکھو۔ بس اس میں ایک چیز کا اضافہ کر لو کہ تیز تیز قدموں سے چہل قدمی ضرور کیا کرو۔ بھنے چنے بہت فائدہ مند ہیں۔ اپنا بہت خیال رکھو۔ انشاء اللہ مکمل شفا ہو گی۔

□ کوکب۔ ڈیرہ مراد جمالی۔

○ بابا جی! السلام علیکم! آپ بالکل خیریت سے ہوں گے اور مزید خیریت کی دعا جاری ہے۔ بابا جی! عرض یہ ہے کہ چند سال گھر کے حالات بہت خراب تھے۔ والدین کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہ تھا لہٰذا مجھے ٹینشن ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ساتھ بھی کافی سارے مسائل تھے۔ خواب بھی بہت ہی عجیب و غریب دیکھتی تھی پھر اخبار میں کسی (عالم) کا اشتہار دیکھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہ (فی سبیل اللہ) اپنے مسائل کا حل معلوم کریں اور پھر میں نے رابطہ کیا۔ وظیفہ اس نے دیا۔ یہ وظیفہ کرنے سے ہر رات انتہائی ڈرکی ایسی کیفیت ہوتی کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے وظیفہ بند کیا تو اس نے خوب ڈرایا' دھمکایا اور غصہ کیا کہ بڑا نقصان اٹھاؤ گی لیکن میں نے بند کر دیا کہ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔ کیا میں آپ کے وظیفے کے ساتھ ''انمول خزانہ'' وہ دعائیں جو میں فرض نماز کے بعد پڑھتی ہوں' ملا کر پڑھ سکتی ہوں یا ان دعاؤں کو چھوڑ دوں؟ یہ میرا تقریباً پانچواں یا چوتھا مہینہ ہے کہ میں ان دعاؤں کو پڑھ رہی ہوں۔ میری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔

☆ بیٹی کوکب! بارہا سمجھا چکا ہوں کہ جو لوگ غیر محرموں سے مل رہے ہیں' وہ درست نہیں مگر تم لوگ یہ بات سمجھتے ہی نہیں۔ مجھے تفصیل سے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔ یہ مسئلہ اتنا سہل نہیں۔ میں مکمل علاج کروں گا۔

□ بیلا۔ چنیوٹ۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں بہت پریشان حالی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ بابا! پتا نہیں' کہاں مجھ سے غلطی ہوگئی؟ میں نے آج تک نہ کسی کا برا کیا نہ برا سوچا۔ میں نے اپنے سسرال والوں سے بے تحاشا محبت کی۔ اپنے سسرال والوں کا پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ بابا جی! جب میرے شوہر رات کو روز دیر سے آنے لگے تو میں نے اُن سے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ ''کہیں گھومنے نہیں جاتا ہوں۔'' وہ مجھے بری طرح جھڑک دیتے تھے۔ آپ کو خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر رہی ہوں۔ میرا گھر ٹوٹنے سے بچالیں۔ آپ دعا کریں' میرے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ مجھے لینے آجائے۔

☆ بیٹی بیلا! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جو تمہارا مسئلہ ہے' وہ آج کل تقریباً ہر گھر کا ہے۔ اس کی وجہ ہے' ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی۔ سخت رویئے یقیناً دکھ دیتے ہیں مگر بیٹی! تم اپنے آپ کو مصروف رکھو' شوہر کو جو کر رہا ہے' کرنے دو' وہ خود راہِ راست پر آئے گا۔ تمہارا رونا پیٹنا اس کو اور ضدی کر دے گا۔ تم صرف اللہ سے مدد مانگو اور یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں۔ رسّی بہت کھینچنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ڈھیل دو اور خاموشی رکھو۔ سورۃ یٰسین ضرور پڑھا کرو۔ کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!
اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔
☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔
☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
☆ اگر آپ دانتوں کی گوناگوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔
☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔
آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

II C-88۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حکمت والا قول

ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ بازار میں چلے جارہے تھے کہ اچانک انہوں نے کسی کو بہترین قسم کے خربوزے فروخت کرتے دیکھا۔ ان کے دل میں خربوزے کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ نفس نے ان سے کہا کہ کسی رشتے دار سے قرض لے کر خربوزے خرید لو، چنانچہ آپ اپنے ایک رشتے دار کے پاس پہنچے لیکن قرض مانگنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپ نے سوچا، کہیں یہ قرض دینے سے انکار نہ کردے۔ نفس پکارا۔ ''اگر اس سے قرض لینا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے سے لے لو۔'' آپ کو اس کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ نفس پھر پکارا کہ چلو، کسی ایسے رشتے دار سے لے لو، جو بہت قریبی ہو اور انکار نہ کرے' شیخ سعدیؒ اب اپنے نفس سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''تم سے زیادہ قریبی رشتے دار میرا کون ہوسکتا ہے؟ آج تم ہی مجھے ادھار دے دو'' اور یوں وہ خربوزے خریدے بغیر ہی چلے گئے۔

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

محمد علی جناح

☆ جناح بحیثیت قانون داں عظیم تھے، ایک وقت میں کانگریس کے ممبر کے طور پر بھی عظیم تھے۔ مسلمانوں کے رہنما کے طور پر بھی عظیم تھے۔ عالمی سطح کے سیاست داں اور مدبر کے طور پر بھی عظیم تھے' لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم عملی انسان تھے۔ جناح کی رحلت کے باعث دنیا عظیم ترین مدبرین میں سے ایک اور پاکستان اپنے بانی، فلاسفر اور رہنما سے محروم ہوگیا ہے۔ (مائی برادرز'' مولفہ: محترمہ فاطمہ جناح)

☆ جناح تاریخ کی سب سے زیادہ غیر معمولی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ (جواہر لال نہرو)

☆ میں اپنی زندگی میں جتنے بھی لوگوں سے ملا ہوں، ان میں عظیم ترین جناح ہیں۔ (سر سلطان محمد آغا خان سوم)

☆ جناح صرف ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا مین اس صدی کی ایک انتہائی غیر معمولی شخصیت ہیں۔ (ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو)

حسنِ انتخاب: خضر حیات۔ روڈہ تھل

حواس خمسہ کیا ہیں؟

پانچ حواس ہیں، جو دماغ کو ہر قسم کی معلومات پہنچاتے ہیں اور پھر آپ کا دماغ مختلف فیصلے اور ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ انگریز میں "sense" کہتے ہیں اور چونکہ ہر انسان میں پانچ حواس ہوتے ہیں، اس لیے انہیں ''حواس خمسہ'' (Five Senses) کہا جاتا ہے۔ ان حواس خمسہ میں دیکھنے کی حس، سننے کی حس، چکھنے کی حس، سونگھنے کی حس اور چھو کر محسوس کرنے کی حس شامل ہیں۔

زورِ قلم۔ ایم یعقوب احمدانی۔ ڈیرہ غازی خان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گواہ

ہماری محبت کی بس اتنی ہے کہانی
جیسے جھیل کنول میں بہتا پانی
نین سے جب ملے نین
بے قرار دل کو آ گیا چین
آنکھ ملی دل ملے اور ہم ملے
یوں ہی چلتے رہے پیار کے سلسلے
عہد و پیماں ہوئے
جینے مرنے کے وعدے ہوئے
ہم اڑتے رہے افق کے پار
بادلوں کے ٹکڑے چلے بن کر قطار
یہ نیلا گگن یہ پیار کی دھرتی
ہمارے پیار کی بنی ہے گواہ

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

یونیورسٹی

کہتے ہیں' جب کسی کالج کی انتظامیہ اس میں دلچسپی لینا بند کر دے تو وہ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ ویسے بھی کالج اور یونیورسٹیاں تو اس لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگوں کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ امریکی صدر روز ویلٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی بندہ کبھی اسکول نہیں گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ مال گاڑی کی بوگی ہی چرا سکتا ہے لیکن جو یونیورسٹی گیا ہو تو وہ پوری ریل کی پٹڑی ہی چرا لے گا اسی لیے ہمارے طلباء یونیورسٹی میں دل لگا کر پڑھنے کے لیے دل لگانے میں لگے رہتے ہیں تاکہ پھر پڑھ سکیں۔ آخر میں تعلیمی اخراجات کی رسیدوں کے طور پر انہیں ڈگریاں اور سندیں دے دی جاتی ہیں' یوں ہمارے یہاں بے روزگار بننے کے لیے بندے کو یونیورسٹی میں کئی کئی سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔

(ڈاکٹر یونس بٹ کی کتاب ''عکس بر عکس'' سے
تحسین جونیجو' بورڈی شریف کا انتخاب)

انمول باتیں

☆ صبر ہمیشہ امید رکھ کر کیا جاتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں بغیر پیسہ خرچ کیے مل جاتی ہیں مثلاً پیار' سکون' محبت' نفرت' خوشی' غم وغیرہ۔

☆ چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے۔

☆ زندگی کو چلانے کے لیے امید اور خوشی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ جس طرح کار کو چلانے کے لیے پیٹرول کی ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح رشتوں کو چلانے کے لیے پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی بے چارگی' بے یقینی ہے۔

☆ موت لافانیت سے فانیت کی طرف ایک راستہ ہے۔

☆ ہر دن کو اپنی زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارو' اس طرح تم گناہوں سے دور ہوتے جاؤ گے۔

حسنِ انتخاب۔ اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

غزل

اس کے لبوں سے جو لفظ ادا ہوں گے
نصیب ان فقروں کے بھی کیا ہوں گے
سنا ہے گل کھلتے ہیں ان کے مسکرانے سے
سننے والے بھی ویسے ہی ہم نواہوں گے
میں اسے مانگ تو لوں رب سے جا کر!
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے
اس کی یادیں جب حد سے گزر جائیں گی
میری آنکھوں سے تب آنسو رواں ہوں گے
میں کہاں جاؤں اس دل بے قرار کو لیے
اس کی یاد کے لمحے تو ہر جگہ ہوں گے
اس کی وفاؤں کا ملن ہو گا جنہیں نصیب
وہ خوش نصیب زمانے سے جدا ہوں گے
چوٹ عشق کی کھا کے بھی جو مسکرائیں
حسن جیسے وہ صبر کی انتہا ہوں گے

شاعر: ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

طالب توجہ

ایک صاحب کی خیرات و سخاوت کی بڑی شہرت تھی۔ ایک روز ایک اجنبی ان کے پاس پہنچا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''جناب والا' میں آپ کی توجہ ایک انتہائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

غریب اور مصیبت زدہ کنبے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کنبے کا سربراہ انتقال کر چکا ہے' اس کی بیوی اور 9 بچے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں دن گزار رہے ہیں' چھے ماہ سے انہوں نے مکان کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا۔ اگر دو چار دن کے اندر اندر انہوں نے کرایہ نہ دیا تو اس کڑکڑاتی سردی میں انہیں مکان سے نکال دیا جائے گا۔ کرائے کی رقم چھے ہزار روپے بنتی ہے۔''

''بڑا افسوس ہوا یہ سب سن کر۔'' وہ صاحب بولے۔ ''میں ضرور ان کی مدد کروں گا' ویسے بائی دا وے آپ کون ہیں؟''

''میں ان کا مالک مکان ہوں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

حسنِ انتخاب۔ فیاض محمود۔ قیوم آباد' کراچی

ٹھوکر

لڑکا ٹھوکر لگنے سے گدھے کے پیروں میں جا گرا۔ پاس سے گزرتی ہوئی لڑکی بولی۔ بڑے بھائی کے پاؤں چھورے ہو؟''

لڑکا۔ ''جی بھابی.....''

حسنِ انتخاب۔ پارس جونیجو' بورڑی شریف

اسپتال

ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا اور لڑکی سے کہنے لگا۔ ''مجھے جلدی سے اسپتال کا راستہ بتا دو۔''

لڑکی بولی۔ ''وہ سامنے سے جو گاڑی آ رہی ہے' اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ' اسپتال پہنچ جاؤ گے۔''

زورِ قلم۔ پروفیسر واجد نگینوی۔ ملیر کالونی' کراچی۔

ایک سے بڑھ کر ایک

امریکی سفارت خانے میں ویزے کے حصول کے لیے بے انتہا رش تھا۔ ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی' قطار میں کھڑے ہوئے ایک خوبصورت اور ماڈرن نوجوان نے محسوس کیا' کسی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے ایک حسین و جمیل دوشیزہ کھڑی تھی۔ دوشیزہ نے کہا۔

''مسٹر' قطار میں کھڑے کھڑے میرا گلا خشک ہو گیا ہے' میں ذرا سامنے اسٹال پر کولڈ ڈرنک پینے جا رہی ہوں۔''

نوجوان دل ہی دل میں خوش ہوا مگر بظاہر بے توجہی سے بولا۔

''ضرور جائیے' مجھے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''مجھے اندازہ تھا کہ تمہارا جواب ایسا ہی روکھا ہوگا اس لیے میں نے تمہاری شرٹ پر چیونگ گم چپکا دی ہے تاکہ مجھے اپنی جگہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔'' دوشیزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

مرسلہ۔ عائشہ سرور۔ حیدر آباد

جیت

بے بس ہو کر دل کے ہاتھوں میں نے سوچا
آج میں اس کو فون کروں گی
اور کہوں گی
میں نے تم کو لاکھ بھلایا
لوحِ دل سے نام تمہارا لاکھ مٹایا
لیکن جاناں..... سچ پوچھو تو
دل کے ہاتھوں ہار گئی میں
آؤ اب کی بار ملیں تو مر کر بچھڑیں
نمبر اس کا ڈائل کر کے
اس کے نرم سے لہجے کی 'ہیلو' سن کر بھی
چپ نہیں ٹوٹی
دھڑک دھڑک کے دل بھی مچلا
کچھ تو بولو' لب تو کھولو
لیکن آج ریسیور رکھ کر' کچھ بھی نہ کہہ کر
اپنے دل سے
بالآخر میں جیت گئی ہوں

شاعرہ۔ فاخرہ بتول

اقوال زریں

☆ اپنے دوست کو محبت دو' راز مت دو۔

☆ کسی کو ناراض کرنا بہت آسان ہے لیکن منانا بہت مشکل ہے۔

☆ جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں۔

☆ جو اونچی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں' انہیں ہی زیادہ آندھیوں اور طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

☆ خواہشات کی یلغار انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔

حسنِ انتخاب۔ معاویہ عنبر وٹو۔ ہڑپہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیرِ نیم کش

قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمایئے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یادرہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

زاہد کولاچی..... گھونگی

زندگی کی راہ میں مل گئی
آپ سے نگاہ مل گئی
اس کا ساتھ کیا ملا مجھے
گویا مجھ کو جاہ مل گئی

اظہر میاں..... کراچی

ہر آدمی کے بس کا نہیں ہے یہ کارِ عشق
ہوتے ہیں اس کے اہل مگر خاص خاص لوگ

احمد شیر خان..... حیدر آباد

حسن جاناں کی فقط ایک جھلک دیکھنے کو
کتنے ہی طالبِ دیدار مرے جاتے ہیں

سعادت علی خان..... لیہ

میں نے آنکھوں میں جھانکنا چاہا
اس نے دل میں اتار دیں آنکھیں

معاویہ عنبر وٹو..... ہڑپہ

سارا عالم یونہی حیران نہیں ہوتا جان!
شعر کہنا کوئی آسان نہیں ہوتا جان!
بعض اوقات تو وہ کام بھی ہو جاتے ہیں
جن کے ہونے کا بھی امکان نہیں ہوتا جان!

اشفاق شاہین..... حجرہ شاہ مقیم

ہمیں اس سرد موسم میں تری یادیں ستاتی ہیں
تمہیں احساس ہونے تک یہ موسم بیت جائے گا

شازیہ گل..... بھیر کنڈ

جئیں گے جب تلک تیرے فسانے یاد آئیں گے
قفس بن کر محبت کے ترانے یاد آئیں گے
ہمیں تو زندگی بھر اب تیری یادوں میں جینا ہے
تمہیں بھی کیا کبھی گزرے زمانے یاد آئیں گے

فلک شیر تابش..... شاہ گڑھ

تو کسی اور کسی اور کی ہو جاتی ہے
اور میں خواب میں یہ دیکھ کے پچھتاتا ہوں

زاہد حسین..... قمبر شہداد کوٹ

کہا تھا نا کہ میرا حساب رہنے دو
دیکھو اب ہم پر تمہارے کتنے زخم نکلتے ہیں

عبدالغفار عابد..... چیچہ وطنی

سب کچھ حاصل نہیں ہوتا زندگی میں
کسی کی کاش اور کسی کا اگر رہ ہی جاتا ہے

عبدالرحمن عثمان..... کراچی

فیس بک زہر لگ رہی ہے مجھے
کھا گئی ہے ترے خیال کا وقت

محمد انور طالب..... اسلام آباد

دوسرے عشق سے بچنے کے لیے
اس کی تصویر کا تعویذ بنا لیتا ہوں

JNO..... کراچی

غائبانہ شریک کر کے تمہیں
ایک چسکی بھری ہے چائے کی

بلال فیاض..... ملتان

اپنے ہمزاد درختوں میں کھڑا سوچتا ہوں
میں تو آیا تھا انہیں آگ لگانے کے لیے
لفظ تو لفظ یہاں دھوپ نکل آتی ہے
تری آواز کی بارش میں نہانے کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

شازیہ رضوی.....کراچی

ڈوبتے وقت زرد اتنا تھا
لوگ سمجھے کہ مر گیا سورج

وقاص حسین.....رحیم یارخان

اک پری زاد ہے دھڑکن کے علاقے میں مقیم
جس نے ماحول کو پُر وجد بنایا ہوا ہے
پاؤں میں ڈال کے تجھ نام کے گھنگرو ہم نے
اپنے اندر ہی میاں رقص رچایا ہوا ہے

خواجہ حسین.....منچن آباد

میری فریاد رائیگاں ٹھہرے
آہ نکلے تو داستاں ٹھہرے

شعبان کھوسہ.....کوئٹہ

وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو، ہو بہو ہماری طرح

ذیشان بخاری.....کوٹری

غمِ حیات سے لوں گا رمِ حیات کا درس
تمام عمر شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

رضوانہ کوثر..........لاہور

اصلاحِ قوم آپ کو منظور ہے اگر
بچوں سے پہلے ماؤں کو تعلیم دیجیے

شبانہ زمان..........سکھر

آندھی میں اڑ رہا ہے پرندے کو دیکھنا
اس کو خبر نہیں ہے ٹھکانہ چلا گیا

صفیہ رضوان..........اسلام آباد

ناؤ ہے ٹوٹی ہوئی' منجدھار میرے سامنے
ڈوبنے کے آگئے آثار میرے سامنے
لے گئیں موجیں بہا کے دور ساحل سے مجھے
کر گئے سب لوگ دریا پار میرے سامنے

صلاح الدین انصاری..........ٹنڈو آدم

کبھی کیا تھا مرا تم سے تعلق
مری اور اپنی تصویروں سے پوچھو

کوثر اسلم..........راولپنڈی

زندگی جب کسی سے خفا ہوگئی
دیکھتے دیکھتے حادثہ ہوگئی
وجۂ تخلیق ہوگی وہی ذات پھر
کیا ہوا گر یہ دنیا فنا ہوگئی

شاہ زیب عزیز..........پشاور

یہ رات خموشی سے کہیں ٹوٹ رہی ہے
آواز ہی سن لیں تری اک بار مرے دوست
رکھتا ہے جدائی کے تصور سے پریشاں
یہ عشق اذیت ہے' مرے یار مرے دوست

جواد احمد..........کے پی کے

مجھ کو یقین اپنے مقدر پہ آگیا
میں آئینہ تھا' دل مرا پتھر پہ آگیا
بھیجا گیا تھا اس کو تو امداد کے لیے
وہ دشمنوں کو لے کے مرے سر پہ آگیا

نوید جان جتوئی..........لاڑکانہ

دیکھ کر آج اسے حال ہوا کچھ ایسا
دل کو معمول پہ آنے میں بہت دیر لگی

مہروفا..........اٹک

کبھی کبھی تو یقیں سے بھی کوئی بات کرو
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ

کوپن برائے

تیرنیم کش

جون 2017ء

میرا یہ پسندیدہ شعر "**سچی کہانیاں**" کی نذر ہے

....
....
....

نام: ....

پتا: ....
....

WWW.PAKSOCIETY.COM